پیاس اور افلاس کا صحرا

سعید خاور



بسم الله الرحمن الرحيم

پیاس اور افلاس کا صحرا

عظیم صحرائے تھر کی زندگی، تہذیب اور تاریخ پر دستاویز

سعید خاور

ویلکم بک پورٹ کراچی

wbp@welbooks.com

میڈیا5 پاکستان کراچی

media5pakistan@hotmail.com

اہتمام: میڈیا 5 پاکستان

saeedkhawar@hotmail.com

0300-2140010

نام کتاب	پیاس اور افلاس کا صحرا
مصنف	سعید خاور
سرورق	عامر کھتری
بار اول	جولائی 2009ء
بارم دوم	اگست 2013ء
بار سوم	مئی 2014ء
طباعت	اے بی سی پرنٹرز
نگرانی	قمر زیدی (چیئرمین)

ناشر: ویلکم بک پورٹ
مین اُردو بازار کراچی۔ پاکستان
فون: 021-32639581–32633151
فیکس: 021-32638086
ای میل: wbp@welbooks.com
ویب: www.welbooks.com

انتساب

(باراول)

''سارنگا'' کے نام

جڈاں عشق فرید استاد تھیا
سبھ علم عمل برباد تھیا
پر حضرت دل آباد تھیا
سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

(باردوم)

اماں کے نام

جمعرات 6رجون 2013ء
جب میں دعاؤں کے ایک
عظیم وسیلے سے محروم ہو گیا

تری رحمتوں سے چھپا نہیں جو برا کیا کہ بھلا کیا
مرے رازداں میں بتاؤں کیا کہ شکست خوردہ نے کیا کیا
تری ذات کا تری صفات کا مرے سر پہ دستِ کرم رہے
مری آرزو کی لگن رہے مرے حوصلوں کا بھرم رہے
یہ بجا کہ عرصہ زندگی نے ذلیلِ لغزشِ پا کیا
مرے رازداں میں بتاؤں کیا کہ شکست خوردہ نے کیا کیا
ترا آسرا ہے وہ آسرا جو ہے زندگی سے عزیز تر
تری آرزو ہے وہ آرزو جسے چاہتے ہیں دل وجگر
ترے التفاتِ نگاہ نے مجھے آشنائے وفا کیا
مرے رازداں میں بتاؤں کیا کہ شکست خوردہ نے کیا کیا

شاہ عبداللطیف بھٹائی



فہرست

پیش لفظ

(باردوم۔ ۲۰۱۲ء)

میں رب غفور ورحیم کے حضور انتہائی عاجزی کے ساتھ ہدیہ شکر پیش کرتا ہوں کہ جس نے مجھ جیسے ناچیز کو میری استطاعت سے زیادہ نواز دیا۔ اللہ کے فضل وکرم سے میری اس کتاب کو جس طرح قارئین نے شرفِ قبولیت بخشا وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ ہے۔ اتنی بڑی عنایت پر میرا سر اللہ کے دربار میں بہ صد عجز و نیاز جھکا ہے۔

وہی تو ہے جو بگڑی بناتا ہے۔

آگ میں جھونکتا ہے اور پھر اسی آگ کو گلزار بنا دیتا ہے۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' جولائی ۲۰۰۹ء میں اشاعت پذیر ہوئی تو میں ایک خوف کے باوجود اس گمان میں سرشار تھا کہ یہ کتاب میری زندگی کا دھارا بدل کر رکھ دے گی۔ چند ہی دنوں میں اس کے پہلے ایڈیشن کی ہاتھوں ہاتھ کھپت نے مجھے سرخرو کر دیا۔ میں یہ کتاب منظر عام پر لاتے ہوئے خوفزدہ تھا کہ اگر میں لیکھک کو صحافی کے جبڑے سے بازیاب نہ کرا سکا تو خواہ مخواہ ناقدین سے منہ چھپاتا پھروں گا۔ میری کم مائیگی اور فن تحریر سے ناآشنائی کے باوجود کتاب کی قبولیت نے مجھے شرمسار ہونے سے بچا لیا لیکن مجھے سال ۲۰۰۹ء کے اواخر ہی میں دفعتاً بعض ایسی ناگہانی آفتوں نے گھیر لیا کہ میری زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی۔ میری زندگی میں زلزلہ آ گیا۔ میں کچھ ایسی آزمائشوں میں جکڑا گیا کہ آناً فاناً میرے اپنے ہی نہیں، میرے محبوب دوست بھی مجھے چھوڑ کر اچانک اجنبی ہوتے گئے اور مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھ سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ امام عالی مقام

حضرت حسینؓ کا ایک قول ہے کہ:

''دو چہرے انسان کو کبھی نہیں بھولتے' ایک مصیبت میں ساتھ دینے والا اور دوسرا مصیبت میں ساتھ چھوڑ دینے والا۔'' کچھ ایسی ہی صورت حال مجھے درپیش ہے۔ اس عرصے میں مجھ پر کچھ ایسی بن آئی ہے کہ میری آنکھوں میں سارے چہرے گڈمڈ ہو گئے ہیں اور سارے منظر دھندلا گئے ہیں۔ میرے دماغ میں چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ لکھتے ہوئے' میں اس سوچ میں غلطاں و پیچاں ہوں کہ آزمائش میں دامن چھڑا کر رخ پھیرنے والے مسافر دوستوں کی بے اعتنائیوں کا ماتم کروں یا گلے لگانے والے احباب کی بے پایاں عنایتوں کا شکریہ ادا کروں۔ ان دو تین سالوں میں میرا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا ہے۔

میں نے پہلے بھی لکھا تھا کہ میں حساب کتاب کا آدمی نہیں ہوں' لیکن ان گزشتہ دو تین سالوں پر نظر دوڑاتا ہوں تو لگتا ہے کہ میرا دامن ایک بار پھر سائیں سائیں کر رہا ہے۔ میں نے پچھلے بیس پچیس برس میں' اپنے من کے کشکول میں جتنے سکے پس انداز کئے تھے وہ کھوٹے نکلے۔ میرا کشکول پھر خالی ہو گیا ہے۔ لیکن کراچی میں اپنے ابتدائی خوب صورت دنوں کو اب بھی یاد کر کے اپنے اداس دل کو بہلا لیتا ہوں۔ کیا دن تھے وہ' اب تو وہ میرے لئے خواب کی طرح ہیں۔ کراچی کے وہ دن بہت اچھے تھے' جب کئی کئی روز فاقوں میں گزر جاتے مگر زندگی پھر بھی اجنبی نہ ہوتی۔ جیبیں خالی ہوتی تھیں مگر دل محبتوں سے لبریز ہوتے تھے۔ تنگدستی کے دن تھے تو ہم ایک دوسرے پر جی جان چھڑکتے تھے۔ جب بھی کبھی کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آتا' ایک دوسرے کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر' مل بانٹ کر کھاتے پیتے۔ کھانا پینا تو درکنار' ایک ایک سگریٹ ہماری سانجھی امانت ہوتا۔ کیا زمانہ تھا کہ ایک سگریٹ میں بھی خیانت گوارا نہ تھی۔ دن بدلتے گئے تو حالات بھی پھرنے لگے۔ وقت نے کروٹ لی' جیبیں بھرنے لگیں تو دلوں میں چھید ہوتے گئے۔ پیٹ لینے کے قابل ہوئے تو جیبوں میں چھپا کر رکھنے لگے۔ اور وہ جو سینوں میں غرض و غایت سے پاک الفتوں کی جمع پونجی تھی آناً فاناً غارت ہو گئی۔ پیسے کی ریل پیل ہو گئی' آدمیوں کی بھیڑ میں انسان کہیں کھو گئے۔

بچپن میں میرے بابا حضرت لقمان کی ایک حکایت سنایا کرتے تھے' اس کا مفہوم آج بھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے' وہ آپ کی نذر کرتا ہوں:

''بیٹا! دوستی بہت بڑی آزمائش ہے' کبھی خود کو اس آزمائش میں مت جھونکنا۔ لیکن اگر کسی

سے دوستی کی آزمائش درپیش ہوتو پہلے ایک گڑھا کھودنا' اپنے دوست کے سارے عیب اس گڑھے میں دفن کر کے پھر اسے گلے لگالینا۔ دوستی نعمت بن جائے گی۔''

میں نے دوستی کے معاملے میں ہمیشہ بابا مرحوم کی سنائی ہوئی اس حکایت کی پیروی کی اور بزعم خود ساری زندگی دھڑا دھڑ یہ نعمتیں سمیٹتا رہا۔ لیکن میرا نصیب کہ میں ان دو تین سالوں میں اپنی ان ساری نعمتوں سے ایک ایک کر کے محروم ہوتا گیا۔ بہر حال زندگی امتحان گاہ ہے' آزمائشیں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔ نعمتیں مقدر بنتی ہیں' چھن جاتی ہیں۔ جو کل تھا وہ آج نہیں ہے' جو آج ہے وہ کل نہیں ہوگا' پھر مٹی کے پیالوں کے ٹوٹ جانے کا اتنا غم کیوں؟ جب کہ وعدہ ہے' مٹی کا پیالہ ٹوٹے گا تو تانبے کا ملے گا۔ پھر اتنی بے یقینی کیوں؟ پھر سوچتا ہوں' انسان ہوں' انسانیت کا جنازہ نکل رہا ہو' دل تو ملول ہوتا ہی ہے۔

اتنی ساری افسردگی کے بعد مجھ سے ملول ہونے کا حق کوئی نہیں چھین سکتا:

نہ مار پتھر چھنڈ تج گئے ہیں' پنچھ گئے ہیں
ہوا کوں آکھو ارام کرونج
جو ہُن تان منڈھوں تھڈ تج گئے ہیں
اساں تاں موسم دی ڈات ہاسے
جذات ہاسے' سوغات ہاسے
خدا دے ناں دی خیرات ناسے
جو چپ چپاتے وکھیج گئے ہیں
او نین نئیں رہئے' او نقش نئیں رہے
او وقت نئیں رہے' او بخت نئیں رہئے
او ٹور نئیں رہی' او زور نئیں رہئے
توں ڈہدا کیا ہئیں' ونجیج گئے ہیں
توڑیں جو جینجھے غریب ہاسے

تہاڈے دل وی قریب ہا سے

تہاڈے ہتھ دا نصیب ہا سے

تہاڈے ہتھوں کھسیج گئے ہیں

اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے پیش لفظ کے ایک اقتباس، جہاں میں نے مرشد فرید کی کافی چند وسیبی دوستوں کے نام کی تھی، وہاں درج بعض ناموں سے دستبردار ہونا چاہتا تھا لیکن میں نے خود کو اس جسارت سے اس لئے باز رکھا ہے کہ مجھے میری جوہر ناشاسی اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔ میں نے لوگوں کے انتخاب میں سنگین غلطیاں کیں۔ ان غلطیوں کا خمیازہ مجھے بہر صورت بھگتنا چاہئے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ کتاب میں یہ نام موجود رہنے چاہئیں، یہ نام سامنے رہیں گے تو میرے زخم بھی تازہ رہیں گے۔ میں اب ان زخموں کی کسک میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ یہ میرے ان دوستوں کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، جو کل تک میرے تھے، اب میں خود ان کے وجود سے انکاری ہو گیا ہوں۔ اب یہ مہربان دوست کفارہ کر کے لوٹ بھی آئیں تو انہیں مایوسی ہوگی اور انہیں میرے دل اور دماغ کے دروازوں پر قفل پڑے ملیں گے۔ نہ جانے اب میں خود کہیں کھو چکا ہوں، ان کی پہنچ سے کہیں دور نکل گیا ہوں۔

۲۰۰۹ء سے ۲۰۱۱ء تک ہر قدم پر ایک نیا تماشا میرے قدم چومنے کے لئے بے چین تھا۔ میں ایک تماشے سے نکلتا تو دوسرا تماشا میرا منتظر ہوتا۔ میں ان دو تین سالوں میں اتنے تماشوں میں گیا ہوں کہ اپنے آپ کو کہیں کھو کر لوٹا ہوں۔ ان تماشوں میں خود مجھ پر ایک نیا سعید خاور دریافت ہوا ہے۔ تہوں، پرتوں اور پردوں سے کھلا ہوا۔ اب تو وہ تماشوں سے بھی بے نیاز ہو گیا ہے اور اسے صدمے جھیلنے اور نعمتوں سے محرومی کی لت سی پڑ گئی ہے۔ وہ پورب کی طرف نظریں جمائے ہر لمحے کسی نئے تیر اور کسی نئی اذیت کا منتظر رہتا ہے۔ نہ معلوم کیوں وہ ہر وقت کسی انہونے طوفان کے انتظار میں رہتا ہے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میرے اندر، میرا صحرا سے عشق سوا ہوتا گیا لیکن میں گزرے دنوں میں اپنی مجبوریوں کی وجہ سے صحرا کا سفر نہ کر سکا جو اس کتاب میں اضافہ کے طور پر پیش کرتا۔

دراصل میں اس اثنا میں خود ریگستان میں ڈھل گیا تھا۔ اجاڑ‘ ویران‘ سائیں سائیں کرتا ہوا‘ ساون بھادوں سے پہلے کا پیاسا تھر‘ پانی کی بوند بوند کو ترستا ہوا چولستان‘ روایتی رنگوں سے روندی گئی روہی۔ اور وہ رُت کہ جس میں زندگی خوابوں سے بچھڑ کر خاک میں مل جاتی ہے۔

میری روح اب بھی صحرا کے طواف میں ہے۔

صحرا سے ساحل آکر میں نے تنکا تنکا چن کر گھونسلہ جوڑنے کے جتن کیے تھے‘ اس جدوجہد میں میرے ہاتھ چھلنی اور پاؤں چھالے ہوگئے۔ اچانک زندگی میں ایسی آندھی آئی کہ میرا گھر تنکا تنکا ہوگیا۔ بادسموم کے ایک ہی جھونکے میں میرا سب کچھ جاتا رہا۔ میں اب تک وہ بکھرے ہوئے تنکے سمیٹتا پھر رہا ہوں۔ پہلے ایک ایک تنکا چننے میں ہاتھ لہو کیے اور اب وہ تنکے سمیٹنے میں گھائل ہو رہا ہوں۔ اس پر میں کسی کو دوشی نہیں ٹھہراتا‘ شاید یہ میرے نصیب کا لکھا ہے۔ اس پر میں کوئی شکوہ کرنے کی بجائے ایک دعا دہراتا ہوں:

اے دنیا جہان کے پالن ہار!

جو تو نے عطا کیا اور جو تو نے عطا نہیں کیا اور جو تو نے دے کر لے لیا‘ ان سب پر تیرا شکریہ۔ کیونکہ جو تو نے عطا کیا وہ تیری نعمت‘ جو تو نے عطا نہیں کیا وہ تیری حکمت اور جو تو نے عطا کر کے لے لیا وہ ہمارا امتحان ہے مولا!

پروردگار..... کالی کملی والی سرکار ﷺ کے طفیل! ہمیں ہر حال میں اپنا شکر گزار بنا دے۔

نئے سفر میں کچھ دیکھے ان دیکھے نئے چہرے میری زندگی میں روشنی کی مانند چمکے ہیں اور کچھ نئی آوازیں سماعتوں کی زینت بنی ہیں۔ ابتلا کے دنوں میں‘ اور اب بھی جس طرح ان چہروں اور آوازوں نے مجھے حوصلہ دیا ہے اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مجھے انہیں دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے‘ سوائے دعاؤں کے۔ میں اللہ تعالیٰ کے حضور ان چہروں اور آوازوں کی خوشیوں کے لئے بھیک مانگتا ہوں۔

کہتے ہیں کہ دعا تقدیر پلٹ دیتی ہے۔

پربت رولے‘ جلکھڑ جھولے
غم دے سانگ سنگولے
سوز سمولے‘ یار نہ کولے

جیڑا جل جل کولے
سختی گولے، سجھم نہ اوہلے
دم دم روگ سوایا

''پیاس اورافلاس کا صحرا'' کے پہلے ایڈیشن میں کافی غلطیاں رہ گئی تھیں، اس بار بھی میرے رفیق کار استاد محمد اقبال صدف نے اپنے تئیں کوشش کی ہے کہ وہ دہرائی نہ جائیں، اس کے باوجود اگر غلطیاں رہ گئی ہوں تو پیشگی معافی چاہتا ہوں۔ دوسرے ایڈیشن میں بعض رفقا کی تجویز پر دانشوروں، ادیبوں اور صحافی دوستوں کے لکھے ہوئے چند منتخب مضامین اور پیغام کتاب کے آخر میں شامل اشاعت کر دیئے ہیں جو کتاب کے محاسن اور میرے عیبوں پر لکھے گئے ہیں۔ یہ مضامین نوائے وقت، ایکسپریس، خبریں اور بعض دیگر معاصر اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مضمونوں سے آپ کو میری کوتاہیاں پرکھنے میں آسانی ہوگی۔ اس بار بھی کئی دیسی، غیر دیسی مہربانوں نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما ہے۔ میں نام لکھے بغیر ان سب کا شکر گزار ہوں۔

اے سارے جہانوں، سارے انسانوں کے مالک!

میرے اللہ! میری تجھ سے بس اتنی سی دعا ہے، اتنی سی التجا ہے، ہر حال میں مجھ پر اپنی نظر کرم جمائے رکھنا۔ میں تیری کسی آزمائش، کسی امتحان کے قابل نہیں، میرے مولا! مجھے آزمائشوں سے، امتحانوں سے اور ناگہانی آفتوں سے صدا محفوظ رکھنا: آمین۔

سعید خاور

جمعتہ المبارک ۱۷ نومبر ۲۰۱۲ء / کراچی



پیش لفظ

(باراول-۲۰۰۹ء)

جو مجھے جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ صحافت میں میرا ورود حادثاتی ہے۔ آپ برا کہیں یا بھلا، میں صحافی نہ ہوتا تو یقیناً سیاست دان ہوتا جو اپنے کرتوتوں اور اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں کی وجہ سے پاکستان جیسے ناتواں اور بدعنوان ریاستی ڈھانچے میں ناپسندیدہ ترین مخلوق بن چکا ہے۔ میں بچپن میں جاگیردارانہ سماج کے دوسرے بچوں کی طرح مکمل طور پر دیہاتی ماحول کے حصار میں تھا، جہاں ہر کمزور خواب دیکھتا ہے کہ وہ طاقت ور بنے۔ جو دسترس میں نہیں ہے اسے پانے کا جنون ہر ایک پر حاوی رہتا ہے۔ یہ جنون مجھے بھی ورثے میں ملا اور بچپن ہی میں میری زندگی کا نمایاں جزو بن گیا۔ میرے والدین اسے ضد اور ہٹ دھرمی کا نام دیتے تھے لیکن یہ حقیقت بھی ہے کہ بعض چیزوں پر اڑ جانا میری عادت سی بن گئی تھی۔ میں زعم میں رہتا تھا کہ میں چیزوں کو جن زاویوں سے دیکھتا اور پرکھتا ہوں، وہی زندگی کا صحیح رخ ہیں، میں شاکی رہتا کہ گھر اور خاندان میں میرے مسائل اور موقف کو صحیح طرح سے نہیں سمجھا جا رہا۔ اوائل عمری کی بعض سرکشیوں کی وجہ سے اکثر مجھے بابا کے طعنوں، دھمکیوں، طمانچوں اور اماں کی مشفقانہ مار پیٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔

میں نوابوں کے جدامجد سے منسوب ایک سرکاری اسکول میں پڑھتا تھا جسے آپ کالا پیلا اسکول کہہ سکتے ہیں لیکن یہ ایک بڑا اسکول تھا اور پڑھائی کے حوالے سے اس کی شہرت بھی اچھی تھی۔ یہاں عربی اور فارسی چھٹے سے آٹھویں درجے تک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے ابتدائی درجوں میں انگریزی میں ہمیشہ بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا لیکن اردو، عربی

اور فارسی میرے پسندیدہ مضامین تھے اور ان میں' میں نے ہر امتحان میں امتیازی ہندسے اور معقول شرح حاصل کر کے اپنے اساتذہ کی نظروں میں مقام بنایا۔ عربی اور فارسی سے آٹھویں درجے کے بعد رفاقت قائم نہیں رہ سکی لیکن ان تین برسوں میں قابلِ فخر اساتذہ کے طفیل ان مضامین سے اتنا کچھ سیکھنے کو مل گیا کہ جو اردو میں میرے مستقبل کے لئے مستحکم بنیادیں فراہم کرنے کا وسیلہ بن گیا اور پھر اردو میں ایم اے (ابلاغِ عامہ) اور اردو صحافت میں بھی کامیابی کے سفر میں کافی حد تک معاون و مددگار ثابت ہوا۔

ہم اپنے بزرگوں کے توسط سے عباسی نوابوں سے خاصے مرعوب اور ان کے حد درجہ عقیدت مند تھے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں' سندھ میں تالپوروں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھا کر چولستان کے صحرا میں انگریزوں کے دامن پناہ میں آنے والے عباسی نوابوں کی غلامی اور اطاعت ہمارا مقدر تھی۔ وہ اپنا شجرہ نسب حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملاتے ہیں اور اس پر ناز کرتے ہیں مگر میرا شجرہ نسب بڑا عجیب ہے۔ بہت سے لوگ اپنے پردادا کے باپ کا نام اور اس کی قبر کا نشان نہیں بتا سکتے' مجھے اپنے پردادا کے پردادا کا نام بھی ازبر ہے۔

''غلام ابن غلام' ابن غلام' ابن غلام' ابن غلام' ابن غلام' ابن غلام' ابن غلام۔''

غلامی کی یہ سوغات ہماری میراث تھی جو انگریزوں کے توسط سے ہماری نسلوں کا مقدر بنی اور تقسیم ہند کے باوجود بھی ہماری تقدیر رہی۔ لیکن میں نے اس ترکے اور شجرے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ میری نظروں میں میرے بابا ''ڈولا سائیں'' (امیر آف بہاول پور نواب محمد عباس عباسی) سے بھی بڑے آدمی تھے۔ میرا انکار میری زندگی کا دھارا موڑنے کا سبب بن گیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ان پڑھ بابا نے میری یہ بغاوت بالآخر قبول کر لی۔

نہ جانے اس روز کیوں میری خوشی کی انتہا تھی' جس روز ہمارے نوابوں (امرائے بہاول پور) کی تاریخی اقامت گاہ ''صادق گڑھ پیلس'' پر ذوالفقار علی بھٹو (شہید) نامی ایک سیاست دان نے قفل ڈال دیئے تھے۔ یہ ستر کی دہائی کے کسی سال کا ذکر ہے۔ یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے مگر مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس روز رات گئے تک میرے گھر کے مکینوں سمیت پورے شہر کے لوگ دہاڑیں مار مار کر اس المیہ پر روتے رہے۔ اس سے پہلے میں نے اپنی ماں کو کئی بار روتے اور آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر التجا کرتے دیکھا تھا مگر آج مجھے ماں کا یوں زار و قطار رونا' خدا جانے کیوں

اچھا نہیں لگا۔ رات کے سناٹوں میں یہ نالے اور بھی بھیانک ہو گئے۔ مجھے ان سب کے برعکس نہ جانے کیوں رونا نہیں آیا۔ میں گھر کے آنگن میں نکل کر ان پر نم آوازوں کو سنتا اور ان کی نقلیں اتارتا رہا۔ میرے بابا کے ہاتھوں مذکورہ ''ظالم سیاست دان'' کے کئے کی سزا مجھے بھگتنا پڑی۔ میں اس سارے معاملے کی تہہ تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ اس سرزمین پر کوئی ایسا بھی ہے جو ہمارے آقاؤں سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔ اس لئے مجھے اس سخت قسم کی سرزنش پر افسوس نہیں ہوا۔ میں نے گھر میں اعلان کر دیا کہ میں بڑا ہو کر بھٹو کی طرح سیاست دان بنوں گا۔ یہ میرے وجود میں بغاوت کی پہلی لہر تھی۔

ایک روز میرے بابا نے میری موجودگی میں نواب محمد عباس عباسی کے ولی عہد شہزادہ صلاح الدین عباسی کی قدم بوسی کی تو مجھے بہت برا لگا کہ میرا باپ' جو میرا آئیڈیل بھی تھا اور عمر میں اس شخص اور اس کے باپ سے بھی بڑا آدمی تھا' کے سامنے جھکا تھا۔ میں شہزادہ صلاح الدین' اس کے محافظوں اور خدمت گاروں کی موجودگی ہی میں بابا کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا اور دہاڑا:

''بابا! اس آدمی کے سامنے کیوں جھکتے ہو' یہ خدا تو نہیں' آپ بڑے ہو' یہ عمر میں آپ سے چھوٹا ہے' اسے آپ کے قدم چھونے چاہئیں' آپ کو نہیں۔''

ایک کمسن غلام کی یہ حرکت غیر متوقع اور سب کے لئے انہونی تھی۔ شہزادہ صلاح الدین تو سٹپٹا کر چلا گیا لیکن بابا نے جو میری درگت بنائی وہ مجھے آج تک یاد ہے۔ میری اس جسارت کی پاداش میں میری ماں کو بھی بہت کچھ سننا پڑا۔

''بیٹے کو سنبھال کے رکھو' نمک حرام ''سرکار'' کی گستاخی پر اتر آیا ہے۔''

بہاول پور ریاست میں رہنے والے ہم سب ''سرکار'' (ریاست کے فرمان روا کو عام لوگ سرکار کے لقب سے یاد کرتے تھے) کے نمک خوار تھے اور میری جسارت نمک حرامی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس واقعہ کی اطلاع لوگوں کو ہوئی تو غلامی کی غلاظت میں لتھڑے سماج میں میرا اسکول جانا دوبھر ہو گیا۔ میں جس طرف بھی جاتا مجھے تیکھی اور ترش نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسکول میں بھی دل آزار جملے سننے کو ملتے۔ حتیٰ کہ میرے بعض محبوب اساتذہ نے بھی مجھے ''سرکار کا غدار'' قرار دیا تو میں روح تک کانپ گیا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو میری اس واردات کے بعد مجھے دل سے چاہنے لگے ہیں۔ جو وہ کرنا اور کہنا چاہتے تھے' میں نے کر دکھایا تھا'

شاید اس لئے۔

بات آئی گئی ہو گئی لیکن میرے بابا بھی آہستہ آہستہ اپنے ''گستاخ'' اور ''نمک حرام'' بیٹے کی باتوں میں آ کر میری طرح نوابوں سے کسی حد تک بیزار سے رہنے لگے۔ اپنے عمر رسیدہ باپ کو اپنے بے سمت انقلاب کی راہ پر لے آنا میرے بچپن کی دوسری بڑی کامیابی تھی۔

میرے بابا حاجی امیر بخش خان المعروف ''میرن خان'' پڑھے لکھے نہیں تھے مگر وہ خود پڑھے لکھے نہ ہونے کے باوجود سماج کی اکثریت کی سوچ کے برعکس اپنی اولاد کو پڑھانے لکھانے کے نظریئے پر کاربند تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے خاندان، قبیلے اور رسم و رواج کو خیر باد کہا اور آبائی گاؤں محراب والا (تحصیل احمد پور شرقیہ، ضلع بہاول پور) سے تین کلو میٹر دور عباسی نوابوں کے ڈیرے، ڈیرہ نواب صاحب چلے آئے جہاں جدید تعلیم کے تمام وسائل دستیاب تھے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اپنی رعایا کو ذلت کی حد تک پسماندگی میں رکھنے کے باوجود بعض تعلیمی اداروں کے قیام کا سہرا بھی ان ہی نوابوں کے سر بندھتا ہے۔ اپنی اولاد کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے میرے بابا کی اس چھوٹی سی ہجرت نے ہماری تقدیر بدل کر رکھ دی۔ میرے بابا آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن میں نے اپنی کئی نسلوں کی محرومیوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھا کر روشنی کی سمت میں جو چند قدم بڑھائے ہیں، اس کی پہلی ترغیب اور ہمت مجھے ان ہی سے ملی ہے، اس لئے میں فخر سے انہیں ترقی پسند اور روشن خیال لکھ سکتا ہوں:

لانے پھوگ فرید سوہیساں
سٹ گھر بار تے بار وسیساں
کرڑی تے ونج جھوکاں لیساں
اج کل ٹوبھا وس پیا

صاف ظاہر ہے کہ میرا پہلا آئیڈیل میرا باپ ہی تھا جس کا ہمارے گھر میں سکہ چلتا تھا۔ گھر سے اسکول تک رسائی ہوئی تو باپ کا دبدبہ تو رہا ہی، نت نئے آئیڈیل بدلنے لگے۔ کبھی وہ کوئی استاد ہوتا تو کبھی کسی کو اکھاڑے میں اچھی اٹھا پٹخ کرتے دیکھ لیا تو اس کے روپ میں ڈھلنے کی خواہش جاگ گئی اور کبھی کسی مولوی کو وعظ کرتے سنا یا اس کی تکریم ہوتے دیکھی تو مولوی بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ محرومیوں کے مارے جاگیردارانہ سماج کے ایک عام گھر میں جنم لینے والا بچہ

طاقت کی علامت بننے کے لئے پہلوان' معلم اور مولوی کی تعبیر سے زیادہ کیا سوچ سکتا ہے۔

اب یہ ذوالفقار علی بھٹو نام کا سیاست دان کہیں سے آن ٹپکا تھا جس نے مجھے میرے بچپن ستر کی دہائی میں روایات سے بغاوت پر دل وجان سے آمادہ کر دیا تھا۔ یہ میری اوقات سے بڑھ کر بات تھی کہ میں نوابوں' ان کے گماشتوں اور مقامی وڈیروں کی طاقت سے بلند ہو کر ان سے اپنی نسلوں کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ سماج میں پھیلی ناانصافیوں نے میرے وجود میں بجلیاں بھر دیں۔ جب بھٹو صاحب کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو میں اس وقت میٹرک میں تھا اور جب وہ شہید کر دیئے گئے تو میں انٹر کالج پہنچ چکا تھا۔ میں انٹر کالج پہنچا تو آگ اگلنے لگا۔ وڈیرہ شاہی' آمریت اور ریاستی جبر کے خلاف میرے زہر میں بجھے الفاظ میرے خاندان کے لئے مشکلات پیدا کرنے لگے تو میرا گھر میں رہنا دشوار ہو گیا۔

مجھے اپنے خاندان کو اپنے باغی سائے سے محفوظ رکھنے کے لئے اپنے ہی شہر میں رہتے ہوئے کالج کے دارالاقامہ میں پناہ لینا پڑی۔ گریجوئشن کے لئے بہاول پور گیا تو بھی میری وجہ سے میرے خاندان کی آزمائشیں کم نہیں ہو سکیں۔ میری ''گستاخیاں'' وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کرنے لگیں اور میری زندگی مستقل خطروں میں گھر گئی۔ میرے خلاف کئی داستانیں گھڑی گئیں اور رسوا کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا۔ مجھے اپنے ہی لوگوں میں اجنبیت اور وحشت محسوس ہونے لگی۔ پھر مجھے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ میں یہ شہر چھوڑ کر کہیں دور نکل جاؤں اور اپنی تقدیر بنانے کے لئے نئے سرے سے کوششیں کروں۔ یہاں رہوں گا تو مسائل اور خطرات تعاقب میں رہیں گے اور خاندان بھی مصائب میں گھرا رہے گا۔ میں کئی روز تک اپنے آبائی گاؤں کے ٹیلوں میں روپوش رہ کر مستقبل کے تانے بانے بنتا رہا۔ میں نے اس مسئلے پر کافی سوچ بچار کے بعد ہجرت کا فیصلہ کر لیا۔ غالباً یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی:

بدنامی میڈا نام ہویا
غم کھاون شرب مدام ہویا
رت پیون کام دوام ہویا
چُھٹ پیوسے شرم دی جال کنوں

میں ایس ای کالج بہاول پور سے گریجوئشن مکمل کرنے کے بعد شہر شہر' نگر نگر خاک چھانتے

وادی مہران آنکلا۔لیکن یہاں آمد سے پہلے ارشاد احمد امین کی ترغیب پر انجم لاشاری مرحوم اور میں لاہور چلے گئے۔ارشاد احمد امین سعودیہ سے کچھ پیسے اور کچھ خواب لے کر آیا تھا۔کچھ رقم تو اس نے ۱۹۸۳ء میں اپنی جنم بھومی چاچڑاں شریف میں کئی روزہ تاریخ ساز جشن فرید پر لٹادی اور باقی لاہور میں اس کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹ' چند مفاد پرست اور پراسرار دوستوں کے بتائے ہوئے تجارتی منصوبوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔جشن فرید چاچڑاں شریف سرائیکی ادب وثقافت کا دھارا موڑنے والا پروگرام ثابت ہوا۔میری مرشد عزیز شاہد' ممتاز حیدر ڈاہر' زبیر رانا' قاصر جمالی' حسین بخش خان اور قیس فریدی سے پہلی ملاقات اسی جشن کے طفیل ہوئی۔لاہور میں ہمارا قیام زیادہ طویل نہیں رہا۔رقم ختم ہوئی تو سارے خواب بھی بکھر گئے۔ارشاد احمد امین کا جہاز ڈولنے اور ڈوبنے لگا تو ہم بھی جہاز سے کود گئے۔انجم لاشاری لاہور سے کراچی اور میں ایک بار پھر ڈیرہ نواب صاحب چلا گیا۔لاہور کے اس مختصر قیام میں' میں نے ارشاد احمد امین' چاچا مظہر محسن کی محبتیں اور صفدر بلوچ کی ''کمینگیاں'' کمائیں جو آج بھی میری زندگی کا اثاثہ ہیں۔

کچھ مہینے ملتان کا دانہ پانی بھی مقدر میں تھا۔رائٹرز کالونی میں عمر علی خان نے مولانا نور احمد خان فریدی مرحوم کی لائبریری میری رہائش کے لئے مختص کر دی۔ یہاں رہ کر مجھے مولانا فریدی کی کتابیں' مرشد فرید کو اور عمر علی خان کے بھابھی شیما سیال سے معاشقے' شادی' اختلافات' علیحدگی اور پھر ایک یک طرفہ معاہدے تک اتفاق کے معاملات کی تمام تر مراسلت کو سکون اور فراغت سے پڑھنے کا موقع ملا۔میں نے اس لائبریری سے کوئی کتاب تو نہیں ہتھیائی البتہ چند اہم خطوط سرقہ کئے تھے جو میری دربدری کی نذر ہو گئے۔

عمر علی خان سے دیرینہ مراسم تھے اور مجھے ان کے ساتھ ۱۹۷۶ء سے بطور مرکزی جوائنٹ سیکرٹری سرائیکی اسٹوڈینٹس فیڈریشن کئی برسوں تک کام کرنے کا موقع ملا۔ میں جب جوائنٹ سیکرٹری منتخب ہوا' اس وقت نویں کا طالب علم تھا اور مجھے سب سے کم عمر عہدیدار ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ملتان میں قیام کے دوران مولانا نور احمد خان فریدی کے دوسرے بڑے صاحبزادے اور ماہنامہ ''بلوچی دنیا'' کے مدیر میر چاکر علی خان سے نیازمندانہ مراسم استوار ہوئے۔عمر علی خان نے مجھے ماہنامہ ''سرائیکی ادب'' کی ادارت سونپ دی مگر لاہور کی طرح ملتان کی مٹی بھی مجھے راس نہیں آئی اور میں ایک بار پھر رخت سفر باندھ کر کوئٹہ نکل کھڑا ہوا۔کوئٹہ میں قیام کے دوران

میر چاکر خان نے مجھے سنبھالنے اور سنوارنے میں بڑی شفقتوں سے نوازا لیکن یہ شہر بھی میرے لئے اجنبی رہا۔ کوئٹہ میں قیام کے دوران ایک بار ایک خط میں میرے محترم دوست ممتاز حیدر خان ڈاہر مرحوم نے میری دربدری کو شدید تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لکھا تھا:

''سعید خاور! روز روز ٹھکانے بدلنے سے انسان اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔'' میں ممتاز ڈاہر کی معقول تنبیہہ کے باوجود کوئٹہ سے دوبارہ ڈیرہ نواب صاحب پلٹ گیا۔

کراچی کو اپنا مستقبل سونپنے سے قبل میں نے یہاں سکونت پذیر اپنے اکلوتے دوست نذیر لغاری سے اپنی ہجرت سے متعلق مشاورت کی تو انہوں نے مجھے کراچی کی بھیڑ میں گم ہونے کی بجائے دوبارہ کوئٹہ کی راہ دکھائی جہاں میں تھوڑے وقت میں بڑی شناخت حاصل کر سکتا تھا۔ میں نے اپنے عزیز اور محترم ترین دوست کی رائے یا ہدایت سے قطع نظر کراچی ہی کو اپنی منزل بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ان کے قریب رہ کر ان کی خوشبوؤں میں بسنا چاہتا تھا' غالباً انہیں یہ خوف تھا کہ میں کہیں ان کی ذمہ داری یا ان پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں نے مرشد نذیر لغاری کے حکم کو ٹال کر اچھا کیا یا برا یہ بحث اب فضول ہے لیکن میں نے کراچی میں اپنے قیام میں ہمیشہ یہ اہتمام رکھا کہ میری وجہ سے وہ کبھی کسی آزمائش میں مبتلا نہ ہوں۔ اپنی حد تک تو میں سمجھتا ہوں کہ اس کوشش میں کامیاب رہا۔

میرے بابا نے ہمارے لئے محراب والا میں اپنا خاندان چھوڑ کر ڈیرے نواب کو اپنا ٹھکانہ کیا۔ میں نے اپنے اور اپنی متوقع نسل کے سنہری مستقبل کے لئے اپنا خاندان' قبیلہ اور محبت کرنے والے ہزاروں لوگ چھوڑ دیئے' وہ لوگ جنہوں نے ایک جذباتی نوجوان کے اجنبی عقیدے پر اپنی تاریخی عقیدتیں قربان کر دی تھیں:

اوکھے لانگھے روہ جبل دے
چھل چھل چھالے پیر بجلدے
رُلدی راہ ملیر دو
جتھ راخس ڈینیں پوون دہل

زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں زمینی خداؤں کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ میں منافق نہیں کہلانا چاہتا' مجھے اپنی شکست کا برملا اعتراف ہے۔

جاگیردارانہ سماج میں وسائل اور پس منظر سے محروم ایک باغی نوجوان کی چیخیں قدیم روایات کے ہنگاموں میں غرق ہوگئیں۔ میں نے جاتے جاتے ''انکار'' کا بیج اپنی بنجر زمینوں کے سینوں میں ڈال دیا' شاید ساون کی کوئی ایک پھوار اس بیج کی نمو کا سبب بن جائے۔ شاید میری چھوڑی ہوئی چنگاری کسی ایک جھونکے کے طفیل شعلے میں بدل جائے۔ میں نے اپنی بے سمت تحریک کے باقیماندہ کام کا بوجھ آنے والی مایوس نسلوں کے کندھوں پر ڈال دیا۔ میں نے احتجاج میں جھولتی اپنی آواز کو صحرا کی وسعتوں کے حوالے کر دیا اور ایک نئے سفر کی تیاریوں میں جت گیا۔ میں نے انٹر کالج' ڈگری کالج میں دورانِ تعلیم اور پھر سماجی اور سیاسی شعبے میں رہنے کے چند ہی برسوں میں جان لیا تھا کہ وڈیرہ شاہی اور پسماندگی کے خاتمہ کے لئے ایک بڑی منظم جنگ کی ضرورت ہے جو بندوق سے نہیں قلم سے لڑی جاسکتی ہے۔ میں نے بندوق اٹھانے کا ارادہ ترک کر کے قلم اور کتاب سے ناطہ جوڑ لیا لیکن قلم اور کتاب کی حد تک بھی یہ زمین میرے لئے تنگ تھی۔ میں نے اپنا اثاثہ دیوانِ فرید اور نہج البلاغہ بغل میں دبائی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ہجرت میرے بابا کا مقدر بنی تھی' میں نے بھی اسے اپنی تقدیر بنالیا۔

میں کراچی میں اکیس برس سے کارزارِ صحافت میں ہوں' ابتدائی تین چار برس غیر ادارتی شعبوں میں گزرے' کم وبیش سترہ سال عملی صحافت میں بتائے ہیں۔ مڑکر دیکھتا ہوں تو لگتا ہے سب کچھ رائیگاں گیا۔ ذہنی اور مالی آسودگی میرا اور میرے لوگوں کا نصیب نہیں بن سکی۔ میں نے محبت مانگی' مجھے ملامت ملی' میں نے دولت کی خواہش کی' کسمپرسی نے میرے ہاں بستر لگا لئے اور میں نے شہرت چاہی تو تنہائی نے آگے بڑھ کر میرے ہاتھ تھام لئے۔ اپنے عزیز اور محترم ترین دوست نذیر لغاری کی پیش گوئی یا خدشے کے برعکس میں کراچی کے میلے میں گم نہ ہو کر بھی اپنوں کے لئے اجنبی رہا۔ نہ میں کسی کو سمجھ سکا اور نہ کوئی مجھے:

جند اسیرے جور و جفا دی
دلڑی قیدی کرب و بلا دی
ڈسم رقیب یزید پلید

احتیاط کہیے یا مصلحت میری زندگی کا مسلک بن گئی۔ بزدلی کا یہ عالم رہا کہ کبھی اپنے آپ کو کسی آزمائش میں نہیں جھونکا اور ہر قدم پر مجھے یہ خوف رہا کہ جو ہے وہ کہیں کھو نہ جائے۔ مجھے

ایسے لگا کہ میں ایک چھوٹے زنداں سے بڑے زنداں میں منتقل ہو گیا ہوں۔اب تو مجھے اس بڑے زنداں سے محبت سی ہو گئی ہے اور اس قید خانے سے محبت کیوں نہ ہو' اس نے مجھے نذیر لغاری کی بلاواسطہ شفقت اور سنگت سے سرفراز کیا اور شاہد جتوئی' قاسم لاشاری' ملک اکبر' انجم لاشاری (مرحوم)' زبیر رانا' مشتاق فریدی' عبدالشکور' غلام مصطفیٰ' طارق مصطفیٰ' راشد مصطفیٰ' محمد علی خان' جسٹس شفیع محمدی' طارق جتوئی' غلام حیدر بزدار' عزیز لنگاہ' عبدالغنی ہانبھی' غلام اکبر بگٹی' خادم حسین اچوی' محمد حنیف' یوسف خان نیازی' گلو بھائی' سید باقر گیلانی' نیاز خان' اعجاز میتلا' اسلم شیخ' افضل شیخ' خورشید انجم' حمید علی' ملک منظور' مولوی فاروق' سانول شیخ' اجمل پنوار' حاجی لال' چاچا نذیر پتافی' لالا مشتاق ساقی' لیاقت احمدانی' غلام مرتضیٰ تفہم' علامہ اعظم سعیدی' ممتاز کھوسہ' پروفیسر ریاض بھٹی' آنجہانی حمید اللہ سانگی' عبداللہ گبول مرحوم' حفیظ اللہ دریشک' ملک افضل' ملک اجمل اعوان' لالا حمید اصغر' لالا واحد بخش' ملک ریاض' شکیل انجم' باسط لاشاری' مجاہد جتوئی' زاہد جتوئی' جام شبیر مرحوم' اقبال قادری' ماما غازی' رحم علی بربرا' کرم علی خان بربرا' نذیر احمد شاہ' مرید حسین گھوٹیہ' سرمد موسیٰ لغاری اور بزرگ دوست محمد بخش خان لغاری مرحوم جیسے دشمن جاں عطا ہوئے۔میرے یہ سب دوست فریدی ہیں اور مرشد فرید کی اس کافی کی عملی تفسیر ہیں:

اساں سو بد مست قلندر ہوں
کڈیں مسجد ہوں کڈیں مندر ہوں
کڈیں چور بنوں کڈیں جار بنوں
کڈیں توبہ استغفار بنوں
کڈیں زہد عبادت گار بنوں
کڈیں فسق فجوریں اندر ہوں
کتھاں درد کتھاں درمان بنوں
کتھاں مصر کتھاں کنعان بنوں
کتھاں کیچ بھنبھور دا شان بنوں
کتھاں واسی شہر جلندر ہوں
کتھاں صومعہ دیر کنشت کتھاں

کتھے دوزخ باغ بہشت کتھاں
کتھے عاصی نیک سرشت کتھاں
کتھے گم رہ ہوں کتھے رہبر ہوں
ہیوں او قلاش تے رند اساں
پئی نودی ہے ہند سندھ اساں
ہیوں بے شک عارف چند اساں
کل راز رموز دے دفتر ہوں
ہن ناز نواز دے ٹول کڈیں
ہے مونجھ منجھاری کول کڈیں
رلے ڈھول کڈیں گیا رول کڈیں
کڈیں بردر ہوں کڈیں دربر ہوں
ول واتوں سمجھ فرید الا
کر محض ناں شعر جدید ولا
ہے چالوں حال پدید بھلا
تونے کیجو سارے ابتر ہوں

میں اپنے دفتری رفقا جن میں سے بیشتر میرے ذاتی دوست بھی ہیں ' میں ان کا اور دیگر سماجی اور صحافی دوستوں کا ذکر کرنے بیٹھوں تو بھی ایک طویل فہرست بنتی ہے۔ الحمدللہ کراچی میں میرے سماجی اور صحافی دوستوں کا ایک وسیع حلقہ ہے۔ یہ دوست میری اور میں ان کی محبتوں کا محور رہا ہوں۔ ان میں سے ہر شخص اپنی ذات میں انجمن ہے' یہ حلقہ ایک مکمل کتاب کا متقاضی ہے جو انشااللہ تعالیٰ میں جلد آپ کی نذر کروں گا۔ میں نے یہاں صرف چند ویسی دوستوں کے نام تحریر کیئے ہیں۔ سب دوستوں کے نام لکھنے بیٹھوں تو صفحات بھر جائیں گے' اب کچھ دوستوں کا تذکرہ کر دیا ہے اور یقیناً لاتعداد رہ گئے ہیں تو مجھے پیشگی علم ہے کہ میری اس خطا پر میری شامت آجائے گی۔ دارورسن کے اس نئے دور میں ان مشقتیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا مزہ ہی الگ ہے۔ میں اس لحاظ سے خوش قسمت رہا کہ ایک ہجوم سے بچھڑ کر ایک اور ہجوم کا حصہ بن گیا لیکن میں

ان محرومیوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکا جو مجھے ورثے میں ملی تھیں۔ میں ان محرومیوں کو' جو میرا سرمایہ حیات بن چکی ہیں' سینے سے لگا کر اور اپنے اردگرد کی بھیڑ سے گھبرا کر در در بھٹکنے اور صحراؤں کی خاک چھاننے لگا۔

میں خالی ہاتھ کراچی آیا تھا' اب بھی خالی ہاتھ ہوں۔ نہج البلاغہ اور دیوان فرید کل بھی میرا اثاثہ تھے اور آج بھی میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ زندگی بھر نہ کسی کی کاسہ لیسی کی اور نہ ہی کاسہ گدائی کا ہنر آیا۔ شکر اور صبر کو روایت بنانے کی کوشش کی تو ایک روز رابعہ بصری کے ابراہیم بن ادہم سے مکالمے کے طفیل اس روش سے بھی بھاگنا پڑا۔ روایت طویل ہے لیکن اس کا وہ حصہ جو میرے مطلب کا ہے ' یہاں لکھ رہا ہوں۔ کہتے ہیں ابراہیم بن ادہم سے رابعہ بصری کی ملاقات ہوئی تو رابعہ بصری نے ان سے استفسار کیا:

''سناؤ ابراہیم کیسی گزر رہی ہے؟''

''بی بی! مل جاتی ہے تو شکر ادا کرتے ہیں' نہیں ملتی تو صبر کرتے ہیں۔'' ابراہیم بن ادہم نے انہیں جواب دیا۔

''یہ تو بصرہ کے کتے بھی کرتے ہیں'' یہ بی بی رابعہ کا جواب تھا۔ اس پر ابراہیم بن ادہم نے متحیر ہو کر بی بی رابعہ سے پوچھا:

''بی بی! آپ وقت کیسے گزار رہی ہیں؟'' اس پر رابعہ بصری نے کہا:

''مل جائے تو بانٹ دیتی ہوں' نہ ملے تو شکر کر لیتی ہوں۔'' اس نامکمل روایت کی ان چند سطروں نے مجھے زندگی کی نئی چاشنیوں سے آشنا کر دیا۔

پھر میں نے کہیں پڑھا:

''مایوس وہ ہوتا ہے جو اللہ پر یقین نہ رکھتا ہو اور محروم وہ ہوتا ہے جو اللہ کی دی ہوئی بیشمار نعمتوں کا شکر ادا نہ کرے۔'' مذہب سے بیگانگی کے باوجود خدا پر میرا یقین پختہ ہے۔ اس قول نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ قلم اور کتاب اور مرشد فرید سے دوستی نے خدا پر میرا یقین اور پختہ کر دیا اور مجھے مایوسیوں کی دلدل سے نکال کر امیدوں کی ایک نئی راہ پر ڈال دیا:

خمر طہوروں پی پیمانے
تھیوسے عاشق مست یگانے

بھل گئے صوم صلواۃ دوگانے
رندی مشرب سانگ رسایا

ناکامیوں اور کامیابیوں کے پل صراط پر چلتے چلتے یہاں تک پہنچا ہوں تو ایک اور عزیز دوست اور اس کے تاریخ ساز جملے کا ذکر کیے بغیر بات بنے گی نہیں۔ اس ایک جملے نے میری زندگی کی راہیں متعین کرنے میں جادوئی کردار ادا کیا۔ صحافتی سفر کے آغاز پر مجھے خواتین کے ساتھ کام کرنے کی آزمائش درپیش تھی۔ ان دنوں آج کے پروفیسر جاوید چانڈیو جامعہ کراچی میں زیرِ تعلیم تھے۔ ہماری اکثر شامیں ساتھ گزرتی تھیں اور ہم اکثر راتوں کو جاگ کر آنے والے دنوں کے خواب بُنا کرتے تھے۔ ایک روز وہ مجھے دفتر ملنے آئے تو ایک خزاں رسیدہ شخص کو بہاروں میں کھیلتے دیکھ کر گھبرا گئے۔ سوچا ہوگا اس نوخیز صحافی کا آنے والے دنوں میں نہ جانے کیا انجام ہوگا؟ بڑی دیر صحافت کے نشیب و فراز بتاتے سکھاتے رہے، جاتے جاتے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ ایک جملہ عطا کر گئے جو میں نے ہمیشہ کے لئے پلے باندھ لیا۔ انہیں تو شاید یاد بھی نہیں ہوگا کہ ان کے چند کراماتی لفظوں نے ایک راندہ درگاہ کو کہاں سے اٹھا کر کہاں پہنچا دیا:

''سعید خاور! دفتر میں نوکری اور چھوکری میں سے ایک کا انتخاب کرلو، انشا اللہ تعالیٰ کامیابی تمہارا مقدر بنے گی۔''

ڈاکٹر پروفیسر جاوید چانڈیو کے اس معنی خیز جملے نے میری زندگی کے دھارے موڑ کر رکھ دیئے اور میں نے مسلسل محنت کو اپنی ترجیحات میں اولیت دے کر خود کو کراچی کے ہجوم میں گم ہونے سے بچا لیا۔ میں ایک اچھا عاشق بننا چاہتا تھا چانڈیو صاحب کی اس ''واردات'' نے مجھے کارزارِ صحافت میں دھکیل دیا۔ جھمیلے سدا میرے تعاقب میں رہے لیکن اپنے یار جاوید کے ناصحانہ جملے کی بدولت میں نے جھمیلوں سے اپنا دامن ہمیشہ بچائے رکھا۔

''پیار بے شمار..... جاوید یار۔''

کرے فرید ہمیش دعائیں
سانول جیویں چر جگ تائیں
تیڈے ساڈے سوہنا سائیں
لگڑے نینہہ پرانے

اپنے ابتدائی عمر کے خوابوں کے برعکس سیاست دان نہ بن پانے والے ایک جذباتی نوجوان نے حالات کی ستم ظریفی سے گھبرا کر صحافت کے دارالامان میں پناہ لے لی۔ یہ بڑا محفوظ شعبہ ہے' اس میں رہ کر اپنی محرومیوں کے بدلے بہ آسانی لئے جا سکتے ہیں۔ میرے اندر کا لکھاری بھی بڑا کمزور نکلا' میرے صحافی نے اسے بڑی آسانی سے قابو کرلیا اور پندرہ سال تک اسے یرغمال بنائے رکھا۔ پھر جب میں ریذیڈنٹ ایڈیٹر بنا تو وہ بے چارا صحافی بھی ایک منتظم کے ہتھے چڑھ گیا۔ بہ طور قلم کار اور صحافی مجھ پر بہت قرض تھا جو میں نہیں اتار سکا۔ اب مجھے دوہری کشمکش کا سامنا ہے۔ مجھے منتظم کے ہاتھوں سے صحافی کو چھڑانا ہے اور پھر صحافی کے چنگل سے اپنے لکھاری کو بازیاب کرانا ہے۔ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ایک مغوی صحافی اور لکھاری کو ایک مصلحت کار منتظم کے چنگل سے آزاد کرانے کی مہم پر بھیجے گئے الفاظ کے عسکر کا ہراول دستہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ پہلی کوشش کامیاب رہی ہے یا ناکام۔ میں اپنے ناتواں صحافی اور لکھاری کو بازیاب کرا سکا ہوں یا نہیں۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔ لیکن فیصلہ دینے سے قبل یہ ذہن میں رکھئے گا کہ یہ کوئی ادبی یا علمی تخلیق نہیں بلکہ عظیم صحرائے تھر پر رپورتاژ کہیں یا حوالہ جاتی کتاب کہیں' وہ ہے۔ جانچنے کے لئے اسے کسی ادبی یا علمی ترازو کی صلیب پر لٹکانے کی ضرورت نہیں ہے۔

تھر ایک صحرا نہیں سمندر جیسی وسعتوں کا حامل عظیم ریگستان ہے جس کے بے شمار رنگ اور روپ ہیں۔ میں نے غالباً ان ہی صفحات میں کہیں لکھا بھی ہے کہ یہ اسرار و رموز کی دنیا ہے' ہر موسم میں' ہر سفر میں اس کے نئے نئے رنگ و روپ کھلتے ہیں اور ہر بار ہر رُت میں اس کا اک نیا راز اس کے عاشقوں پر منکشف ہوتا ہے۔ مجھے اسی انفرادیت نے اس کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ تھر پر صدیوں سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے ' بہت کچھ لکھا جائے گا۔ انگریزی اور سندھی میں اس پر کئی حوالے موجود ہیں' یقیناً اردو میں بھی اس پر حاشیہ آرائی کی گئی ہوگی ' لیکن یہ اتنا منفرد' متنوع اور پہلودار موضوع ہے کہ اس کے ایک ایک پہلو پر بیسیوں کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ میں تھر سے متعلق انتہائی محدود مواد پیش کرنے کی جسارت کر سکا ہوں۔ یہ میرا اپنے محبوب سرزمین کے لئے مختصر سا ہدیہ سپاس ہے جو قطعی اس کے شایانِ شان نہیں۔ زندگی نے مہلت دی اور وقت نے ساتھ نبھایا تو یقیناً اس موضوع پر اپنی تحقیقات کو اور زیادہ وسعت دوں گا۔

کراچی کے ان بیس اکیس برسوں کی صعوبتوں بھری زندگی میں میرا بہت کچھ مجھ سے

چھن گیا ہے۔ میں حساب کتاب کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی نفع نقصان کے بکھیڑوں میں پڑا ہوں۔لیکن انسان ہوں، کبھی نہ کبھی سود و زیاں کی الجھنیں اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتی ہیں تو مجھے بڑا ملال ہوتا ہے۔ میں ناشکرا نہیں، میں نے زندگی میں کچھ نہ پا کر بھی بہت کچھ پایا ہے مگر میرا اپنی ماں سے بچھڑنے کا غم میری زیست کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ میرے بابا کی ہجرت نے مجھے اندھیروں سے نکال کر روشنیوں میں اچھال دیا تھا مگر میری ہجرت نے میرے اور میری ماں کے درمیان زمینی فاصلوں کا پل صراط رکھ دیا ہے۔ میں اس کے لئے عمر خضری کا طالب اور خود اس کی دعاؤں کا طلب گار ہوں۔ میرے پاس اس کی دعاؤں کے سوا کوئی متاع نہیں۔

پہلے ڈینہہ دی قسمت پٹھڑی
جمدے ویلے امڑی مٹھڑی
ڈتڑا ڈکھ دا ڈان
لوڑھیس برہوں بحر وچ

زندگی کے اس موڑ پر کہ جب میں آپ کو لے کر صحرا کے سفر پر نکل رہا ہوں، میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی جستجو نہیں کہ میں مصلحت، خوف اور بزدلی کے زنداں میں پا بجولاں لکھاری کو اس کا منصب یاد دلاؤں کہ جس نے ''اپنے لوگوں'' اور ریت رستوں سے بھاگ کر کراچی کے ساحلوں میں پناہ لی اور جس نے صحافی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی ذمہ داریوں اور خود سے وابستہ توقعات سے منہ موڑ لیا۔ اس سفر میں جہاں ''سارنگا'' نے اپنی طلب اور تڑپ کا زادِ راہ میرے حوالے کیا ہے وہاں شاہ زیب خاور اور شاہ رخ خاور کی محبتیں بھی میری رفیق سفر ہیں جو میرے صحرا کے ہر سفر میں مجھ سے پوچھتے ہیں:

''بابا! شہر کو چھوڑ کر صحرا میں کیا لینے جاتے ہو، وہاں کیا رکھا ہے۔ تھر کے ریگزاروں میں خوراک اور پانی بھی ملتا ہے کہ نہیں؟ کیا وہاں رات کو ریت پر سونا پڑتا ہے اور کیا ریت پر سوتے ہوئے لوگوں کو ڈر نہیں لگتا؟ وہاں تو اندھیرا بھی بہت ہوگا، تو کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا۔''

وہ کمسن ہیں، بچے ہیں، بچوں کی طرح سوال پر سوال داغتے رہتے ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں کہ صحرا کی ریت میری روح میں رچی ہے اور آج میں جو کچھ بھی ہوں اس کی قوتِ پرواز مجھے صحرا ہی نے بخشی ہے۔ صحرائے چولستان سے ہجرت کر کے روشنیوں کے شہر میں بھٹک جانے والی اس

صحرائی روح کو اپنے متجسس بچوں کو جواب دینے کے لئے الفاظ نہیں ملتے تو وہ انہیں تسلی دیتا ہے کہ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' منظر عام پر آئے گی تو تمہیں تمہارے سارے سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ اور کبھی کبھی تو بچوں کی ماں بھی پوچھتی ہے کہ تھر کیا لینے جاتے ہو؟ کس سے ملنے جاتے ہو؟ وہ بھی بچوں کے سوال بچوں کی طرح دہراتی ہے کہ وہاں ویرانوں میں کیا رکھا ہے؟ تو میں اسے بھی تسلی اور یہی جواب دیتا ہوں کہ تھر پر میری کتاب آئے گی تو تمہیں بھی تمہارے سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔

میں انہیں تھر اور بھوکے پیاسے تھریوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا تا رہتا ہوں لیکن ان کے سوال ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوتے۔ میری اہلیہ اور میرے بچے خوش ہیں کہ میں ان کے سوالوں کے جواب دینے کے لئے کتاب لکھ رہا ہوں اور وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہیں کہ ایک عظیم صحرا پر لکھی جانے والی اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے جہاں تھر اور تھر کے ماروؤں کے دن پھریں گے وہاں ان کے بھی دن پھر جائیں گے:

درد فرید ہمیشاں ہووے
سارے پاپ دوئی دے دھووے
راہندی تانگھ تے تان
پہنچاں پریم نگر وچ

میں نے ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ۱۹۹۹ء میں اپنے تھر کے پہلے سفر کے پس منظر میں لکھی ہے۔ لیکن سیاق وسباق کو قائم رکھنے اور بعد میں کئے جانے والے سفروں کے مشاہدات آپ کی نذر کرنے کے لئے اس کتاب کو اپنے تھر کے اب تک کے آخری سفر ۱۴ راگست ۲۰۰۸ء تک پھیلا دیا ہے تاکہ آپ جدید تھر کی لذتوں سے بھی آشنا رہیں۔ میرے تھر کے پہلے سفر کا سبب کراچی کے سابق ناظم اعلیٰ نعمت اللہ خان بنے تھے جو تھر میں قحط کے دوران امدادی سرگرمیوں کے لئے سندھی اور اردو روزناموں سے وابستہ صحافیوں کو لے کر وہاں گئے تھے۔ اس کے بعد سارے سفر میں نے ذاتی حیثیت میں اور ذاتی دوستوں کے طفیل کئے۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی تکمیل واشاعت میں میرے یاروں نے دل کھول کر یارانہ نبھایا ہے۔ یہ معاونت دامے' درمے' سخنے اور قدمے ہر پہلو سے میرے ہم رکاب رہی ہے۔ میں

اپنے معاونین کا ذکر کرنے بیٹھوں تو اپنے دوستوں اور کرم فرماؤں سے انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں نام لکھنے بیٹھوں اور اگر ایک نام سے بھی صرفِ نظر کر بیٹھا تو مجھے زندگی بھر ندامت رہے گی۔اس لئے میں ان سب دوستوں اور کرم فرماؤں کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں جو میرے صحرا سے عشق کو پروان چڑھانے میں میرا سہارا بنے۔اللہ تعالیٰ میرے عشق، میرے خوابوں اور میرے دوستوں کو کو صدا اسلامت رکھے۔

نکلن آہیں سنجھ صباحیں
برہوں دُکھیندا بھاہیں
لگڑیاں چاہیں، بجھن نہ واہیں
رُلدی بیلے کاہیں
سنجڑیاں جھوکاں اجڑیاں جاہیں
یار فرید نہ آیا

سعید خاور
saeedkhawar@hotmail.com
0300-2140010
بدھ ۱۸/ مارچ ۲۰۰۹ء کراچی



درد کا صحرا اور صحرائی

میں قاہرہ کے قریب ابولہول کے مجسمے کے سامنے کھڑا ہوں' پس منظر میں دیو ہیکل اہرام ہزاروں برس سے تسخیرِ فطرت کی داستان سنا رہے ہیں۔ مجھے تا حدِ نظر ریت پھیلی نظر آ رہی ہے۔ یہ صحارا کی ریت ہے۔ لگ بھگ گیارہ ملکوں میں پھیلا یہ وسیع و عریض صحرا ہے۔ یہ صحرا مشرق سے تین ہزار میل اور شمال سے جنوب تک ۸ سو میل سے ۱۲ سو میل تک پھیلا ہوا ہے اور اس صحرا کا مجموعی رقبہ ۳۵ لاکھ مربع میل ہے۔ دنیا کا یہ سب سے بڑا صحرا اپنی ان گنت علامتیں اور نہ مٹنے والی نشانیاں رکھتا ہے۔ مصر' لیبیا' الجزائز' ماریطانیہ' مراکش' مالی' چاڈ' تیونس' سوڈان' اریٹریا اور نائیجریا کی تہذیبوں کو اپنے سینے میں سمائے یہ صحرا وقت کی ایک لامحدود نشانی کے طور پر شمالی افریقہ کے طول و عرض میں موجود ہے۔ اس صحرا کو عبور کرنے والے صحرا مزاج قافلے کئی کئی ماہ کا زادِراہ لے کر چلتے ہیں۔ اس صحرا میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ جیسے ہوا خلاؤں میں بادلوں سے شکلیں ابھارتی ہے' ویسے منہ زور آندھیاں صحراؤں میں بلند و بالا ٹیلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی رہتی ہیں۔ صحارا میں خزانے ہیں' کہیں کہیں فراعنہ مصر کے اہرام کھڑے ہیں' طوطن خامن' اخناطون اور دوسرے فرعون صحرا کے دفینوں سے عجائب گھروں میں منتقل ہو گئے ہیں۔ میں نے لندن کے برٹش نیشنل میوزیم اور پیرس کے لوور کے عجائب گھر میں فرعونوں کی ان گنت یادگاریں دیکھی ہیں' وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔

میں جدہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے میں بنائے گئے شاہی ٹرمینل سے شاہی جہاز میں

سوار ہورہا ہوں۔ میں نے پہلے جدہ سے مدینہ منورہ تک سفر کیا پھر تھوڑی دیر بعد مدینہ منورہ سے ابہا اور ابہا سے ریاض تک سفر کیا۔ میں ٦ گھنٹے تک ویران اور اجاڑ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ جزیرہ نما عرب کا وسیع و عریض صحرا بھی دیکھتا رہا۔ خشک مزاج صحرائے عرب کا موسم انتہائی خشک ہے۔ یہاں پر دن شدید گرم اور راتیں سخت سرد ہوتی ہیں۔ یہاں پر سالانہ صرف ٣٨ء١ انچ بارش ہوتی ہے' یہاں گرمیوں میں درجہ حرارت ٤٠ اور ٥٠ ڈگری سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے جبکہ سردیوں میں درجہ حرارت کم ہوکر پانچ اور ١٥ سینٹی گریڈ تک گر جاتا ہے۔ ابہا اور ریاض کے درمیان زمین پر بھوری ریت کی چادر بچھی نظر آتی ہے۔ جہاں آج ریاض واقع ہے' یہاں پر گزشتہ صدی کے اوائل میں سعودی خاندان کی ایک بستی تھی مگر آج یہ دنیا کے جدید شہروں میں شامل ہوگیا ہے۔ اس شہر کے قصر یمامہ کے اردگرد گھاس کا میدان' پھولدار پودے اور ہزاروں رنگ برنگے فوارے جنت کا نظارہ پیش کرتے ہیں مگر ریاض کے باہر صحرائے عرب اپنی روایتی خشکی اور خشک مزاجی کے ساتھ آج بھی موجود ہے۔

میں زاہدان سے بام اور یزد کی طرف بڑھ رہا ہوں' میرے سامنے صحرائے لوط ہے۔ اس صحرا میں فطرت کے شاہکار انسان کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ میں نے سوئی سے ڈیرہ بگٹی کے سفر کے دوران سنگی فصیلیں' بلند و بالا قدرتی قلعے' زمین میں گڑے ہوئے فطرت کے تراشیدہ کاک محل' قصر سلطانی کی چوبرجیاں اور محلات پر ایستادہ سنگی پہریدار دیکھے تو مجھے بام کے اردگرد دشت لوط میں مٹی کے قلعے اور محلات اور بلند و بالا ٹاور یاد آئے' ایسے مناظر میں نے ہنگلاج کے سفر میں بھی دیکھے۔ میں کرمان' یزد' کاشان اور قم سے ہوتا ہوا جب تہران کی طرف بڑھنے لگا تو دائیں جانب میں نے نمک کی جھیل دیکھی' صحرائے لوط اور صحرائے کویر' نمک کے صحرا بھی کہلاتے ہیں۔ قم اور تہران کے درمیان نمک کی جھیل سینکڑوں مربع میل کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ شاہ ایران کی شہنشاہیت کے خلاف اہل ایران کی بغاوت کے ایام میں رضا شاہ پہلوی کی سفاک خفیہ ایجنسی ساواک کے اہلکار باغی نوجوانوں کو اغوا کر لیتے اور انہیں ہیلی کاپٹروں میں بٹھا کر نمک کی اس وسیع و عریض جھیل میں پھینک دیتے تھے۔ دشت لوط اور دشت کویر میں سعدی کی حکایات سفر کرتی ہیں' شیرازی کے نغمے گونجتے ہیں' فردوسی کے کردار تاریخی رزم آرائیوں میں مصروف ہوتے ہیں اور خیام کی رباعیاں الاپی جاتی ہیں' کہیں کہیں محرم رازِ حقیقت مولانا روم کی مثنوی کے مصرعے قلبی

واردات بن کر وارد ہوتے ہیں۔

میں کئی بار محراب والا سے چولستان کے سفر پر نکلا ہوں' مگر ہر بار مجھے چولستان کا دامن سکڑتا ہوا محسوس ہوا' میں نے روہیلوں کی دربدری اور ان کے صحرا میں دور دراز کے لوگوں کی آبادکاری کو دیکھا بھی ہے اور سمجھا بھی ہے۔ برسوں پہلے یوں ہوتا تھا کہ روہیلے اپنے سینکڑوں مویشیوں کو روہی میں چھوڑ کر گھروں کو واپس آجاتے' جب کبھی دودھ کی ضرورت ہوتی تو چرواہے ٹیلوں پر چڑھ کر ہر گائے کو اس کے نام سے پکارتے اور ہر گائے اپنا نام سن کر دوڑتی ہوئی اپنے چرواہے کے پاس ٹیلے پر پہنچ جاتی۔ چرواہا دودھ دوہتے ہوئے گائے سے باتیں کرتا جاتا اور گائے یوں متوجہ ہوتی جیسے ہر بات سمجھ رہی ہو' وہ ہر ہدایت پر عمل کرتی' صرف اپنے مالک کے جانوروں کے ساتھ مل کر روہی کی گھاس چرتی اور کسی دوسری چھیڑ میں شامل نہ ہوتی۔

میں نے چولستان میں ایسے کھوجیوں کو دیکھا ہے جو ریت پر اونٹ کے قدموں کے نشان دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ اونٹ کی پیٹھ پر سامان لدا ہوا ہے یا وہ سامان اور سوار کے بغیر چل رہا ہے۔ میں نے چولستان میں بارش کے بعد پودوں کی بہار دیکھی ہے اور جنگلی پھولوں کی مست کر دینے والی خوشبو سونگھی ہے۔ میں نے ایسی گائے کا دودھ پیا ہے جس نے کترن کو گھاس سمجھ کر کھایا' دودھ سے ایسی خوشبو آرہی تھی جیسے آپ ہزار رنگ پھولوں کے باغ میں آگئے ہوں۔ چولستان میرے من میں آباد ہے۔ قلعہ ڈیراور میرے سینے پر کھڑا ہے۔ ڈیلھے' پیلھوں میری آنکھوں میں اگے ہیں' شتربان کی آواز میری سانسوں کی بازگشت ہے' صحرا کی پیاس میرے اندر کا سوز ہے' صحرائی پرندوں کی باوقار چہکار میرے دل کی تاروں کو چھیڑتا ساز ہے۔ میرے رہبر خواجہ غلام فرید اور میرے اباجی سفیر لاشاری کی روہی میری روح کے اندر آباد بھی ہے اور ویران بھی ہے۔

میں نے کئی بار صحرائے تھر کا سفر کیا' میں جب بھی جھڈو سے نوکوٹ پہنچا ہوں تو یہاں مجھے پیاس کا پہلا استعارہ ملا۔ نوکوٹ سے دائیں جانب ایک خاتون پیر کی خانقاہ ہے' اس درگاہ میں سجادہ نشین ہمیشہ خاتون ہوتی ہے' اسے بچپن میں ہی سجادگی کیلئے نامزد کر دیا جاتا ہے اور اپنی نامزدگی کے بعد وہ خاتون اپنے ہر محرم کیلئے غیر محرم بن جاتی ہے۔ وہ جس عمر میں بھی نامزد کر دی جائے وہ اپنے باپ' بھائی' چچا' ماموں' دادا' نانا غرض ہر ایک رشتہ دار کیلئے اجنبی بن جاتی ہے۔ وہ پردے میں چلی جاتی ہے' اسے زندگی بھر کوئی بھی مرد نہیں دیکھ سکتا' سجادہ نشین خاتون کی جانشین

بھی خاتون ہوتی ہے'اس طرح وہ دونوں ساتھ رہتی ہیں۔کیا یہ پیاس کا استعارہ نہیں ہے۔

میں جب بھی نوکوٹ سے مٹھی کی طرف چلا ہوں مجھ پر ہمیشہ ایک وجد اور سرشاری کی کیفیت طاری رہی۔شاید گھاگھرا مل جائے شاید ہاکڑا بہتا ہو۔شاید پران رخ بدل کر مٹھی آ پہنچا ہو مگر یہاں پہنچ کر صرف اپنی آنکھ کا آنسو بہتا ہے۔شاید ماضی کے کسی ایوب خان نے گھاگھرا کو بیچ دیا تھا اور اب پھر ماضی قریب کے فیلڈ مارشل ایوب خان نے تین دریا بیچ دیئے۔اب راوی' ستلج' بیاس کی گزرگاہیں مٹنے لگی ہیں تو گھاگھرا بہت یاد آتا ہے۔روہی'اور تھر کو گھاگھرا کی موت نے صحرا بنایا۔اب دیکھیں کتنے بھالوا' اسلام کوٹ' چھاچھرو' عمرکوٹ اور ننگر پارکر تھر اور روہی کا روپ دھار کر ریت کی چادر اوڑھتے ہیں۔مٹھی سے اسلام کوٹ اور وہاں سے ننگر پارکر تک آپ کو ان گنت مور' کالے اور بھورے ہرن ' بارہ سنگھے' تلور اور دوسرے چرند پرند نظر آئیں گے۔ آپ کو ننگر پارکر کے قریب وہ درخت بھی مل جائے گا' جس درخت کی بے رحم شاخ کو تختہ دار بنا کر روپلو کولہی کو پھانسی دی گئی تھی اور ننگر پارکر کے مشرقی حصے میں صحرا کی ریت میں دفن اس مسکین جہان خان کھوسو کی قبر بھی مل جائے گی جو مٹھی اسلام کوٹ' میر پور خاص' عمرکوٹ اور چھاچھرو میں ان غریب تھریوں کی بلا معاوضہ درخواستیں لکھتا جو سرکار کے دربار میں تحریری عرض گزاری کے قابل نہیں تھے۔مسکین جہان خان کے پاس کاغذ اپنے ہوتے'قلم دوات بھی اپنی ہوتی۔وہ فریادیں سنتا اور درخواستیں لکھتا تھا۔میں نے جب بھی مسکین جہان خان کو یاد کیا مجھے اپنا دوست صوفی صبغت اللہ مزاری شہید یاد آیا جو ضلع ڈیرہ غازی خان' راجن پور' جیکب آباد اور رحیم یار خان کے ڈپٹی کمشنروں' اسسٹنٹ کمشنروں اور تحصیلداروں کے نام ان پڑھ غریب کسانوں کی درخواستیں لکھ کر دیا کرتا۔صوفی صبغت اللہ نے ہر ضلع اور تحصیل کیلئے دن مقرر کر رکھے تھے اور جس دن صوفی صبغت اللہ نے آنا ہوتا تھا اس روز تحصیل میں میلے کا سماں ہوتا تھا۔درخواست گزاروں کے ہجوم میں گھرا صوفی صبغت اللہ مزاری ہر کسان سے اس کا مسئلہ پوچھ کر بحضور فیض گنجور کے الفاظ سے درخواست کا آغاز کر رہا ہوتا تھا۔

مسکین جہان خان اور صوفی صبغت اللہ مزاری ہر بار ایک نیا جنم لے کر دھرتی پر وارد ہوتے ہیں اور بوتراب کی پیروی میں افتادگانِ خاک کو مٹی سے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہیں اور ان سے درد کی شراکت داری کرتے ہیں۔اب کے درد کے صحراؤں میں مسکین جہان خان اور صوفی

صبغت اللہ نے سعید خاور کے روپ میں نیا جنم لیا ہے۔ سعید خاور سے میرا رشتہ دوست' بھائی' ہم زاد' ہمراز' ہم درد سے بڑھ کر کوئی اور رشتہ ہے۔ ہم کہیں ایک ہی مٹی سے اٹھائے گئے' پھر رچائے گئے' پھر مٹی کی رس میں رسائے گئے' پھر کسی چاک پر رکھ کر ڈھالے گئے' پھر کسی چلچلاتی دھوپ میں سکھائے گئے' پھر کسی ایک بھٹی میں دہکائے گئے' جلائے گئے' پکائے گئے' ہم ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں۔ سعید خاور میری اناؤں کا پالن ہار ہے' ہم دونوں جاگیردارانہ معاشرے کی پیداوار ہیں' جہاں عام انسانوں کا کوئی نام نہیں ہوتا' کوئی ذات نہیں ہوتی' کوئی خاندان نہیں ہوتا' کوئی عزت نہیں ہوتی' کوئی وقعت نہیں ہوتی' کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ ہم بے حیثیت لوگ بے وقعت گھروں میں پیدا ہوئے۔ ہمارے گھروں کی دھوپ' چھاؤں بھی ہماری اپنی نہیں ہوتی' ہم بے خانماں لوگ بس حشرات الارض کی طرح اس دنیا میں آئے' جانوروں کے ساتھ رہے' جانوروں میں پلے بڑھے' مگر ہم دونوں خوش نصیب تھے' ہم دونوں کے والد اپنے اپنے عہد کے سرداروں' خانوں' نوابوں' رئیسوں اور جاگیرداروں سے کہیں بڑے تھے' بہت بڑے تھے۔

مجھے یہ بات کل کی طرح یاد ہے میں نے لاہور بورڈ سے مڈل کا امتحان دینے کیلئے بورڈ کی فیس مبلغ ۲۵ روپے ادا کرنی تھی' نجانے ابا نے کیا سوچ کر کہا کہ چلو نوشہرہ یا چوٹی زیریں چل کر احمد علی خان سے یا کسی اور سے ۲۵/روپے کی امداد مانگتے ہیں۔ ہم دونوں پیدل چل پڑے لگ بھگ ۱۵ میل کے پیدل سفر کے بعد نوشہرہ پہنچے۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی' ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے۔ گاؤں کی روایت کے مطابق ہمیں لسی اور چند روٹیاں دی گئیں وہ ہم نے کھالیں۔ ابا نے مجھ سے کہا کہ یار میرا دل نہیں کرتا کہ کسی احمد علی خان' کسی محمد خان' کسی محمود خان' کسی عطا محمد خان کے آگے ہاتھ پھیلاؤں' چلو واپس چلتے ہیں۔ ہم نے ۱۵ میل واپسی کا سفر کیا' رات ہوگئی سو گئے۔ اگلے دن ابا نے گھر کی واحد منقولہ جائیداد ایک کم عمر گدھا ۲۸ روپے میں بیچ دیا۔ ۲۵/روپے بورڈ کی فیس کیلئے میرے حوالے کئے اور تین روپے سے انڈوں کا کاروبار شروع کر دیا۔ آپ نے شاید بڑے آدمیوں کے بارے میں سنا ہو مگر ہم نے تو دیکھے بھی ہیں۔ سعید خاور کے والد نے بھی بیٹے کی بغاوت سے سمجھوتہ کر کے دولہا سائیں کے قصوں کہانیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ سعید خاور نے اپنے والد کے بارے میں ایک اجمالی روداد خود ہی بیان کر دی ہے۔

ہمارے دور کے ایک نئے مسکین جہان خان اور نئے صوفی صبغت اللہ نے تھر کے مسکینوں

کی ایک نئے طرز کی درخواست لکھی ہے۔تھر کی ریت کے نیچے سیاہ سونے کے انبارر کھے ہیں۔ اس صحرا میں دنیا کا کوئلے کا دوسرا بڑا ذخیرہ موجود ہے جو سندھ والوں کی صدیوں کی توانائی کی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔مگر کیا کوئلہ تھر والوں کو‘ سندھ والوں کو ملے گا‘ یا کہیں بلند ایوانوں کے ٹھنڈے کمروں میں یہ انمول خزانہ اونے پونے داموں میں لگا دیا جائے گا۔

سعید خاورتم پر اور مجھ پر بڑے قرض ہیں۔ہم سندھ کے ‘ سرائیکی دھرتی کے‘ بلوچستان کے‘ نیلی بار کے ‘ شاہ حسین کے پنجاب کے‘ خوشحال خان خٹک اور رحمٰن بابا کے سرحد کے ذرے ذرے کے مقروض ہیں۔ ہماری ہر سانس ہم پر قرض ہے۔تم خوش نصیب ہو‘ تم ایک صحرا کا قرض ادا کر رہے ہو‘ تم درد کے صحرا کے ایک اور مسکین جہان خان‘ ایک اور صوفی صبغت اللہ بنے ہو‘ تم درد کے ماروں کے ایک اور عرضی نویس بن کر اٹھے ہو‘ دیکھو! میں نغمہ سن رہا ہوں:

جنڈر جڑے ‘ مال چھڑے ‘ باکھ پھٹے تھی
باکھ پھٹے تھی ‘ او ساتھی رات کھٹے تھی
ہر کو ڈسے ہتھ کڑی ‘ ہر کو ڈسے پیر کڑی
کئیں ٹٹے تھی ‘ او ساتھی رات کھٹے تھی

نذیر لغاری

۱۰/جون ۲۰۰۹ء



تھر پر جامع حوالہ

تھر سندھ کا وہ خطہ ہے جو معدنی دولت سے مالا مال ہے لیکن اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی' اس لئے بھوک اور افلاس کا صحرا بن گیا ہے۔ مملکت کے سرابراہان کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ وہ سرحدی علاقوں پر خاص توجہ دیتے ہیں ان کے مسائل کو حل کر کے انہیں خوشی اور خوشحالی دیتے ہیں تاکہ وہ اپنے وطن کے وفادار رہیں۔ لیکن بدقسمتی سے تھر ہر دور میں بھوک اور افلاس کا صحرا بنا رہا۔ تھر پر بہت کم لکھا گیا ہے' سب سے پہلے حضرت شاہ عبداللطیف بھٹائی نے تھر جا کر مارئی کی حب الوطنی کی داستان سر مارئی میں منظوم کی۔

تھر پر پہلی کتاب کیپٹن اسٹینلے ریکس کی Memoir on Thar and Parkar ہے جس کا بندہ راقم نے سندھی میں ترجمہ کیا جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں تھر کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اس کے علاوہ تھر کا جغرافیہ' قومیں ' قبیلے' آدم شماری' بیوپار' پیداوار اور محصول وغیرہ کے موضوعات پر قیمتی مواد موجود ہے۔ ریکس ۱۸۴۷ء میں کچھ بھوج میں اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے تھے۔ نگر پارکر' مٹھی اور ڈیپلو تحصیلوں کے حصے جو برٹش سرکار کے زیر تسلط تھے اس کا انتظام اسٹینلے ریکس کے حوالے کیا گیا تھا' ان کا ہیڈ کوارٹر بھوج میں تھا۔ کیپٹن اسٹینلے ریکس نے سرکاری ریکارڈ اور کچھ اپنے ذاتی مشاہدے کی روشنی میں تھر اور پارکر پر انگریزی زبان میں جو کتاب لکھی وہ ۱۸۵۹ء میں ممبئی سرکار کی طرف سے شائع ہوئی۔

۱۹۳۴ء میں تیج سنگھ سولنگی نے سندھی زبان میں ''امرکوٹ اتہاس'' کے عنوان سے ایک

کتاب لکھی۔سندھی زبان کے مشہور ادیب محمد اسماعیل عرسانی نے بھی تھر پر دو کتابیں ''بدنصیب تھری'' اور ''سیر ریگستان'' سندھی زبان میں لکھی تھیں۔پہلی کتاب میں تھر کی تہذیب وتمدن ' وہاں کے لوگوں کی اقتصادی ' معاشرتی اور سماجی حالات کے ساتھ ان کی جہالت اور سادگی پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دوسری کتاب میں تھر کے تاریخی وجغرافیائی حالات کے علاوہ موجودہ تھر کے حالات درج ہیں۔

اس کے علاوہ ہریچند کی کتاب ''تاریخ ریگستان'' دو جلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔پہلی جلد کے سترہ ابواب ہیں جن کے عنوانات کچھ یوں ہیں ۔تھر اور پارکر کے طبعی حصے اور اس کی قدامت' تھر پارکر کے راجپوت' تھر میں سومروں کی حکومت' تھر میں سوڈھوں اور راٹھوڑوں کی حکومت' سومروں کی حکومت کا شروعاتی دور' سومروں کی حکومت کا آخری دور' تالپوروں کی حکومت' انگریزوں کی حکومت' حکومت پاکستان (۱۹۴۷ء) ' تھر پارکر کے مشہور گاؤں اور ان کی آدم شماری' تھر میں رہنے والی قومیں' تھر پارکر کی معاشی حالت' تھر کے رسم ورواج اور تھر کی تہذیب وتمدن۔دوسری جلد پہلی جلد سے ذرا ضخیم ہے جو بائیس ابواب پر مشتمل ہے جس میں تھر کے طبعی حصے' شاہ کا تھر' تھر کے ریگستانی ٹیلے (بھٹیں) اور ان کے حصے' کارونجھر جبل' گھاس' پودے' بیلیں اور درخت وغیرہ' تھر کے گاؤں' تھر میں پنچائتیں' برسات' کنویں' رونیو سرشتہ' زمینوں کی پیائش' فصلیں' جانور' پرندے' میلے' لوگوں کے وہم ووسوسے' گزرسفر' اور رسم ورواج پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس موضوع پر منگھا رام اوجھا کی ایک کتاب ''پرانو پارکر'' (پرانا پارکر) بھی شائع ہوچکی ہے جس میں پارکر کی حدود' کارونجھر جبل' پہاڑیاں اور تالاب وغیرہ رن کچھ' پاری نگر سندھ کی ایک شاندار بندرگاہ' بوڈھیسر اور اس کے تالاب میں ہوتھل پری کا آستانہ' محمود شاہ' بوڈھیسر کی مسجد' پرماروں کے دور میں پارکر کے حالات' پارکر پر سومروں کا حملہ' پارکر پر تالپوروں کی حکومت اور ننگر پارکر میں رہائش پذیر قومیں وغیرہ کے عنوانات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

محترم عبدالقادر منگی سابق سیکریٹری ثقافت وسیاحت' جب تھر کے ڈی سی تھے 'انہوں نے مٹھی میں ۱۹۹۲ء میں سہ روزہ ''تھر سیمینار'' کا انعقاد کرایا تھا۔جس میں بڑے معیاری مقالات پڑھے گئے اور بعد میں ان مقالات کو کتابی صورت دی گئی۔وہ کتاب ''تھر'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔منگی صاحب نے مندوبین کو تھر کی سیر بھی کروائی' بندہ راقم نے بھی اس سیمینار میں اپنا مقالہ

پڑھا تھااور واپس آ کر تھر کا ایک مختصر سفر نامہ سندھی زبان میں لکھا تھا جو اخبارات میں شائع ہوا تھا۔

تھر لوک ادب کے لحاظ سے مالا مال خطہ ہے. میں نے اپنے ایک شاگرد کو تھر کے لوک ادب پر P.H.D کا مقالہ لکھنے کی تجویز دی اور انہوں نے اس موضوع پر مقالہ لکھ کر P.H.D کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالہ ڈاکٹر عنایت حسین لغاری نے لکھا تھا جو آج کل وفاقی اردو یونیورسٹی میں سندھی شعبہ کے چیئر مین ہیں۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ تا حال شائع نہیں ہو سکا۔

میں نے تھر پر شائع ہونے والی کتابوں کا مختصر ذکر اس لئے کیا ہے تا کہ قارئین کو معلوم ہو سکے کہ تھر کو ہر لحاظ سے اہمیت نہیں دی گئی' چند کتابیں سندھی زبان میں لکھی گئی ہیں لیکن تھر پر اردو اور انگریزی میں مواد نہ ہونے کے برابر ہے۔اس موضوع پر ممتاز صحافی سعید خاور نے لکھنے کا بیڑہ اٹھایا ہے جو یقیناً قابلِ ستائش ہے۔

محترم سعید خاور صاحب کا جنم چولستان میں ہوا' جس کو مقامی لوگ ''روہی'' کہتے ہیں ان کا بچپن اور لڑکپن اسی صحرا کی گود میں پروان چڑھا۔جس شخص نے جہاں جنم لیا ہو اور لڑکپن کے دن جہاں گزارے ہوں' وہ علاقہ اسے بے حد پیارا لگتا ہے۔سعید خاور صاحب کو صحرا سے ازلی عشق ہے۔ وہ سرائیکی علاقے کا صحرائے چولستان ہو یا سندھ کا صحرائے تھر۔ان کو روہی سے بے پناہ محبت ہے' انہوں نے خود ہی لکھا ہے:

''روہی' ماں کے بعد میری اگلی پناہ گاہ تھی جس نے ماں کی طرح مجھے گود لے کر لوریاں سنائیں اور پروان چڑھایا۔بھوک' پیاس اور افلاس' چولستان اور تھر ایک ہی نصیب لے کر وجود میں آئے ہیں' یہ آگہی مجھے اسکول کے دنوں میں مل گئی تھی۔ میرے بابا بھی سچے روہیلے (ریگستانی) تھے۔پہلی بار انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ سندھ کی بغل میں چولستان کی سرحد کے ساتھ ایک صحرا ''تھر'' جڑا ہوا ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع وعریض اور دلفریب ہے۔ بابا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ چنوروں اور بھنوروں کی اس سرزمین پر دن رات مور ناچتے ہیں اور وہاں کے لوگ بھوک اور افلاس کے باوجود اپنی دھرتی سے بے پناہ پیار کرتے ہیں' مجھے یاد ہے کہ میں نے بابا سے کہا تھا کہ بابا! پیاس اور افلاس کے باوجود میں بھی اپنی روہی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں''۔

طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی جنم بھومی روہی پر کچھ لکھیں گے لیکن قسمت انہیں گریجویشن کے بعد کراچی لے آئی اور ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی' جس کا

انہیں بے حد ملال ہے' لکھتے ہیں:

''کراچی میں اپنی دریافت کی ایک نئی دھن نے مجھے اپنے اس خواب سے بہت دور کردیا اور میرا یہ خواب کسی حد تک میرے لئے اجنبی سا ہوگیا' مگر جب بھی مجھے میرا وہ بے تعبیر خواب اپنی یاد دلاتا ہے تو میں روح تک کانپ جاتا ہوں۔ روہی اور روہیلوں کا یہ قرض اب بھی اپنے وجود پر جھیل رہا ہوں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے یہ گراں مایہ قرض چکانے کا وسیلہ فراہم کردے۔''

انہوں نے مزید لکھا ہے:

''دسمبر ۱۹۸۷ء میں نوائے وقت گروپ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد میرے اندر یہ خواہش جاگی کہ دنیا کے تیسرے بڑے صحرا' حیرتوں اور غیرتوں کی سرزمین موروں کے مسکن ''صحرائے تھر'' کا تفصیلی سفر کرکے وہاں وہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں جو میرے بابا نے میرے بچپن میں میری آنکھوں میں بسا دیئے تھے اور ان حالات کا بھی جائزہ لوں جن کی وجہ سے تھر کے ''مارو'' اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔''

قرض پر چلنے والی سرکار بیچارے تھریوں کی کیا مدد کرسکتی ہے! بیرونی امداد سے چلنے والی کچھ N.G.O اور سیاسی سماجی ادارے تھریوں کی پیاس' بھوک اور افلاس دور کرنے کیلئے کیا کردار ادا کررہے ہیں' وہ سعید خاور کی زبانی سن لیں:

''قدرت اور حکومت نے پیاس اور افلاس کے اس صحرا سے منہ موڑ لیا ہے۔ کچھ این جی اوز اور سیاسی سماجی ادارے انفرادی سطح پر تھر میں زندگی کو بچانے کے لئے کوششیں بروئے کار لارہے ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک کا کردار سوالیہ نشان ہے۔ میں کئی ایسی تنظیموں اور اداروں کو جانتا ہوں جو امداد کی رقم سے زیادہ روپے خبروں اور تصویروں کی نمائش پر خرچ کردیتے ہیں وہ اس سستی شہرت کی بیساکھیوں پر کھڑے ہوکر بلند قامت نظر آنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان کا خیال آتے ہی میں کھولنے لگا اور میں نے من ہی من میں انہیں خوب سنائیں۔''

محترم سعید خاور دردمند دل رکھنے والے انسان ہیں اور دردمند دل رکھنے والے انسان بہت کم ہوتے ہیں۔ وہ جہاں ویرانی اور زبوں حالی دیکھتے ہیں تو ان کے دل میں درد اُٹھتا ہے اور وہ بے اختیار اپنے دل کا درد بیان کرتے ہیں' لکھتے ہیں:

''ہم نوری آباد سے گزرے تو اس کی زبوں حالی دیکھ کر مجھے ملال ہوا۔ حکومت سندھ نے

اسے قائم کرتے ہوئے بلند بانگ دعوے کئے تھے اور کہا تھا کہ یہ صنعتی منصوبہ صوبے کی تقدیر بدل کے رکھ دے گا۔ ربع صدی بعد اب اس کی عملی تصویر سب کا منہ چڑا رہی ہے۔'' اس کی تباہی کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نوری آباد ایک کامیاب صنعتی قصبہ ثابت ہوسکتا تھا مگر فضول حکومتی پالیسیوں' سرکاری عدم تعاون' سیاسی اقربا پروری' صنعتکاروں کی عدم دلچسپیوں' بے اعتدالیوں' بنیادی سہولتوں کی کمیابی' ناروا ٹیکسوں کے اطلاق اور ڈاکوراج کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام بنادیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا کہ نوری آباد کے چند کارخانوں کی چمنیاں دھواں اُگل رہی ہیں' بیشتر ویران پڑی ہیں' یہاں بیمار صنعتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جارہی ہے' سندھ کو صنعتی انقلاب کی راہ پر گامزن کرنے کے حکومتی دعوے مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔''

وہ جب دریائے سندھ کی حالت دیکھتے ہیں تو خون کے آنسو روتے ہیں۔ انہوں نے ۱۹۸۸ء میں بھی سن میں اپنے دوست نذیر لغاری کے ساتھ اس کی لپکتی لہروں سے مصافحہ اور مکالمہ کیا تھا اور آج بھی سندھوان کے سامنے ہے:

''مگر آج حیدرآباد سے گزرا ہوں تو دریائے سندھ کے دامن میں نہ وہ لہریں ہیں اور نہ وہ اس کا روایتی جوش وخروش' ہر طرف ریت اُڑ رہی ہے' موسم کیا خفا ہوئے کہ اس کی موجیں ہوا ہوگئی ہیں...... میری نظر کی آخری حد تک دریا میں ریت اُڑ رہی ہے' پانی کی پتلی سی لکیر سرکتے سرسراتے سانپ کی طرح بل کھاتی' پل کے نیچے سے گزر رہی ہے۔ میں دریائے سندھ کے دم توڑتے وجود کو دیکھ کر لرز گیا!''

پھر ان کو ''ہاکڑا'' یاد آجاتا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ہاکڑا' بھی ایک روز چولستانیوں سے روٹھ گیا تھا' وہ کیا روٹھا روہی سے زندگی روٹھ گئی...... کیا سندھو بھی سندھ واسیوں سے روٹھ جائیگا؟''

پھر آگے چل کر دریائے سندھ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''دریائے سندھ ایک دریا ہی نہیں' ایک زندگی' تاریخ' ایک تہذیب اور ہزار ہا الف لیلوی داستانوں کا سرچشمہ ہے۔''

فاضل لکھاری نے دورانِ سفر خشک سالی کی صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے ڈیپلو' اسلام کوٹ'

مٹھی اور چھاچھرو کے آس پاس کئی دیہات کا دورہ کیا اور لوگوں کے خیالات سننے اور حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''خشک سالی میں حکومت کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات سے نہ تو تھری خوش ہیں اور نہ ہمیں ان اقدامات سے کوئی اطمینان ملا ہے۔ تھری قحط کے عالم میں ہیں اور ریاست کا کردار سب کچھ نعرے بازی اور دکھاوے تک محدود ہے۔''

جب ہر موڑ پر بھوک' پیاس اور افلاس نظر آئے تو ایک حساس لکھاری' دردمند دل رکھنے والا انسان اور کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے' وہ حکومت کو تجاویز دینے کے علاوہ کر ہی کیا سکتا ہے۔ اور انہوں نے کتاب کے آخری باب میں بے حد مفید اور کارآمد تجاویز دی ہیں جن پر اگر عمل کیا جائے تو تھر جو بھوک' پیاس اور افلاس کا صحرا ہے' وہ گلزار اِرم بن سکتا ہے۔

فاضل مصنف نے غریب اور امیر کی زندگی کا نقشہ کھینچنے کے بعد اپنے دردمند دل کی پکار اس طرح سے بیان کی ہے:

''جس معاشرے میں غریب اور امیر کے درمیان خلیج اتنی وسیع ہو وہاں عام آدمی کی تعلیم اور صحت کے لئے کیا وسائل دستیاب ہوں گے اس کا اندازہ پوری قوم کو ہے۔ غریب آدمی جس کے ووٹوں سے پالیسی ساز برسراقتدار آتے ہیں' ان کے اپنے گاؤں گوٹھ بھی تعلیم اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں اور امیر آدمی اپنے بچوں کو ملک اور بیرون ملک مہنگی اور اعلیٰ ترین تعلیم سے آراستہ کرتا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے علاج معالجے کی بہترین سہولتوں سے فیضیاب ہوتا ہے۔''

تھری بچوں پر بھی کسی کو رحم نہیں آتا۔ ان بے چاروں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنے کے بجائے محنت اور جبری مزدوری میں جھونک دیا گیا ہے' ان کی حالت زار سعید خاور صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''غربت کے مارے تھری بچے اور ان کے والدین بھی کھیت مزدوروں کی طرح ساہوکاروں کے پھیلائے ہوئے پُرفریب اور گنجلک قرضوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان سیٹھوں اور ان کے گماشتوں نے وڈیروں کی طرز پر تھری خاندانوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے' قالین ساز سیٹھ ان خاندانوں کو قرض کی کچھ رقم فراہم کرتا ہے اور ان کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے کہ اس کے

عوض ان کے خاندان کے تمام افراد بشمول کم عمر بچے ان کی کھڈیوں میں کام کریں گے۔''

اس قسم کے قرض اور لین دین کا نتیجہ دردناک ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ وہ مسلسل استحصال کی چکی میں پس رہے ہیں۔ خاور صاحب نے لکھا ہے:

''قرض اور لین دین کی یہ شکل تھر میں غریب خاندانوں کے مستقل استحصال کا سبب بن گئی ہے۔ اگر کوئی خاندان کسی سیٹھ سے ۱۰/ہزار روپے قرض اُٹھاتا ہے تو وہ ۵ سال بعد ۵۰/ہزار روپے تک جا پہنچتا ہے۔''

معصوم بچے جو اچھے کپڑے پہن کر اسکول کی زینت بننے چاہئیں وہ کھڈیوں کی دھول کھا کر بیمار ہو جاتے ہیں:

''ملک بھر میں ۵ سے ۱۲ یا ۱۴ سال کے تقریباً ایک کروڑ ۲۰ لاکھ بچے ہیں۔ ۵ سے ۱۲ سال کے کم و بیش ۱۰ ہزار بچے ایسے ہیں جو قالین کی کھڈیوں میں کام کر کے نہ صرف اپنی صحت برباد کر رہے ہیں بلکہ اپنا مستقبل اندھیروں میں جھونک رہے ہیں۔'' انہوں نے تھری بچوں کی آواز دنیا تک پہنچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس کتاب کے ذریعے پورا کر دیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے ایک باب ''تھر کے کمسن کھڈی مزدور'' میں لکھتے ہیں:

''مانک چند' شانت' نندو' گجو اور سارے دوستو! آج میں نے سارے زمانے کو بتا دیا ہے کہ میرے تھر کے یہ معصوم دوست مرنا نہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ زمانے والو! آگے بڑھو اور خدارا میرے ان کمسن کھڈی مزدور دوستوں کیلئے کچھ کرو۔''

دردمند دل کی ایک اور صدا سن لیجئے:

''تھر اپنے پرایوں سب کا زخم خوردہ ہے۔ انتخابات کے موسم میں ان کے ووٹوں کیلئے وڈیرے' جاگیردار' تاجر' صنعتکار' سیاستدان اور سیاسی جماعتیں ماروؤں کے گاؤں گوٹھوں کا طواف کر کے ان کی زندگیاں بدلنے کے وعدے کر کے کامیابیاں حاصل کرتے ہیں لیکن ماروؤں سے کئے گئے وعدے کبھی پورے نہیں کرتے۔ تھر کا المیہ یہی ہے کہ اس کی نمائندگی کرنے کے دعویدار خود تو خاصے متمول اور موثر ہیں لیکن ان کے ماروؤں کی حالت ناگفتہ بہ ہے' ان کی تقدیر بدلنے کے دعویدار اسمبلیوں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اگلے انتخاب تک کہیں کھو جاتے ہیں۔ تھر کے ''مارو'' ان فصلی بٹیروں کے ہاتھوں ہمیشہ تماشہ بنے رہتے ہیں۔''

تھر میں متعدد این جی اوز کام کر رہی ہیں۔ ان کا کیا کردار ہے؟ انہوں نے کون سے کارنامے سرانجام دیئے ہیں؟ اس کے متعلق فاضل مصنف نے درد کی داستان یوں بیان کی ہے:

''تھر میں حالیہ خشک سالی بھوک اور بیماری کے متاثرین کے لئے عالمی اداروں سے ملنے والی خطیر امداد نے ایک بار پھر بعض این جی اوز کے کارندوں کوامتحان میں ڈال دیا ہے کہ یہ رقم ہضم کیسے کی جائے کہ پھر کہیں ان ہی ڈونرز سے اینٹی ڈائریا نہ طلب کرنی پڑے۔ یہاں مجھے حکیم بوعلی سینا کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ ''اتنا کھاؤ جتنا ہضم کرسکو۔'' ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر تھریوں سے محبت جتانے والو! تمہیں کیا پتہ کہ تھر کے عوام کے درد کیا ہیں۔ تمہیں کیا پتہ کہ لُو اور گرمی میں تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلنے والے پر کیا گزرتی ہے؟ غریبوں کو سکھ دینے کے جھوٹے دعویدارو تم نے کبھی اپنے گریبان میں جھانکا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو کیا تم کبھی اپنے بچوں کیلئے کھلونے خریدتے وقت یہ سوچتے ہو کہ بھوک اور بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والے تھریوں کے یتیم بچوں کو اپنا جسم ڈھانپنے کیلئے کپڑے کا ٹکڑا تک میسر نہیں ہے اور تھریوں کے واحد ذریعہ معاش مویشی بھی مر رہے ہیں ان کیلئے تم نے کبھی سوچا ہے! اے صاحب بہادرو! حکومت کے پاس تو پہلے ہی اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ ہے جس میں بہت سے ڈاکٹر تنخواہیں تو سرکاری خزانے سے لیتے ہیں مگر کام مختلف این جی اوز میں کر رہے ہیں۔ مگر صاحبو تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ تھر واسیوں کو میسر صحت کی سہولیات جو بہت تھوڑی ہیں تم وہ بھی چھین رہے ہو۔ اے منرل واٹر پینے والو پیاسے تھریوں کے بارے میں بھی سوچو۔ این جی اوز کیا تھیں اور کیا بن گئی ہیں؟''

اسلام کوٹ کے بہادر لال نے ان تنظیموں کے متعلق جو رائے دی ہے وہ ان کے دردمند دل کی آواز ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''تھر میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں خدمت اور انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں' انہوں نے ہماری مجبوریوں کو نیلام کیا ہے' ہمارے نام پر کروڑوں کما کر اپنی تجوریاں بھری ہیں' ان تنظیموں کے کارندے لکھ سے لکھ پتی ہو گئے ہیں' تھر اور تھری وہیں کے وہیں ہیں۔ یوں تو یہ سارا سال ہمارے نام پر کھاتے ہیں مگر جب بھی صحرا میں قحط سالی اور خشک سالی کے موسم آتے ہیں تو ان کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دنیا جہان سے ہماری زندگی کو تماشہ بنا کر کروڑوں بٹورتے ہیں مگر ان کا ایک پیسہ ہمارے کام نہیں آتا۔ یہ پُرتعیش زندگی گزارتے ہیں' بڑی بڑی ایئر کنڈیشنڈ

گاڑیوں میں گھومتے ہیں' خوبصورت دفاتر میں بیٹھ کر فلسفے بگھارتے ہیں۔ انہیں ہمارے دکھ کا اندازہ ہی نہیں ہے' ہم روز جیتے ہیں روز مرتے ہیں اور انہیں اپنے اللوں تللوں سے فرصت نہیں۔ یہ لوگ اپنے ضمیر پر ہی نہیں اس دھرتی پر بھی بوجھ ہیں۔''

فاضل مصنف نے مظلوم صحرائے تھر کا سفر مکمل کرنے کے بعد اپنے دل کا درد بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''میں نے تھر میں چند روز قیام کے دوران اپنے میز بانوں کے طفیل ڈیپلو' چھاچھرو' چھور اور ننگر پار کا طول و عرض چھان مارا ہے' مجھے پورے صحرائے تھر میں زندگی نام کی چیز کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے تو جہاں بھی قدم رکھا مصائب میں مبتلا اور موت کے خوف سے ہمکنار فضا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں جہاں بھی گیا اور جس سے بھی ملا ہوں ہر موڑ پر ایک نئی کہانی' ایک نیا زخم میرے انتظار میں تھا۔ مجھے اپنے رفقائے سفر کی کیفیت کا اندازہ نہیں ہے۔ میں اس مختصر عرصہ میں سرتاپا گھائل ہو گیا۔ مجھے ماروؤں سے دکھ سانجھا کر کے پتہ نہیں کیوں اچھا لگا ہے۔ میں نے جس تھری سے بات کی' اس کی داستان نے مجھے اپنا درد بھلا دیا اور ایک نئے کرب میں مبتلا کر دیا۔''

زیرِ نظر سفر نامہ ہر لحاظ سے تھر پر ایک جامع کتاب ہے۔ صحرائے تھر پر اردو میں زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ سعید خاور صاحب نے تھر کے مختلف ذائقوں کو یکجا کر کے وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ اس میں محض سیر و تفریح نہیں' مسائل کی نشاندہی بھی ہے تو ان کے حل کیلئے مفید تجاویز بھی ہیں۔ وہ کراچی سے سرحدی شہر ننگر پار کر تک جہاں سے بھی گزرتے ہیں راہ میں آنے والی ہر یادگار' ہر لمحہ اپنے قاری کی نذر کر دیتے ہیں۔ ان کا زبان و بیان کا انداز بھی بے حد دلچسپ اور دلکش ہے۔ جناب سعید خاور کہیں مکالمہ آرائی کے ذریعے جادو جگاتے ہیں تو کبھی تصوراتی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں کئی ذائقے دیئے ہیں۔ کہیں یہ کتاب سفر نامہ ہے تو کہیں ناول اور کہیں افسانہ تو کہیں تاریخ لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی موقع پر اپنے قاری کو خود سے دور نہیں ہونے دیا' یہی ان کی قلم کاری کا اہم وصف ہے۔'

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے قاری خود خاور صاحب کے ساتھ شریکِ سفر ہے اور ہر منظر اور ہر کیفیت وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اس دلچسپ اور اہم کتاب لکھنے پر میں انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں: اللہ کرے زورِ قلم اور

زیادہ.....اورسرائیکی کےعظیم شاعرحضرت خواجہ غلام فرید کاایک بندان کی نذرکرتاہوں:

پیکر فریدی جام توں
تھی رند مست مدام توں
ڈینھو ڈینہہ ودھا رکھ گام توں
واہ واہ کرے ساری خلق

ڈاکٹرنوازعلی شوق
شاہ لطیف چیئر' جامعہ کراچی
بدھ ۷ مئی ۲۰۰۹ء



لطیف کا سارنگ

وادی سندھ کی تہذیب کی دو ہمسایہ اور قدیم زبانیں، سندھی اور سرائیکی، ایک ایسے خطے میں پھلی پھولی ہیں جس کے سینے پر عظیم سندھو بہتا ہے جس کی موجیں یہاں زندگی کی ضمانت ہیں لیکن سندھو سے دور مگر سندھ وادی سے جڑا ہوا عظیم صحرا راجستھان ہے جس کا ایک حصہ سندھ میں ہے جو تھر کہلاتا ہے اور ایک حصہ سرائیکی وسیب کی سابق ریاست بہاولپور میں ہے جو مجموعی طور پر چولستان کے نام سے مشہور ہے اور اس کا ایک نسبتاً آباد حصہ روہی کہلاتا ہے۔ باقی صحرا تقسیم کے بعد ہندوستان میں شامل ہو گیا۔ یہ صحرا جو کبھی سمندر تھا اور کبھی اس پر ہاکڑا، گھاگھرا یا سرسوتی کے ناموں سے معروف دریا بہتا تھا جسے ویدوں میں علم و دانش کی دیوی کہا گیا ہے۔ اسی دریا کے نام سے موسوم ''ہاکڑا تہذیب'' ہے جہاں موئن جو دڑو اور ہڑپا کے عین درمیان میں ایک شہر خموشاں ''گنویری آلا'' کے آثار مدفون ہیں جو ہڑپا سے کچھ بڑا اور موئن جو دڑو سے کچھ چھوٹا ہے۔ اسی ہاکڑا تہذیب کی گم گشتہ اور مدفون بستیوں کے امین صحرائے چولستان کے کنارے پر آباد ایک بستی ''محراب والا'' ہے جو سرائیکی ادب کے کئی درخشندہ ستاروں کی جنم بھومی ہے۔ تاریخی قلعہ ڈراور اور صادق گڑھ پیلس کے عباسی حکمرانوں سے جڑی ہوئی بلوچوں کی اس بستی میں ایک ایسا بیدار بخت بھی پیدا ہوا جس نے اپنے صحرا کی لاج رکھنے کے لئے جلتی ریت کے بجائے آگ برساتے شہروں کی آبلہ پائی کی اور واپس اپنے صحرا کو لوٹ آیا۔ محراب والا میں پیدا ہونے والا سعید خاور کئی نانوں میں بٹا ہوا ایک چھتا بناتا ہے اور اس میں زندگی کا رس انڈیل دیتا ہے۔ روہی کے لانے،

پھوگ، کرینہہ، کنڈے، کرڑا، رکترن کی عصر بیز خوشبوؤں میں پروان چڑھنے والے سعید خاور نے چاروں اور گھوم کر لاہور، کوئٹہ، ملتان، کراچی اور نہ جانے کہاں کہاں کی آبلہ پائی کے بعد سمندر کی وسعتوں کا اسیر ہو کر کراچی کو اپنا مستقر بنایا۔

کون جی کو لگائے عشق کا روگ
کون پانی پیئے سمندر کا

مگر سعید خاور نے اس کھارے پانی اور سمندر کی ریت میں سے بھی تھر اور روہی کی ریت اور پانی کے ذائقے دریافت کر لئے۔

سندھ وادی کی دونوں ہمسایہ زبانوں کے دو قومی شاعروں شاہ لطیف اور خواجہ فرید کی سندھی سرائیکی شاعری کے موضوعات کا غالب حصہ اسی صحرائے تھر اور چولستان کی زندگی سے گندھا ہوا ہے جسے سعید خاور نے بارِ دگر لطیف اور فرید کی آنکھ سے دیکھا مگر صدیوں کے فاصلے نے جس تھر کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اس سے لطیف کا سُر سارنگ اور فرید کا ساون روٹھ چکا ہے۔ صحرائی راجپوتنیوں کے کاجل سے سرمئی ہونے والے صحرائی تالاب یا ٹوبھے خشک ہو چکے ہیں۔ گایوں، بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کے قطار اندر قطار گلے قحط اور موت کے رقص کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ کترن کی خوشبو چرانے والوں کے کالے ٹائر اور کالی سڑکیں صحرا کی نرم ریت پر خراشیں ڈال کر لوٹ مار کی ایک نئی ثقافت کی بنیادیں رکھ رہے ہیں۔

سعید خاور کی آنکھ منظر سے پس منظر تک آگاہی کے نئے در وا کرتی ہوئی ایک کتاب ترتیب دیتی رہی جو ہمارے روبرو ہے۔ عمر ماروی، مومل رانو، سسی پنوں، ڈھولا مارو اور کئی لوک داستانوں کو جنم دینے والا یہ عشق آفریں خطہ پھر کسی عاشق کی تلاش میں ہے اور خاور ایک عاشق کی آنکھ سے اسے دیکھ رہا ہے مگر سسی قبر میں اتر چکی ہے اور اس کے آنچل کا پلو کسی ہوس ناک نگاہ کی آگ سے بچنے کی کوشش کی گواہی دے رہا ہے۔ ماروی آج بھی عمر کی قید میں ہے مگر آج کا عمر ماروی کی حب الوطنی اور ماروؤں سے محبت کا احترام کرنے والا عمر نہیں بلکہ اسے کسی بم دھماکے میں اڑا دینے والا عمر ہے۔ خاور صدیوں کی دہلیز پر کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ روپلو کولہی سے مسکین جہان خان کھوسو تک اور اکبر سے اربابوں تک، ایک نظر میں وقت کے فاصلے کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں سمیٹ لیتا ہے۔ زندانوں کے در کھولنے کے خواب لئے اس کی آنکھیں زندگی اور روشنی

کی طرف لپکتی نظر آتی ہیں۔

یہ کتاب خالی خولی خواب نگر نہیں بلکہ حقیقتوں کے جہان سے بھی آشنائی کے سفر پر اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔تھر پر مختلف زبانوں میں بہت کچھ لکھا اور بولا جا چکا ہے۔اس کی زندگی ڈراموں ' دستاویزی فلموں اور مختلف نظری بصری وسیلوں سے لوگوں پر آشکار کی جا چکی ہے۔یہ کتاب تھر کا واحد حوالہ نہیں مگر ایک اہم حوالہ ضرور بن سکتی ہے۔سعید خاور مبارک ہو تم لطیف کے تھر پر سُر سارنگ بن کر اترنا چاہتے ہو۔

جاوید چانڈیو
جمعرات ۳۰ر اپریل ۲۰۰۹
کراچی



در مدح دوست

داستان گوئی عہد قدیم سے چلی آ رہی ہے لیکن اس پر قدرت شاذ ہی نصیب ہوتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہر طالب علم کرتا ہے اور گفتگو کا ڈھنگ جاننے والوں کی بھی کسی عہد میں کمی نہیں رہی لیکن اچھی کہانی کی بنت عطیہ خداوندی ہے اچھے لحن کی طرح۔

ہمہ دم سرگرم اور مضطرب' ان معنوں میں کہ زندگی کے جھمیلوں میں سے وقت نکالنا اور اس کا خوب صورت استعمال کوئی سعید خاور سے سیکھے۔ ۱۱ برس ہوئے انہوں نے سردار شیر باز مزاری کا زندگی نامہ لکھا تھا' ایک صداقت شعار مگر دل کش و دلآ ویز شخص کی سرگزشت جو مصلحت اور منافقت پر یقین نہیں رکھتا ' اب ایک دہائی بعد انہوں نے صحرائے تھر کے بے کس اور بے بس لوگوں کو موضوع بنایا ہے۔

یادش بخیر۔ تھر' اڑتی ریت' ناچتے موروں' نایاب جنگلی حیات' ہر سو پھیلی خموشی یا پھر پانی کی تلاش میں بیراجی علاقے کی سمت نقل مکانی کرنے والے ماروؤں کا ہی نہیں دھرتی سے محبت کی علامت ماروی' ظلم و استبداد کے پیکر عمر سومرو' غریبوں کے ہم نوا مسکین جہاں خان کھوسو اور اپنے حق کیلئے جان دے دینے والی مائی بختاور کا بھی دوسرا نام ہے ان ہی شخصیات و واقعات اور مقامات میں سعید خاور نے اپنائیت محسوس کی تو ان کا سفر رائیگاں نہ گیا اور وہ دوران مسافت حال سے ماضی میں جست لگا کر اپنے پڑھنے والوں کیلئے کچھ نیا پن لے آئے چونکہ یاسیت پسندی انہیں چھو کر بھی نہیں گزری اور رجائیت پر وہ یقین رکھتے ہیں اس لئے ان صفحات پر تھر کا نوحہ یا مرثیہ

نہیں۔اس خطے کی خوشحالی' ترقی اور بہتری کے خواب جا بجا بکھرے نظر آئیں گے۔تاریخ کے تمام کرداروں نے انہیں اپنے عہد کے بہت سے بھید بھاؤ بتائے ہیں اور وہ سخن ہائے گفتنی جو بقول شاعر خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ جاتے ہیں' وہ ان کی زبان سے نہ صرف سامنے آئے بلکہ اچھے بھی لگے ہیں۔

پڑھنے والے میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ تھر کا یہ سفر ہنوز مکمل نہیں ہوا کہ اپنی رفیقِ راہ ٹائم مشین کے ذریعے انہیں ایک جست مستقبل میں بھی لگانی چاہئے کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کے بعد بلیک گولڈ کی یافت' ڈیموں کی تعمیر' علم کی روشنی اور معدنیات کے وسائل سے استفادہ کے نتیجے میں یہاں کی زندگی کیسی لگے گی؟ فیض کے الفاظ میں ''فروغ گلشن وصوت ہزار کا موسم'' بلاشبہ ہم نہیں ہماری اگلی پیڑھی دیکھے گی لیکن کچلے اور پسے ہوئے طبقات کی سربلندی وسرفرازی کے خواب دیکھنا بھی تو کسی کسی کا مقدر بنتا ہے۔

ہر اچھی تحریر قاری کو تشنہ رکھتی ہے۔اس سفرنامے کا مطالعہ بھی یہ احساس سوا کر دے گا لیکن اسے کم مت جانئے کہ ریت کے بگولوں' ویران قلعوں اور اجاڑ راستوں میں بکھرے قصوں کو زبان و بیان کا حسن اور داستان کا روپ مل گیا ہے۔اچھے لحن کی طرح کہ یہ عطیہ خداوندی ہے اور ستارے و لکیریں مہربان ہوں تو ہی اچھی کہانی کی بنت کسی کسی کا مقدر بنتی ہے۔

الطاف مجاہد

یکم جون ۲۰۰۹ء



''موٹروے'' کا سفر

گاڑی سہراب گوٹھ کی ہنگامہ خیزیوں اور چھوٹی بڑی گاڑیوں کے ناروا دباؤ سے آزاد ہوئی تو ڈرائیور نے داد طلب نگاہ میرے وجود پر دوڑائی اور ایکسلیٹر پر پاؤں کا زور بڑھا دیا۔ میری جان میں جان آ گئی۔ کراچی کے ہولناک ٹریفک سے یوں صاف بچ نکلنا معجزے سے کم نہیں ہوتا۔ مائی کلاچی کے شہر کراچی میں ایسے معجزے کبھی کبھار ہی رونما ہوتے ہیں ورنہ شہریوں کے دن کا غالب حصہ رینگتے' چنگھاڑتے ٹریفک کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ گاڑیوں کے رش ' دھوئیں اور شور نے کراچی کے شہریوں کی زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ میرے کچھ دوست اسے شہر کی گہما گہمی قرار دیتے ہیں مگر میں ہمیشہ ان سے اختلاف کرتا ہوں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ گہما گہمی نہیں 'شہر پر منڈلاتا ہوا عفریت ہے جس کے سائے آئے دن گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی ہولناکیوں نے شہریوں کی زندگی کی طبیعات بدل دی ہے۔ ماحولیاتی اور صوتی آلودگی نے ایک محتاط اندازے کے مطابق کراچی کے ۴۰ فیصد لوگوں کو مختلف نفسیاتی امراض میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج یوں رش سے صاف بچ نکلنے پر میں نے سکھ کا سانس لیا اور ڈرائیور سے پوچھا:

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''افضل۔'' اس کا جواب فتح کے نشے میں لڑکھڑا رہا تھا۔

اسے خوش فہمی ہوگئی کہ میں اس کی فنکاری سے مرعوب ہو گیا ہوں۔ میرا مسئلہ کچھ اور ہے۔ میں عام طور پر تیز رفتار گاڑیوں میں سفر کرنے سے گریز کرتا ہوں اور خاص طور پر اگلی نشستوں پر

بیٹھ کر سفر کرنے سے تو میری جان جاتی ہے۔ میرا ایسا ہر سفر لمبی خاموشی ' وسوسوں اور وحشت میں گزرتا ہے۔ ایسے مواقع پر خدا اور میرے درمیان فاصلوں کی تمام فصیلیں دھڑام سے گر جاتی ہیں اور میں ورد شروع کر دیتا ہوں۔ ایسے میں جو مجھے یاد آتا ہے پڑھ ڈالتا ہوں۔ مجھے افضل جیسے ''فنکاروں'' کی ''فنکاری'' سے بے حد خوف آتا ہے لیکن آج میرے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ ''یاروں'' نے میرے بے حد انکار کے باوجود مجھے جبراًوین کی اگلی نشست پر ڈرائیور کے پہلو میں بٹھا دیا ہے۔ پتہ نہیں یہ میری عزت افزائی ہے یا مجھے سُولی پر لٹکایا جا رہا ہے! میں پہلے بتا چکا ہوں کہ عام طور پر ایسا سفر میرے لئے کسی طرح بھی مستقل اذیّت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ آج افضل سے میری اپنے مزاج کے برعکس گفتگو بھی اسی خوف سے نجات پانے کی ایک کوشش ہے۔

''تم پہلے بھی کبھی تھر گئے ہو یا پہلی بار جا رہے ہو؟'' میں نے خوامخواہ بات بناتے ہوئے افضل سے دوستانہ انداز میں استفسار کیا۔

''عمر کوٹ تک تو گیا ہوں' آگے جانے کا موقع پہلی بار مل رہا ہے۔ بہت پہلے ایک بار غیر ملکیوں کو لے کر گیا تھا وہاں' قلعہ دکھانے۔'' اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے اس نے میری طرف سے دوستی کی پیشکش قبول کر لی ہے۔'' میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے دل میں سوچا۔

''میں پہلی بار جا رہا ہوں وہاں' لیکن تم زیادہ خوش قسمت ہو کہ مجھ سے پہلے تاریخی قلعہ عمر کوٹ دیکھ لیا۔'' میں نے اسے اس کی برتری یاد دلائی تو وہ نہال ہو گیا اور مجھ سے پوچھا:

''آپ کا نام.....؟''

''خاور..... سعید خاور'' میں نے جواب دیا۔

''آپ کیا کرتے ہو؟'' اس کے لہجے میں مکمل اپنائیت تھی اور وہ گپ شپ جاری رکھنے پر آمادہ دکھائی دے رہا تھا۔ میں جان گیا کہ ڈرائیور کو ہمارے میزبانوں نے ہم مہمانوں اور ہمارے سفر کے حوالے سے کوئی پیشگی جانکاری نہیں دی۔ اسے صرف اتنا پتہ ہے کہ ہم تھر جا رہے ہیں۔ ہم کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟ اسے نہیں معلوم۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا جائے۔

''یار میں صحافی ہوں..... بلکہ یہ سب صحافی ہیں۔ ہمارا تعلق کراچی کے مختلف اخبارات

سے ہے اور ہم تھر میں پڑنے والی قحط سالی کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔'' میں نے پچھلی نشستوں میں اونگھتے اپنے ساتھیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تعارف کے ساتھ ساتھ صحرائے تھر کے سفر کا سبب بھی بیان کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ افضل کو میرے صحافی ہونے پر خوش گوار حیرت ہوئی ہے کیونکہ اس کے چہرے پر ہلکی طمانیت سی پھیل گئی تھی۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''کون سے اخبار میں ہیں آپ؟'' اس کے سوال اور لہجے میں اخبار والوں کے لئے کسی قدر انسیت کا جذبہ موجود تھا۔

''میں نوائے وقت میں ہوں۔'' میں نے اسے بتایا۔ اسی اثنا میں سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار کار نے بڑے بُرے طریقے سے دیو ہیکل ٹرالر کو اوورٹیک کیا اور بال بال حادثے سے بچی۔ افضل پر کیا بیتی ہوگی' مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے مگر میرے اوسان خطا ہو گئے ہیں۔ اس نے منہ بھر کے کار والے کو مغلظات بکیں۔

''حرام زادہ..... اندھے ہو کر چلاتے ہیں سالے.....''

مجھے اگلی نشست پر بیٹھنے کا اعزاز مہنگا پڑ رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ہولناک حادثہ رونما ہوتے ہوتے رہ گیا' لیکن ماحول ذرا سا ناخوشگوار ہو گیا اور کچھ دیر کے لئے ہماری گفتگو کا سلسلہ بھی تھم گیا۔ میں نے خود کو اس خوفناک منظر سے گھسیٹ کر ماضی کے خوشگوار جھروکوں میں دھکیل دیا۔ میرے دماغ میں ریت اور روشنی کا طوفان امڈ آیا۔

صحرا میرے لئے اجنبی نہیں ہے۔ میں خود دنیا کے چوتھے بڑے صحرا چولستان میں پیدا ہوا۔ چولستان کو مقامی لوگ ''روہی'' سے موسوم کرتے ہیں۔ میرا بچپن اور لڑکپن اسی وسیع ریتیلے صحرا کی گود میں پروان چڑھا۔ میں نے اپنی پہلی تحریر روہی کی ریت پر رقم کی اور یہیں کاغذ اور قلم سے دوستی کا آغاز کیا۔ میں نے صحرائے چولستان کی سلگتی ریت پر رقص کرتی ہوا سے گویائی کی وہ قوت حاصل کی جس نے میری عملی زندگی میں مجھے ہزاروں لاکھوں لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ دیا۔ روہی کی لُو نے میرے تن بدن میں ایک آتش بھڑکا دی۔ میری زندگی کا ابتدائی خطیب اور مخاطب روہی ہی تھی جہاں میں گھنٹوں روہی کی روح سے ہم کلام ہوتا اور اس سے راز و نیاز کرتا رہتا۔ روہی کے بدن پر سرسراتی ریت' اداس ٹیلے' سنسناتے سناٹے' بے

لباس درخت اور ڈھلتی شام کے دُھندلکے میری خلوتوں کے امین اور میری جلوتوں کے مستقل رفیق اور راز دار تھے۔ ریت راہوں پر سفر کرنے والے کاروانوں میں شریک شتر بانوں اور حدی خوانوں کے دہن سے پھوٹنے والے یہ دل گداز چولستانی نغمے اور فریدی کافیاں ہی تھیں جنہوں نے مجھے لفظوں اور آواز کی جادوگری سے آشنا کیا۔

روہی 'ماں کے بعد میری اگلی پناہ گاہ تھی جس نے ماں کی طرح مجھے گود لے کر لوریاں سنائیں اور پروان چڑھایا۔ بھوک' پیاس اور افلاس' چولستان اور تھر ایک ہی نصیب لے کر وجود میں آئے ہیں' یہ آگہی مجھے اسکول کے دنوں ہی میں مل گئی تھی۔ میرے بابا بھی سچے روہیلے (چولستانی) تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی لگ بھگ نصف صدی انہی ریت رستوں میں شکار اور پیار میں گم کر دی۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے بے آب وگیاہ چولستان کی سرزمین سے غیر مشروط وفاداری کا درس دیتے اور اس کے رسیلے نغموں کا رس میرے کانوں میں گھولتے رہتے تھے۔ اُن گیتوں کی نغمگی آج بھی میرے دل و دماغ میں رچی بسی ہے۔ پہلی بار انہوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ سندھ کے دامن میں چولستان کی سرحد کے ساتھ ایک اور صحرا ''تھر'' جڑا ہوا ہے جو اس سے بھی زیادہ وسیع وعریض اور دل فریب ہے۔ وہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے رہتے ہیں۔ بابا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ چنوروں اور بھنوروں کی اس سرزمین پر دن رات مور ناچتے ہیں اور وہاں کے لوگ بھوک اور پیاس کے باوجود اپنی دھرتی سے بے پناہ پیار کرتے ہیں اور اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بابا سے کہا تھا:

''بابا! پیاس اور افلاس کے باوجود میں بھی اپنی روہی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔'' بابا میری بات سے بہت خوش ہوئے تھے اور مجھے اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔ روہی کی روح میں رچے ان کے مضبوط ہاتھوں کا لمس میں آج تک اپنے بدن پر محسوس کرتا ہوں۔ زمانہ طالب علمی میں ہمیشہ میرا یہ خواب رہا کہ میں اپنی جنم بھومی روہی کی زندگی سپرد قلم کر کے اس کے سارے رنگ دنیا پر بکھیر دوں مگر میری ''مجبوری'' گریجوکشن کے بعد مجھے پاکستان کے اقتصادی دارالحکومت کراچی کھینچ لائی۔ کراچی میں اپنی دریافت کی ایک نئی دُھن نے مجھے اپنے اس خواب سے بہت دور کر دیا اور میرا یہ خواب کسی حد تک میرے لئے اجنبی سا ہو گیا۔ مگر جب بھی مجھے میرا وہ بے تعبیر خواب اپنی یاد دلاتا ہے تو میں روح تک کانپ جاتا ہوں۔ اپنی جنم بھومی روہی اور روہیلوں کا یہ

قرض اب بھی اپنے وجود پر جھیل رہا ہوں۔میری خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے یہ گراں مایہ قرض چکانے کا وسیلہ فراہم کردے۔

دسمبر ۱۹۸۷ء میں نوائے وقت گروپ میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد میرے اندر یہ خواہش جاگی کہ میں دنیا کے تیسرے بڑے صحرا' حیرتوں اور غیرتوں کی سرزمین' موروں کے مسکن ''صحرائے تھر'' کا تفصیلی سفر کرکے وہاں وہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھوں جو میرے بابا نے میرے بچپن میں میری آنکھوں میں بسا دیئے تھے اور ان حالات کا بھی جائزہ لوں جن کی وجہ سے تھر کے ''مارو'' اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور کوئی بھی ان کا پرسان حال نہیں۔ اخبارات ہر سال تھر میں پیاس اور افلاس کے ہاتھوں سیکڑوں ہلاکتوں کی خبریں اور تصویریں اپنے کالموں کی زینت بناتے رہتے ہیں مگر میں چاہتا تھا کہ میں زندگی اور موت کے اس بھیانک منظر کا براہ راست مشاہدہ کروں۔ میں یہ دریافت کروں کہ وہ کیا راز ہے جو تھریوں کو خشک سالی اور قحط کے باوجود وطن چھوڑنے سے روکے رکھتا ہے۔

میں اس راز کی کھوج ہی میں سندھ کے صوبائی دارالحکومت کراچی سے سوا چھ سو کلومیٹر دور سندھ کے جنوب مشرق میں ۲۱ ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلے ماروؤں کے دیس تھر کا دکھ جاننے اور تھریوں کو دلاسہ دینے کے لئے ایک تھکا دینے والے طویل سفر پر نکلا ہوں۔ ان دشوار گزار مسافتوں میں میرے کچھ دوست اخبار نویس بھی شریکِ سفر ہیں۔ایک ہفتے پر محیط اس سفر کا موقع ہمیں ایک سیاسی جماعت نے فراہم کیا ہے جو بھوکے اور پیاسے ماروؤں میں نصف نرخ پر پانچ روپے فی کلو آٹے کے کئی ٹرک تقسیم کرے گی اور تھر کے مختلف علاقوں میں اپنی مدد آپ کے تحت دو درجن سے زائد کنوئیں کھود کر دے گی۔ چند کنوئیں کھودنے اور آٹے کے چند ٹرک تقسیم کرنے سے ہزاروں کلومیٹر رقبے پر پھیلے تھر میں پڑنے والے قحط پر قابو پانے میں کس حد تک مدد ملے گی' اس سے قطع نظر ایک چولستانی کو تھری بھائیوں سے دکھ بانٹنے کا موقع ملا ہے تو اس سے بڑی سعادت اس کے لئے کیا ہو سکتی ہے۔

''صاحب! آپ کو نیند آ گئی؟''

''نہیں یار..... بس ذرا سوچوں میں کھو گیا تھا۔'' افضل کی مداخلت پر میں خیالوں کی دنیا سے پلٹ آیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔

''کیا سوچ رہے تھے آپ؟''

''میں سوچ رہا تھا کہ یہ جو تھری ہیں' یہ بڑے سخت جان ہیں۔ آندھی ہو طوفان ہو' پیاس ہو یا افلاس' یہ لوگ گھر نہیں چھوڑتے' انہیں اپنے وطن سے بہت لگاؤ ہے۔''

''وطن وطن ہوتا ہے صاحب! گھر کون چھوڑتا ہے؟''

''مگر یار ہم تو گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں' روزی روٹی کے چکر میں اپنے آپ کو بھی کھو دیا ہے۔ واپس جاتے ہیں تو اپنے ہی گھر میں اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔''

''آپ کی اپنی دھرتی سے محبت کمزور پڑ گئی ہے' لگتا ہے آپ کا اپنے اوپر بھروسہ ڈانواں ڈول ہو گیا ہے۔''

افضل کے جملے مجھ پر بجلی بن کر گرے۔ کہہ تو یہ صحیح رہا ہے۔ میں نے سوچا۔ میں خود کو اچانک ہیچ سمجھنے لگا۔ کراچی آ کر واقعتاً میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کے وصف سے محروم ہو گیا ہوں۔ بڑے لوگ تو پل بھر میں کیا سے کیا ہو جاتے ہیں' انہیں کوئی کچھ کہنے والا نہیں ہوتا' یہ خود کو اپنے ضمیر کے سامنے بھی جوابدہ نہیں سمجھتے۔ متوسط طبقے کے لوگوں کا یہ جرم نا قابلِ معافی ہوتا ہے۔ مگر میرا یہ نیا ہزارے وال دوست افضل' خود بھی تو دورنگی کا شکار ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بتا رہا تھا کہ ۲۰ سال پہلے ماہیوں اور ڈھولوں کی سرزمین مانسہرہ سے کراچی آیا تھا' یہیں شادی کر کے بیوی کو پیارا ہو گیا' پلٹ کر اپنے پیاروں کی خبر ہی نہیں لی۔ ایک میں یا افضل ہی نہیں' کراچی کے جھمگٹوں میں لاکھوں کھو گئے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا المیہ ہے' ہر ایک کی اپنی کہانی ہے۔ ہر کسی کے پاؤں میں کراچی نے بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

میرے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ ہے مگر میں کسی نئی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ افضل باتونی ہے' پھر کوئی نئی بات لے آئے گا اور میں خوامخواہ ایک اور یاسیت میں گھر جاؤں گا۔ اس وقت تو میری نظروں میں بھوک اور افلاس میں گھرے چولستان کی مانند صحرائے تھر کے دردناک منظر گردش کر رہے ہیں جس سے عرصہ ہوا برکھا دیوی روٹھ گئی ہے اور خشک سالی نے وہاں اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ تھر میں کئی مہینوں سے جاری موت کے اس رقص نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے لیکن صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ حکمران بے سہارا ماروؤں اور ان کے معاشی وسیلوں مویشیوں کو بچانے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ قدرت اور

حکومت نے پیاس اور افلاس کے اس صحرا سے منہ موڑ لیا ہے۔ کچھ این جی اوز اور سیاسی' سماجی ادارے انفرادی سطح پر تھر میں زندگی کو بچانے کے لئے کوششیں بروئے کار لا رہے ہیں لیکن ان میں سے کئی ایک کا کردار سوالیہ نشان ہے۔ میں ایسی کئی تنظیموں اور اداروں کو جانتا ہوں جو امداد کی رقم سے زیادہ روپے خبروں اور تصویروں کی نمائش پر خرچ کر دیتے ہیں۔ وہ اس سستی شہرت کی بیساکھیوں پر کھڑے ہو کر بلند قامت نظر آنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان کا خیال آتے ہی میں کھولنے لگا اور میں نے من ہی من میں انہیں خوب سنائیں۔

کراچی حیدرآباد روڈ سپر ہائی وے جسے میاں نواز شریف نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں موٹر وے کے نام کا طوق پہنا دیا تھا اور سہراب گوٹھ پر اپنے نام کی دیو قامت تختی بھی آویزاں کر دی تھی۔ یہ کئی سال گزرنے کے باوجود موٹر وے کا استحقاق حاصل نہیں کر سکی۔ گو اس کی نگرانی نیشنل ہائی وے اتھارٹی اور موٹر وے پولیس کے حوالے کر دی گئی ہے جو ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر جرمانے عائد کرتی اور ٹول ٹیکس وصول کرتی ہیں مگر اس کی تعمیر و ترقی کا وہی حال ہے جو عام طور پر پاکستان میں عام شاہ راہوں کا ہوتا ہے۔ جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ اور گڑھے اس کے موٹر وے ہونے کے نام پر دھبہ دکھائی دیتے ہیں۔ فرق پڑا ہے تو صرف اتنا کہ پہلے اس کا ٹیکس سندھ حکومت کی تجوری میں جاتا تھا اور اب یہ وفاقی حکومت اینٹھ رہی ہے۔ نام بدلنے سے چیزوں کی ہیت یا ماہیت نہیں بدل جاتی' سپر ہائی وے موٹر وے ہو گئی ہے لیکن اس کی حالت ذرا نہیں بدلی۔ اسے چھوڑیئے کہ یہ کس حال میں ہے' اس کے اطراف کے مناظر ہیں بہت خوبصورت۔ آپ جس طرف نگاہ دوڑائیں دلکش منظر آپ کی آنکھوں میں بس جائیں گے۔

ہم نوری آباد سے گزرے تو اس کی زبوں حالی دیکھ کر بھی مجھے ملال ہوا۔ حکومت سندھ نے اسے قائم کرتے ہوئے بلند بانگ دعوے کئے تھے اور کہا تھا کہ یہ صنعتی منصوبہ صوبے کی تقدیر بدل کے رکھ دے گا۔ ربع صدی بعد اب اس کی عملی تصویر سب کا منہ چڑا رہی ہے۔ کراچی سے ۸۰ کلومیٹر دور سپر ہائی وے پر دیہہ کالو کہار میں نوری آباد کے مقام پر حکومت سندھ نے اسّی کی دہائی میں ۱۶ ہزار ۶ سو ۱۴۹ ایکڑ اراضی مختص کر کے اس منصوبے کا آغاز کیا تھا۔ اس میں سے ۶ ہزار ایکڑ ابتدائی دو مرحلوں میں' ۳ ہزار ایکڑ اکتوبر ۱۹۸۳ء تک اور مزید ۳ ہزار ایکڑ اراضی ستمبر ۲۰۰۴ء میں سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ لمیٹڈ کے حوالے کی گئی۔

حکومت سندھ کی جانب سے عطا کردہ اس زمین کو ایک ہزار ۵۷ صنعتی پلاٹوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے صرف ۷۷ پلاٹوں پر اس وقت پیداواری عمل جاری ہے۔ ۱۲ کارخانے زیرِ تعمیر ہیں' دو تعمیر ہو کر بند بھی ہو چکے ہیں۔ بیمار اکائیوں کی تعداد ۳۴ ہے جب کہ ۹۵۰ پلاٹ ابھی تک خالی پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں زمین کی فراہمی کے علاوہ محدود پیمانے پر سڑکوں ' فراہمی آب' نکاسی آب اور اسٹریٹ لائٹس کی سہولتیں بہم پہنچائی گئی تھیں مگر اسپتال ' شاپنگ سینٹر ' اسکول' کالج' کینجھر جھیل سے فراہمی آب اور بس ٹرمینل کی تعمیر کے منصوبے تا دمِ تحریر کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ رہی سہی کسر ڈاکوؤں اور بھتہ خوروں نے پوری کر دی ہے۔

نوری آباد ایک کامیاب صنعتی قصبہ ثابت ہو سکتا تھا مگر ناقص حکومتی پالیسیوں' سرکاری عدم تعاون' سیاسی اقربا پروری' صنعت کاروں کی عدم دلچسپیوں ' بے اعتدالیوں' بنیادی سہولتوں کے فقدان 'ناروا ٹیکسوں کے اطلاق اور ڈاکو راج کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام بنا دیا گیا ہے۔ میں نے دیکھا نوری آباد کے چند کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگل رہی ہیں' بیشتر ویران پڑی ہیں۔ یہاں بیمار صنعتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ سندھ کو صنعتی انقلاب کی راہ پر گامزن کرنے کے حکومتی دعوے مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ بعض روایات میں ہے کہ نوری آباد سندھ کی شہرہ آفاق رومانی داستان ''نوری جام تماچی'' کے کردار مائی نوری سے منسوب ہے۔ نوری چاہت کی علامت اور اس کی اپنے ملاح قبیلے سے محبت سندھ کی ثقافت کا سنگھار ہے لیکن اس سے منسوب نوری آباد کا گلشن آباد ہونے سے پہلے ہی اجڑ گیا ہے۔

ہمیں راستے میں کئی جگہ موٹروے پولیس کی گاڑیاں دکھائی دیں۔ اہلکار جا بہ جا مقررہ رفتار اور ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی پر ٹرکوں اور ٹرالوں کے ڈرائیوروں کے چالان کرتے دکھائی دیئے۔ مجھے ذاتی تجربہ تو نہیں' سنا ہے انہیں عام پولیس والی لت ابھی تک نہیں پڑی۔ خدا کرے یہ سچ ہو لیکن پاکستان میں اس قسم کی خبر پر حیرت ہوتی ہے۔



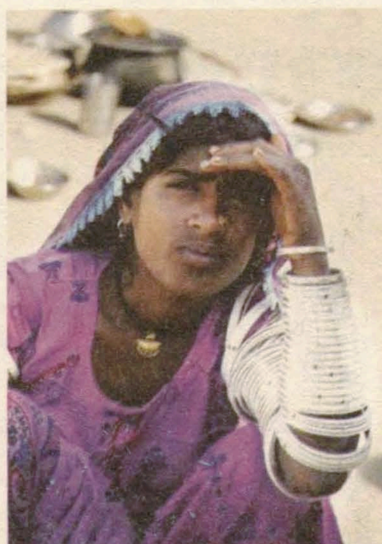
دریائے سندھ کا نوحہ

ہم سندھ کے دوسرے بڑے شہر حیدرآباد پہنچنے والے ہیں۔ جامشورو کے قریب دریائے سندھ کے پل پر سے گزرتے ہوئے مجھے یکبارگی غم کی ایک شدید لہر نے گھیر لیا۔ میں ۱۹۸۶ء سے سندھ میں ہوں اور میں نے اس کا چپہ چپہ دیکھا ہے۔ میں نے ان دو عشروں میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتے دیکھی ہیں۔ اس عرصے میں رونما ہونے والی تمام سماجی' سیاسی تفسیرات میری نظروں میں ایک ترتیب کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔ میں ایم کیو ایم کی اٹھان کا چشم دید گواہ ہوں۔ سندھ کی سیاست میں یہ ایک اہم موڑ تھا۔ ضیا آمریت میں دیہی سندھ میں پیپلز پارٹی اور شہری سندھ میں موثر۔ یاسی قوت جمعیت علمائے پاکستان کو دیوار سے لگانے کے لئے ایک طرف آمرانہ ہتھکنڈے جاری تھے تو دوسری طرف سندھی قوم پرستوں کی بھی پیٹھ ٹھونکی جارہی تھی تاکہ حقیقی سیاسی قوتوں کو کمزور کر کے آمریت کو طول دیا جا سکے۔

مجھے اپنے عزیز دوست نذیر لغاری کے ہمراہ ۲۰ مئی ۱۹۸۸ء کو دریائے سندھ کے کنارے سائیں جی ایم سید کے گاؤں ''سن'' میں سندھ نیشنل الائنس کے تاسیسی اجلاس میں بھی ایک عام ناظر اور مبصر کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا۔ یہی وہ وقت تھا کہ جب سندھ میں قوم پرستی کی سیاست نے نئی کروٹ لی۔ ہر انتخاب میں عوام کے ہاتھوں مسترد کئے جانے والے سندھ کے قوم پرست نئی صف بندیوں کی کوششوں میں تھے۔ مجھے یہاں جی ایم سید' رسول بخش پلیجو' الٰہی بخش سومرو' محمود ہارون' مخدوم خلیق الزمان' شاہ محمد شاہ' غلام شاہ' عالم شاہ' عبدالواحد آریسر' قمر بھٹی'



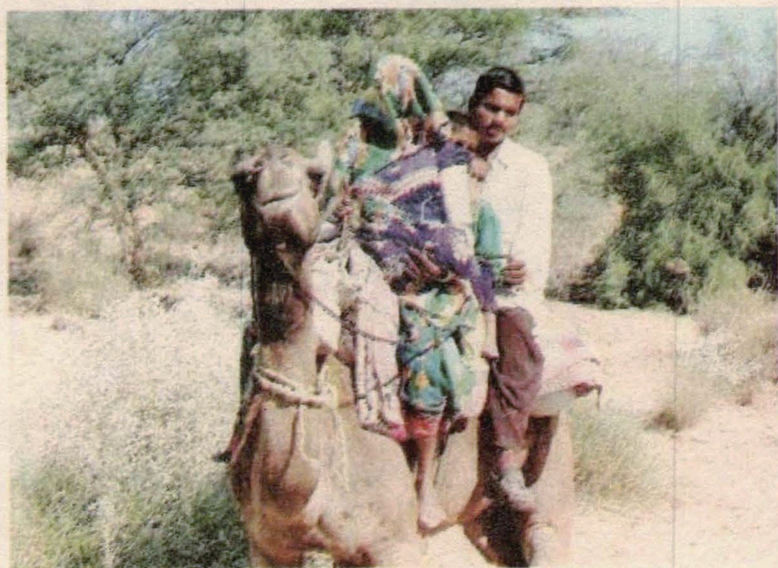
چنورہ تعمیر کے ابتدائی مراحل میں۔



ایک تھری دوشیزہ، شام ڈھلے جیون ساتھی کی منتظر۔



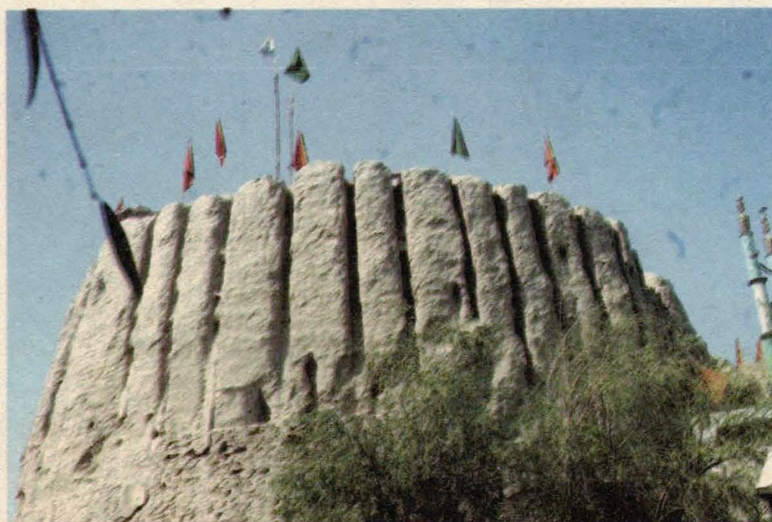
تھر کی مقبول عام سواری ''کیکڑا'' ریت رستوں میں محوِ سفر۔



تھر کا ایک خاندان اونٹ پر سوار جانب منزل رواں ہے۔



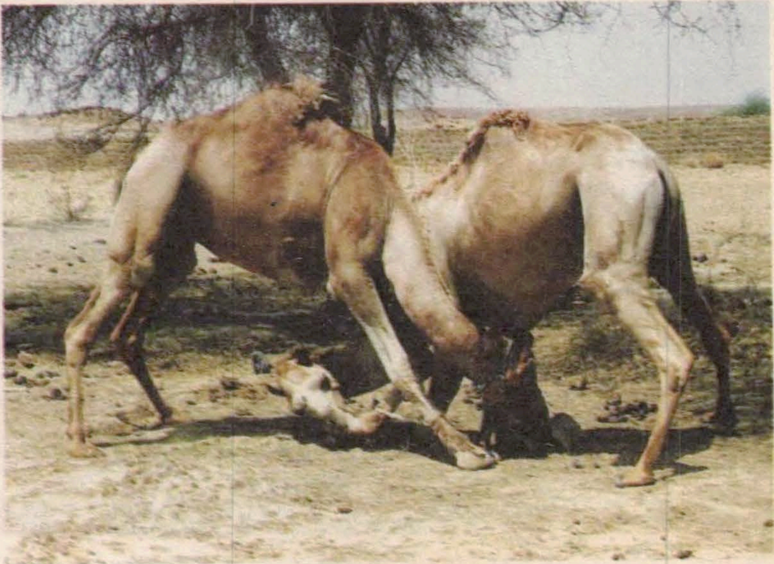
دریائے سندھ پر سکھر بیراج۔



حیدر آباد کا کچا قلعہ۔



محنت کش جوڑا ٹوکری بناتے ہوئے۔



دو ریگستانی جہازوں میں زور آزمائی کا منظر۔



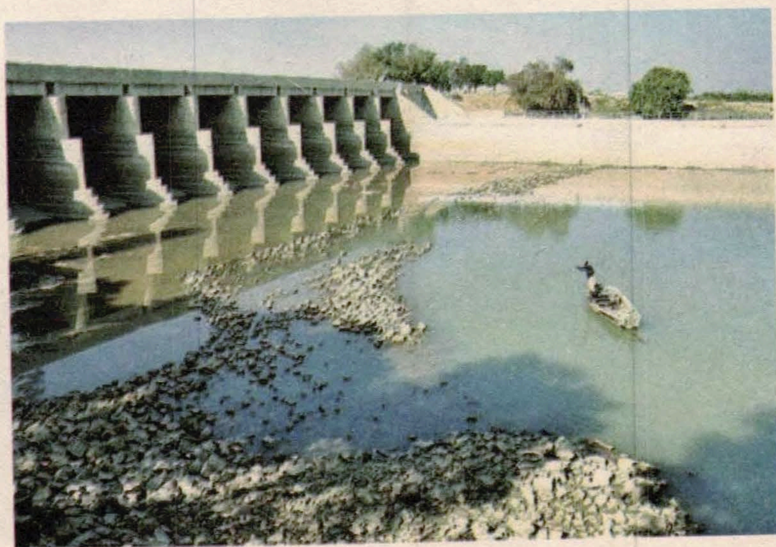
چنورے میں قائم ایک تھری اسکول۔



تھر میں ایک پاڑے کا منظر



دریائے سندھ، ہمالہ سے بحیرہ عرب تک کا سفر۔



کوٹری بیراج...... سندھو کی موجیں، موج صبا ہو گئیں۔



پروحشت سنجڑی روہی......اے دل دیوانی موہی۔



تپتے صحراؤں میں شتربانوں کا ایک قافلہ روئے منزل رواں دواں۔



آنکھوں میں سوال سجائے دو معصوم تھری بچے۔



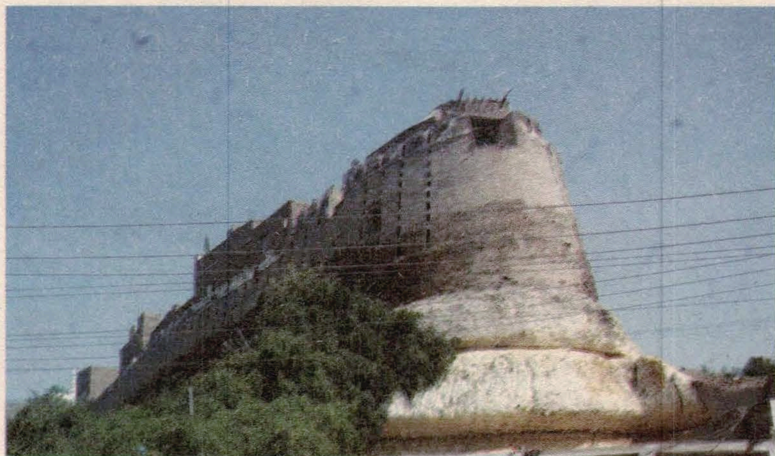
تھری خاتون بچہ گود میں لئے آنگن میں کھڑی ہے۔



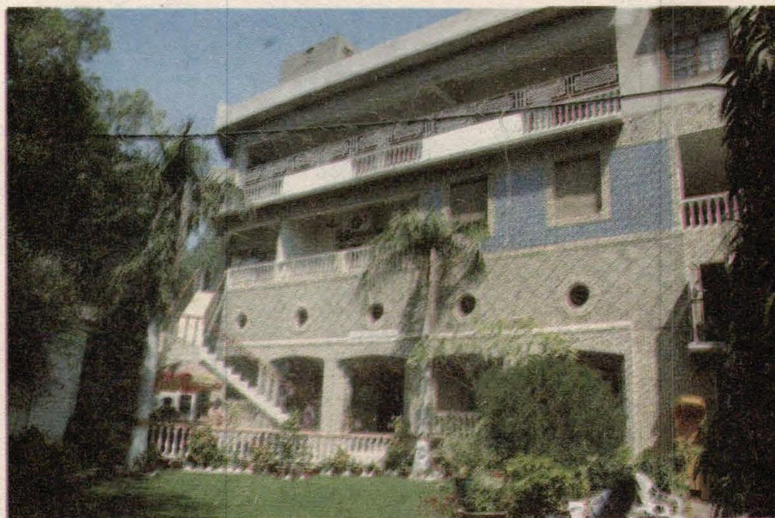
چنوروں میں جھلملاتی زندگی۔



پانی کی تلاش میں سرگرداں، برہنہ پا ماروِیاں۔



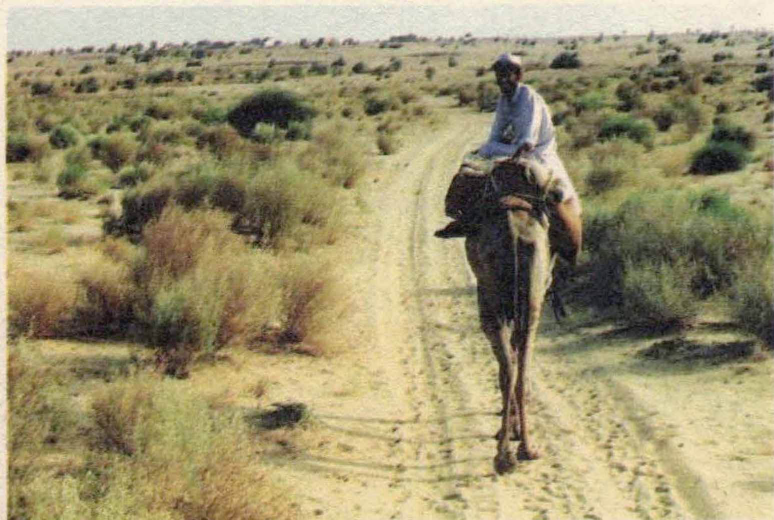
حیدر آباد کا پکا قلعہ، ماضی کی ایک عظیم یادگار۔



وادی مہران کا ہائیڈ پارک، حیدر آباد پریس کلب



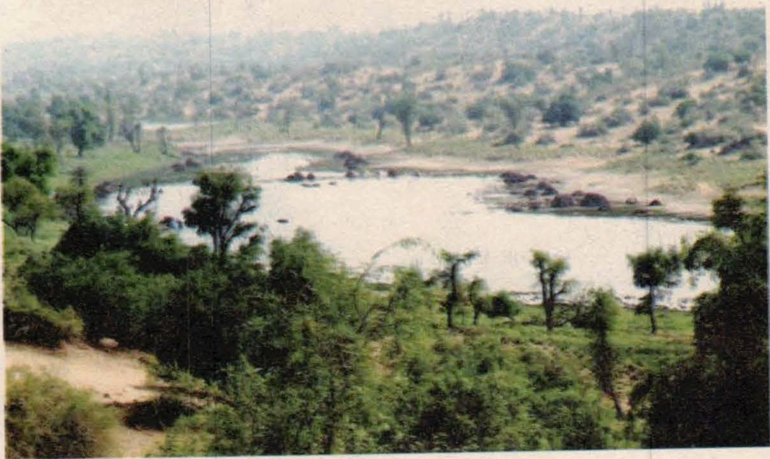
تھری خاتون، بچی گود میں لیئے ہوئے۔



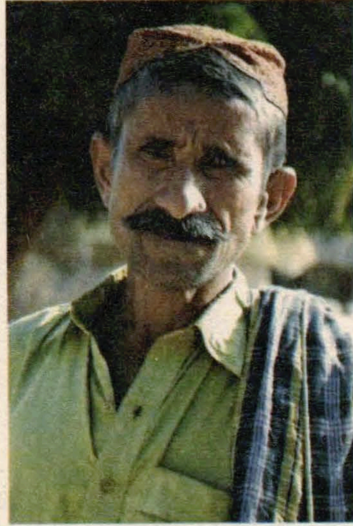
''چیلا'' تھر میں سفر کیلئے نشانِ راہ۔



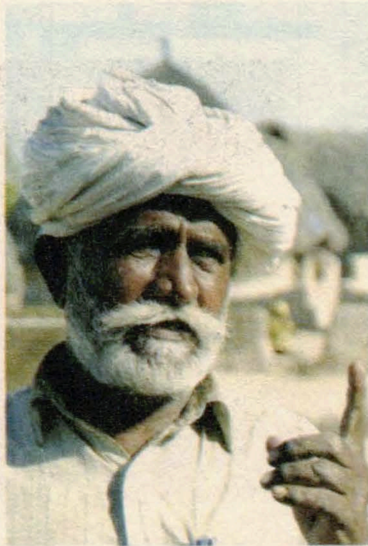
تھر میں قحط سالی، انسان تو انسان حیوان بھی پریشان



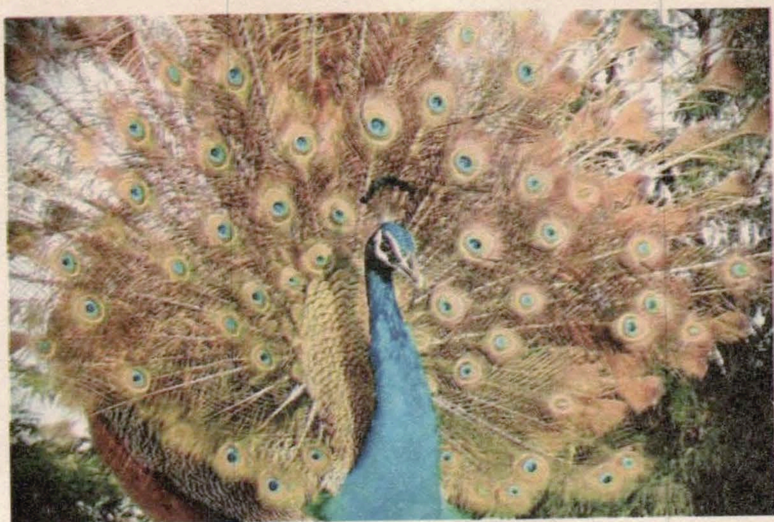
تھر میں بارش کے بعد ایک قدرتی جھیل کا منظر۔



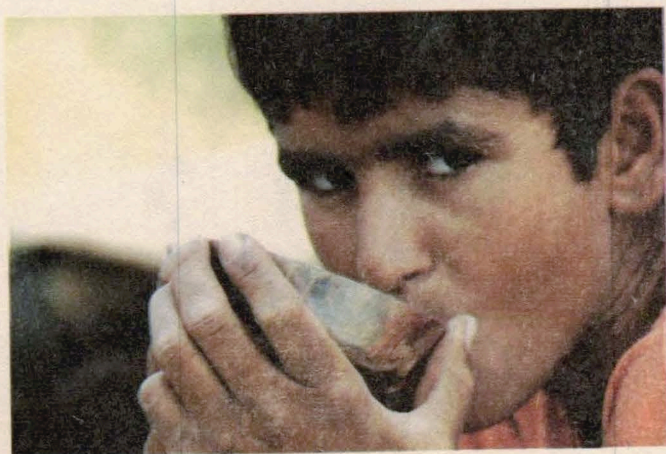
آنکھوں میں امید و بیم کے جگنو لیئے ایک "مارو"۔



ریزہ ریزہ بکھر گیا انسان......



تھر موروں کا مسکن ہے۔ ایک مور پر پھیلائے رنگینیاں بکھیر رہا ہے۔



تھر کا ایک بچہ کٹورے میں چائے پیتے ہوئے۔



دریائے پُران کے کنارے، آمری کا تاریخی قبرستان۔



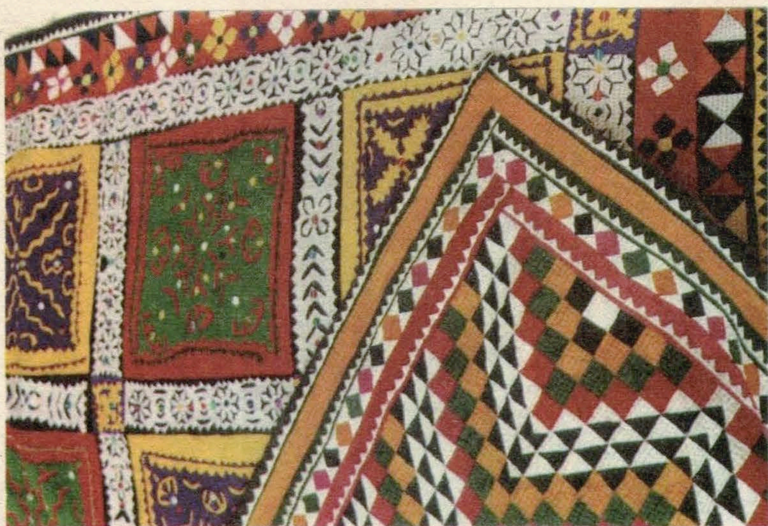
بزرگ دریا...... پُران کی قدیم گزرگاہ۔



بوڑھے پُران کے کنارے ایک قدیم یادگار۔



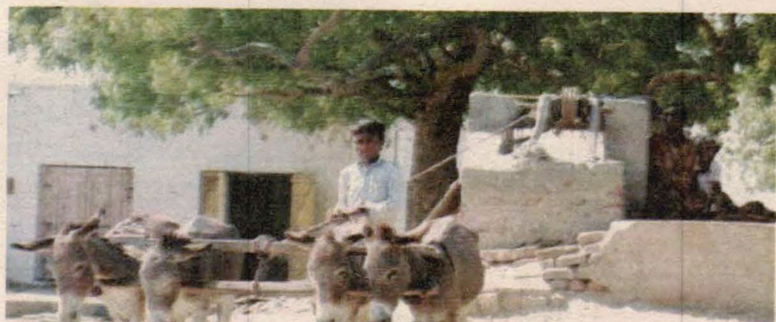
''سخی مرد'' میر جان محمد تالپور کی آخری آرام گاہ۔



تھر میں تیار کی جانے والی ایک خوبصورت رلی۔



چولستانی خواتین پانی کی تلاش میں سرگرداں۔



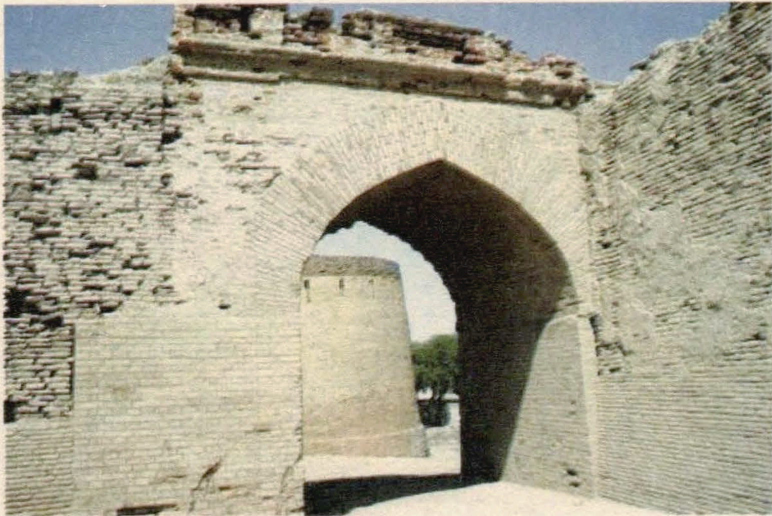
تھر میں کنوئیں سے پانی نکالنے کا روایتی طریقہ۔



ایک کنوئیں پر پیاسوں کا ہجوم۔



عمر کوٹ کے قدیم آثار زمین بوس ہونے لگے۔



عمر کوٹ کا مرکزی داخلی دروازہ۔



بارش کے بعد مٹھی کے میدانوں کا سرسبز منظر۔



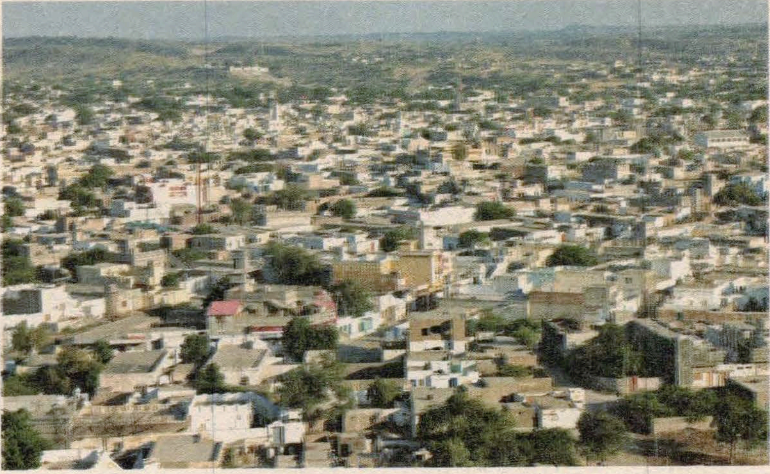
روہی وٹھڑی مینگھ ملھاراں......



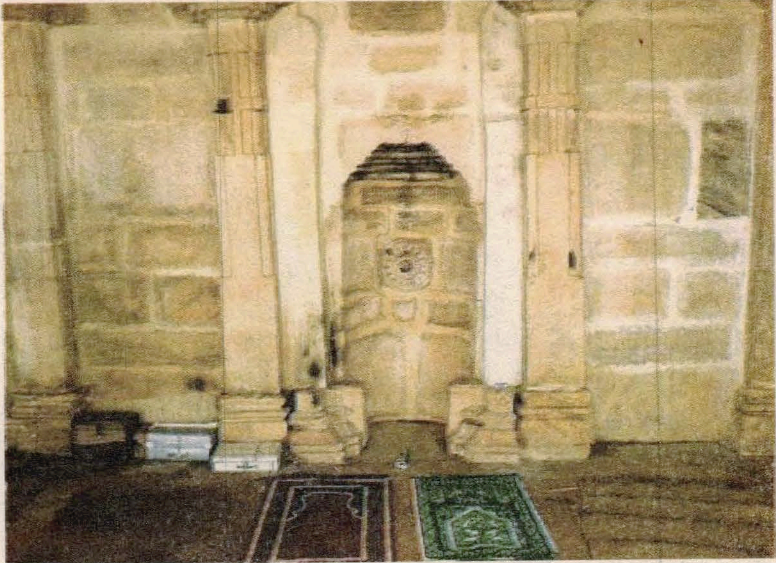
ویراواہ کا قدیم جین مندر۔



بارش کے بعد کارونجھر کے پہاڑی سلسلے کا دلفریب منظر۔



تھرپارکر کے دل، مٹھی شہر کی ٹیلے سے لی گئی تصویر۔



بوڑھیسر کی تاریخی مسجد کا اندرونی منظر۔



پیاسی نگاہیں، خالی مٹکے اور سامنے سراب ہی سراب۔



یہ غم کی انتہا ہے یا وفا کی...... نظر میں پیاس، ہونٹوں پر ہنسی ہے۔



پھر آرزوؤں کی بستی میں قافلے آئے......



بجھ گئے کتنے چاند سے چہرے......دل کے صحرا میں چاندنی کرتے۔



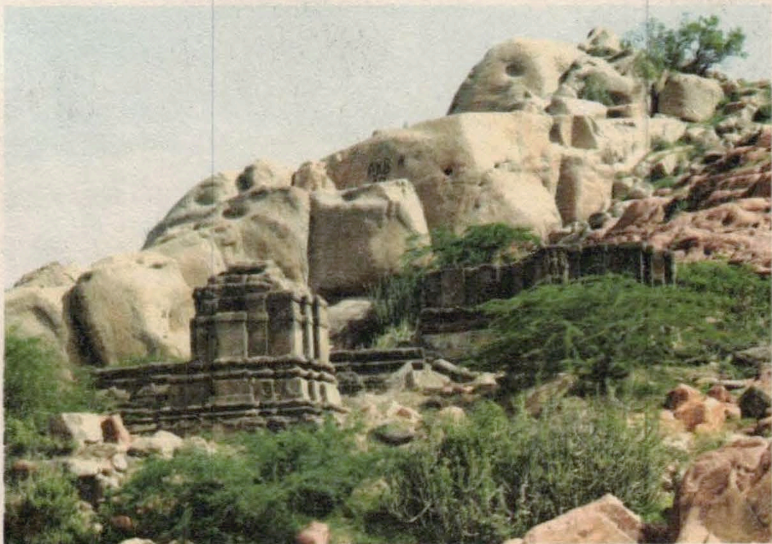
تھری خواتین بوڈھیسر تالاب سے پانی لینے جا رہی ہیں۔



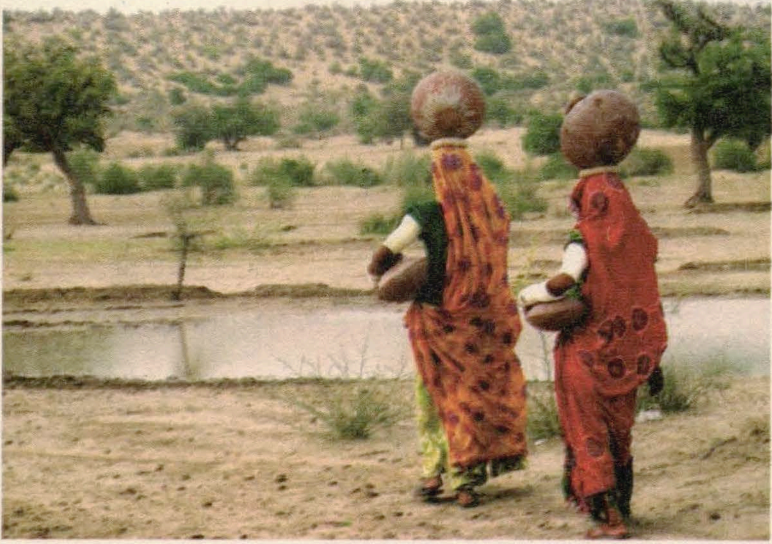
خوراک کی تلاش میں سرگرداں ریوڑ۔



کارونجھر کے دامن میں بوڑھیسر کا تالاب۔



کارونجھر کے دامن میں ایک آثارِ قدیمہ کی ایک نشانی۔



دو تھری خواتین مٹکے اٹھائے ایک ٹوبھے پر۔



دیکھو وہ چاند سلگتے ہیں صحرا کی تپتی ریت پر۔



تھر کا ایک ویران کنواں۔



تھر کے آنگن میں خالی مٹکے پر بیٹھا پیاسا کوا۔



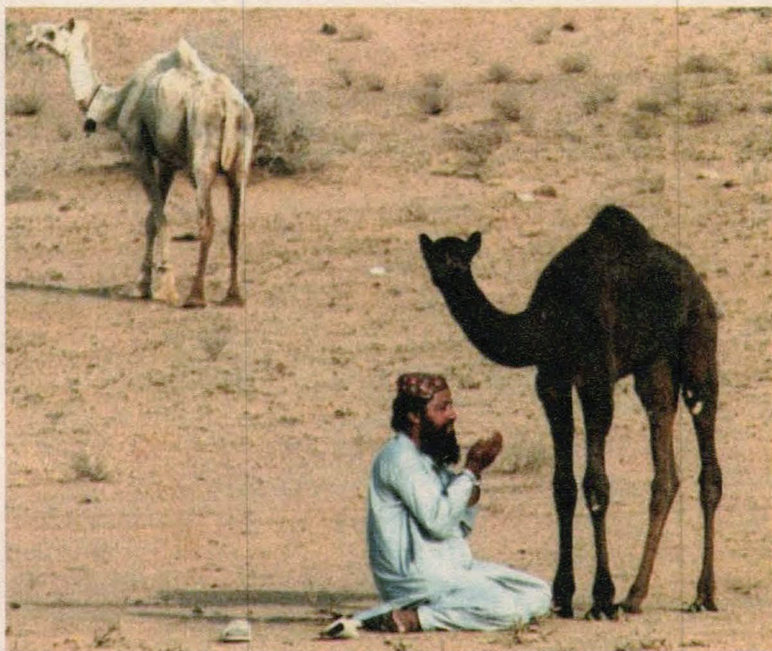
وجیتو کے سرکاری آبی ذخیرے پر خواتین، بچوں اور جانوروں کا ہجوم۔



پیاس اور افلاس کی ماری ایک دلدوز تصویر۔



خوشبو کو موسموں کا زہر پینا ہے ابھی.....



یا خدا!! ابر باراں بھیج...... پیاسی زمین تیری رحمتوں کی منتظر ہے۔



قلعہ نوکوٹ کا بیرونی منظر۔



بھالوا میں ماروی کا تاریخی کنواں۔



لق و دق صحرائے تھر میں بھٹکتی زندگی۔



ٹیلوں کے دامن میں ایک گھر کا منظر۔

بشیر خان قریشی، بخت جمال اور دیگر سندھی رہنماؤں کو پہلی بار قریب سے دیکھنے اور ان کے خیالات جاننے اور جانچنے کا موقع ملا۔ سیاست میں ڈیڈ لاک اور بریک تھرو کیا ہوتا ہے، اس کا اندازہ مجھے پہلی بار اسی اجتماع میں ہوا۔

میں نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بند کمرے میں ہونے والے اجلاس کی کہانیاں کچھ اور تھیں اور اجلاس سے باہر کچھ اور مناظر تھے۔ مجھے سندھ کی تنظیموں یا سندھی تنظیموں کے اتحاد ہونے یا نہ ہونے سے کوئی غرض نہیں تھی مگر مجھے بھنک پڑی اور ایسے لگا بھی کہ یہ اجتماع جنرل ضیاالحق کے ایما پر منعقد کیا گیا ہے اور اس کا ایجنڈہ ایوانِ صدر سے جاری ہوا ہے اور ایوانِ صدر سے اس اجتماع پر گہری نظر رکھی جا رہی ہے۔ کیونکہ جس طرح کے فیصلے ساز گار بنانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں ان کا فائدہ ایوانِ صدر ہی کو پہنچنا تھا۔

اس ''تاریخ ساز'' اجتماع کے اعلامیہ کی ابھی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاالحق کے ہاتھوں غیر جماعتی بیساکھیوں پر کھڑی اپاہج جمہوریت گرا دی گئی، جب سندھڑی کے محمد خان جونیجو وزارتِ عظمیٰ کے عہدے سے سبکدوش کر دیئے گئے۔ وہ چین کے سرکاری دورے پر گئے ہوئے تھے، واپس پلٹے اور ابھی ان کا جہاز اسلام آباد ائرپورٹ پر اترنے کی تیاریوں میں تھا کہ ان کے استقبالیہ ہجوم میں موجود صحافیوں کو اطلاع دی گئی کہ صدرِ مملکت ضیاالحق نے بڑی عجلت میں پریس کانفرنس بلائی ہے۔ ایک سرکاری اہلکار کی اس سرگوشی نے خیر مقدمی بھیڑ میں سراسیمگی پھیلا دی۔ کچھ کو اندازہ تھا کہ اس پریس کانفرنس کا مدعا کیا ہو سکتا ہے۔ اوجڑی کیمپ کا سانحہ رونما ہو چکا تھا اور اس کے حوالے سے محمد خان جونیجو کے بیانات پر فوجی حلقوں میں بڑی چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ اس کے تناظر میں سب بھانپ گئے کہ مارشل لا کی گود میں پروان چڑھنے والی جمہوریت کی بساط اب لپٹنے ہی والی ہے۔

پل بھر میں اسلام آباد ائرپورٹ کی فضا بدل گئی۔ ''منتخب وزیرِ اعظم'' کے لئے سراپا انتظار سارا استقبالیہ ہجوم لمحوں میں چھٹ گیا۔ تمام صحافی ایوانِ صدر دوڑ گئے، سرکاری عمائدین بھی اچانک غائب ہو گئے۔ ملک کا ''منتخب'' وزیرِ اعظم جہاز سے اترا تو اچانک اسے نئی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا۔ بہر حال جو اس کے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ محمد خان جونیجو کو دورہ چین پر بھیج کر جنرل ضیاالحق نے ان کی سبکدوشی کے پروانے پر دستخط کر دیئے، وہ واپس پلٹے تو ان کے پاؤں تلے سے

زمین کھسک چکی تھی۔ سندھ سے تعلق رکھنے والا مرنجاں مرنج وزیراعظم، فوجی جنرل سے خیرات میں ملی حکومت سے بے دخل کر دیا گیا۔ ملکی تاریخ کے پچاس ساٹھ برسوں میں وفاقی دارالحکومت میں، سندھ سے تعلق رکھنے والے چار وزرائے اعظم نشانِ عبرت بنا دیئے گئے۔ ملک کے پہلے منتخب وزیراعظم لیاقت علی خان قتل کر دیئے گئے، ذوالفقار علی بھٹو پھانسی چڑھا دیئے گئے، محمد خان جونیجو کو سیاسی موت مار دیا گیا اور محترمہ بے نظیر بھٹو کا مقدر شہادت بنی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ نے زہر کا ایک اور پیالہ اپنے حلق میں انڈیل لیا۔

میرے ذہن میں ابھی تک تازہ ہے کہ جب ہم شام کو دریائے سندھ کی ہوا خوری کے لئے گئے تو اس کی موجیں بپھری ہوئی تھیں۔ سن پہاڑوں کے دامن میں ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں زمین ہموار ہونے کی وجہ سے عام طور پر دریا بہت زیادہ پرسکون ہوتا ہے، لیکن اس کے بہاؤ سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پرسکون ہونے کے باوجود بہت پرجوش ہے۔ میں اور نذیر لغاری سن میں سندھو کے کنارے بیٹھ کر گھنٹوں اُس کی لپکتی لہروں سے مصافحہ اور مکالمہ کرتے رہے مگر آج حیدرآباد سے گزرا ہوں تو دریائے سندھ کے دامن میں نہ وہ لہریں ہیں اور نہ وہ اس کا روایتی جوش وخروش، ہر طرف ریت اڑ رہی ہے۔ موسم کیا خفا ہوئے ہیں، اس کی موجیں ہوا ہوگئی ہیں۔ کیا ۱۹۸۸ء کا وہ منظر اور کہاں آج کی یہ دلخراش تصویر۔ زمانے نے رنگ بدلنے میں ایک کروٹ لی ہے۔ میری نظر کی آخری حد تک دریا میں ریت اُڑ رہی ہے۔ پانی کی پتلی سی ایک لکیر سرکتے سرسراتے سانپ کی طرح بل کھاتی، پل کے نیچے سے گزر رہی ہے۔ دریا کے پیٹ میں پانی نہیں مگر اردگرد کے باثر کسانوں نے یہاں سبزیاں اور فصلیں اُگا رکھی ہیں جو پانی کی عدم دستیابی کے باعث مرجھائی ہوئی ہیں۔ میں دریائے سندھ کے دم توڑتے وجود کو دیکھ کر لرز گیا۔ یہاں قریب ہی انگریزوں کے ہاتھوں تعمیر کیا جانے والا کوٹری کے مقام پر ایستادہ ریلوے کا ایک صدی بوڑھا کپکپاتا آہنی پل بھی دریائے سندھ کی بے بسی پر افسردہ دکھائی دے رہا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں ساحلی زرعی زمینوں کو سمندری نمکیات سے بچانے کے لئے ۳۵ ہزار کیوسک پانی زیریں دھارے کے لئے ناگزیر ہے مگر یہاں تو اب ایک نالا سا بہہ رہا ہے۔ یہ مقدار چند سو کیوسک سے کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی میں کوٹری کے جس مقام سے گزرا ہوں، ڈاؤن اسٹریم کا نقطۂ آغاز یہی جگہ ہے، اس مقام سے ۳۵ ہزار کیوسک پانی سمندر کی جانب منتقل ہونا بہت

ضروری ہے۔ مجھے ٹیکنیکل سوجھ بوجھ نہیں ہے' میرے خیال میں پانی کی یہ پتلی سی دھار طاقت ور سمندری نمکیاتی موجوں کے سامنے سپر نہیں بن سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے ساحلی علاقوں میں سمندر مسلسل اوپر آتا جارہا ہے' سمندری نمکیات بڑھ جانے سے سال بہ سال ضلع ٹھٹھہ کی لاکھوں ایکڑ زمینیں بنجر ہورہی ہیں اوران علاقوں میں پیداواری صلاحیت کم سے کم ہوتی جارہی ہے۔

''ہاکڑا'' بھی ایک روز چولستانیوں سے روٹھ گیا تھا' وہ کیا روٹھا روہی سے زندگی روٹھ گئی۔ وہ دن اور آج کا دن روہیلے پانی کی بوند بوند کو ترستے ہیں۔ کیا سندھو بھی سندھ واسیوں سے روٹھ جائے گا؟ یہ سوال میرے لئے ہی نہیں سندھ ساگر کی تہذیب سے جڑے سب لوگوں کے لئے روح فرسا ہے۔ ایک تہذیب جو ہزاروں برسوں کی زندگی کے سارے رنگوں اور روشنیوں کی امین ہے' اس طرح سے اچانک موسمی تغیرات کی آڑ لے کر صفحۂ ہستی سے مٹ جانے کا ارادہ کرلے گی' ہم نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سن کے سفر کے بعد مجھے ایک عشرے بعد دریائے سندھ کی زیارت کا موقع دوبارہ ملا ہے' میں سوچ رہا ہوں' پچھلے دس گیارہ برسوں میں سندھ کا منظر نامہ کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ میرے وجود میں دوڑنے والی مایوسی کی لہر نے میرے دل و دماغ میں تاریکی پھیلا دی ہے۔ خدا خیر کرے۔

دریائے سندھ ایک دریا ہی نہیں' زندگی' ایک تاریخ' ایک تہذیب اور ہزار ہا الف لیلوی داستانوں کا سرچشمہ ہے۔ یہ جس قدر وسیع دریا ہے اسی قدر اس کی تاریخ اور جغرافیہ بھی وسیع اور صدیوں پر محیط ہے۔ وقت نے اسے کئی نام دیئے' کہیں اسے اباسین کہا گیا اور کہیں سندھو اور مہران' کہیں اسے سندھ کے نام سے موسوم کیا گیا تو کبھی سندھ ساگر اور انڈس۔ عرب آج بھی علمی اور تاریخی حوالوں سے گنگا جمنا اور سندھ کی تہذیبوں کو ''الہند والسندھ'' کے نام سے دو مختلف تہذیبی اور ثقافتی اکائیوں سے یاد کرتے ہیں جبکہ تمام قدیم تواریخ میں وادی سندھ کی تہذیب کو الف لیلوی طرز کے کرداروں اور طلسماتی داستان کے طور پر جگہ دی گئی ہے۔

اس دریا کے صدقے جنم لینے والی تہذیب کھیتی باڑی کے معاملے میں اقوامِ عالم میں معمار تصور کی جاتی ہے۔ وادی سندھ کے لوگوں کو دریائے سندھ کی طغیانیوں اور سیلابوں نے اس کے پانی کے ساتھ کھیلنے کے فن سے آشنا کردیا۔ اس تہذیب نے پانیوں کا رخ موڑنے' ان سے نہریں نکالنے' پانی کو ذخیرہ کرنے اور دریا پر بند باندھنے کے علم اور فن پر دسترس حاصل کرلی۔

یہاں دریافت ہونے والے قدیم ترین شہروں کی باقیات نے یہاں پانی کے استعمال کے حوالے سے علم اوراستعداد کے حیران کن تصورات فاش کئے ہیں جو یہاں کےلوگوں کی انسانی زندگی کے اس اہم ترین بنیادی جزو کی اہمیت سے آگاہی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

دریائے سندھ سطح سمندر سے ۱۷ ہزار فٹ بلندی پر ہمالیہ کی گود میں بلندی سے پھوٹنے کے بعد طویل ترین سفر طے کرتے ہوئے بحرِ ہند کے گہرے پانیوں سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ یہ سفر کافی نرالا ہے۔ کہیں یہ دریا برف پوش پہاڑیوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو کہیں یہ تنگ اور سنگلاخ چٹانوں سے راستہ بناتا ہوا صحراؤں کے سینے پر سانپ کی طرح رینگتا دکھائی دیتا ہے۔ کہیں یہ شوخ وشنگ ہے تو کہیں انتہائی پرسکون۔ ہند اور سندھ کی تہذیبوں میں یہ واحد دریا ہے جس کا اپنے اس سارے سفر میں ہر خطے میں الگ رنگ اور علیحدہ مزاج ہے۔ اس کے مزاج کا یہی نرالا پن ہے کہ دنیا نے اسے ''شیر دریا'' کا نام دیا ہے۔ مگر لگتا ہے ہزاروں سال بعد' اب یہ شیر بوڑھا ہو گیا ہے' اب اس میں وہ روایتی دم خم باقی نہیں رہا۔ موسمی تغیرات نے اس کے کس بل نکال دیئے ہیں' ورنہ ایک زمانہ تھا کہ اس کی جولانیوں کا سامنا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کی گود میں پناہ لینے والی یا اسے عبور کرنے کا ارادہ رکھنے والی بیسیوں ملکوں کی سپاہ وقتاً فوقتاً اس کے غیظ وغضب کا نشانہ بنتی رہیں۔ کیونکہ خاص طور پر پوٹھوہار وہ مقام ہے جہاں مشرق سے مغرب تک آنے والے قدیم راستے دریائے سندھ کو عبور کرتے ہیں جبکہ دریائے سندھ کا زیریں علاقہ بھی تجارتی سرگرمیوں اور افواج کی آمد ورفت کے حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ دریائے سندھ کی تہذیب کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ:

''یہ ایک کٹی پھٹی اور سلوٹوں والی دھرتی ہے جس کی تاریخ کی کئی صدیاں ماضی میں گم ہو چکی ہیں' اس کی تاریخ کے بیشتر باب نذرِ طاقِ نسیاں ہو گئے ہیں یا پھر ان پر نئے رنگ چڑھا دیئے گئے ہیں۔ یہاں سے ہزاروں سال قبل کے تراشے ہوئے برتن اور ہتھیار بھی ملے ہیں۔ پتھر کے زمانے کے بعد زمانہ قبل از تاریخ کے اندھیروں میں سے چند ایک کرنیں ہی ہم تک پہنچ سکی ہیں۔''

ماہرین آثارِ قدیمہ نے ایسے شہروں کی باقیات بھی دریافت کی ہیں جو بظاہر تجارتی راستوں کے ذریعے مغرب میں ایران اور بحیرہ روم کے علاقوں اور مشرق میں ہندوستان اور جنوب میں دریائے سندھ کے زیریں علاقوں اور بحیرہ عرب کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ یہ شہر حضرت مسیح

کی پیدائش سے لگ بھگ ایک ہزار سال پہلے تعمیر کئے گئے تھے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سویڈش نژاد جرمن ہیڈن پہلا وہ سفید فام تھا جس نے برسوں مارا مارا پھرنے کے بعد ۱۹۰۷ء میں ہمالیہ کی چوٹیوں پر جھیل مانسرور میں سے اس عظیم دریا کا منبع دریافت کیا۔ اس سے پہلے تبتیوں کا خیال بھی یہی تھا کہ دریائے سندھ جھیل مانسرور سے پھوٹتا ہے۔ تبت کی قدیم روایات میں ہے کہ یہ جھیل مقدس اور علامتی ہے' اس لئے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک عظیم اور طاقتور دریا یہاں سے نکلنا چاہئے اور علامتی طور اب بھی ایسا ہے۔ انگریز مورخ جین فیرلی اپنی کتاب ''شیر دریا'' میں لکھتا ہے:

''بہر حال حقیقت میں قدیم روایات اس قدر غلط بھی نہیں ہوتیں۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ چار دریاؤں ستلج' گنگا' برہما پترا اور سندھ میں سے کوئی ایک بھی جھیل مانسرور سے نہیں پھوٹتا پھر بھی یہ آپس میں ایک دوسرے سے اتنے کم فاصلوں سے پھوٹتے ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں یہ ایک ہی جگہ سے نکل کر چاروں سمتوں کا رخ کرتے ہیں۔''

دریائے سندھ کی تہذیب اپنی ہزاروں سالہ تاریخ میں سیکڑوں قوموں اور ہزاروں قبائل کا مسکن اور بودوباش کا وسیلہ رہی ہے۔ سندھ کا پانی ان کے لئے روزِ اول سے زندگی اور موت کا مسئلہ رہا ہے۔ تاریخ ایسی کئی خونریز جنگوں کے حوالے اور واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے کہ جو محض اس دریا کے پانی پر اپنی قدرت رکھنے کے لئے سالہا سال تک لڑی گئیں۔ سکندرِ اعظم نے جب وادی سندھ پر چڑھائی کی تو مقامی حکمرانوں نے اسے خبردار کیا کہ اگر وہ ان کے دریا کے پانیوں اور بود وباش کے وسائل پر قبضے کی نیت سے یہاں آیا ہے تو اسے ان کی تلواروں ' بھالوں اور نیزوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دریائے سندھ کے گردونواح میں آج بھی سکندرِ اعظم کو بہت بڑے سپہ سالار عظیم حکمران کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے یہاں آنے کے دو ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد ایک قبیلے کے بزرگوں نے ایک انگریز حکمران کو بتایا کہ دریائے سندھ سکندرِ اعظم کی آخری سرحد تھی۔ اس لیے نہیں کہ سکندر آگے نہیں جانا چاہتا تھا بلکہ اس لئے کہ سکندرِ اعظم کی طرح یہ دریا بھی ناقابلِ شکست تھا۔ اپنی گزشتہ آٹھ سالہ شاندار فتوحات کے ساتھ ۳۲۷ قبل مسیح یونان' ایشیا' کوچک' شام اور ایران کا شہنشاہ افغانستان سے مشرق کی جانب چلتا ہوا ہندوستان میں داخل ہوا۔

دریائے سندھ سے سومیل پہلے اس نے اپنی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصہ مشرق کی جانب بہتے ہوئے معاون دریا کابل کے ساتھ ساتھ ہو گیا۔ دوسرا شمال کی جانب گھوم گیا۔ وہ قبائل جن کی سرزمین کو وہ روندتا ہوا چلا آ رہا تھا' جانتے تھے کہ گوریلا جنگ کیسے لڑی جاتی ہے' لیکن سکندر بھی جس مکتب کا پڑھا ہوا تھا وہ ان سے کچھ کم نہیں تھا۔ ایک بڑی جنگ کے بعد چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کے ایک سلسلے کے بعد فوج کے دونوں حصے آپس میں آ ملے اور دریائے سندھ تک پہنچ گئے۔ دریا کے مشرقی کنارے پر ٹیکسلا کی وہ ریاست واقع تھی جس کا بادشاہ ٹیکسیلیس ایک بہادر اور دانشمند انسان تھا۔ اس نے سکندرِ اعظم کی فاتحانہ پیش قدمی کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ بلا خوف و خطراب اس کو ملنے کے لئے دریائے سندھ کے پار آ گیا اور ابتدائی علیک سلیک کے بعد اس سے یوں گویا ہوا:

''اگر تم ہم سے ہمارا پانی اور دوسری ضروریاتِ زندگی چھیننے کے لئے نہیں آئے تو پھر ہم دونوں کس بات پر جنگ کریں' کیونکہ یہی ایک وجہ ہوتی ہے جس کی بنیاد پر معقول انسان جنگ کرتے ہیں۔ جہاں تک سونے چاندی اور دیگر قیمتی اشیا کا تعلق ہے' اگر میں تم سے زیادہ امیر شخص ہوں تو ان کا ایک حصہ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ اگر میں تم سے غریب ہوں تو مجھے تمہاری دولت حاصل کرنے کی کوئی تمنا نہیں۔'' سکندرِ اعظم ٹیکسیلیس کی بے باکی اور دانشمندی سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ اس نے بادشاہ کا ہاتھ تھاما اور جواب دیا:

''کیا تم سمجھتے ہو کہ اس شائستگی کے مظاہرے سے تم بغیر مقابلہ کئے بچ نکلو گے؟ اگر تمہاری یہ سوچ ہے تو تم بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں آخری دم تک تمہارے ساتھ لڑوں گا مگر یہ جنگ تلواروں کی نہیں' نوازشات اور فائدے کی جنگ ہوگی کیونکہ میں اس فیاضی میں تمہیں خود سے آگے نہیں نکلنے دوں گا۔'' انہوں نے آپس میں قیمتی تحائف کا تبادلہ کیا اور سکندر اعظم ٹیکسیلیس کو اپنی سلطنت میں خوش و خرم چھوڑ کر کنارا کر گیا۔ ایک روایت یہ ہے کہ وادی سندھ میں قیام کے دوران سکندرِ اعظم ٹیکسیلیس کی بہن پر اپنا دل فدا کر بیٹھا تو یہ دوستی اور مستحکم ہو گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ٹیکسیلیس نے سکندر اعظم کو وطن واپسی میں کافی معاونت کی اور ۲۰۰ کشتیاں بھی فراہم کیں۔

دریائے سندھ نے میرے عہد میں اپنے ماضی سے منہ موڑ لیا ہے' کئی روایات ہیں جو اس نے ترک کر دی ہیں۔ یہ جب ہمالیہ سے اُمڈتا تھا تو اس کی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ اس کے

جوش اور طاقت سے تھر تھر کانپتی تھی، مگر اب اس کی روانیوں کو موسموں نے اپنے تابع کر لیا ہے۔ اس کی نواحی آبادیاں مسلسل اس کے غیظ وغضب کا نشانہ بنی رہتیں اور اس کی طغیانیاں جھیلتی تھیں، اس کے سیلابوں میں ہر سال سیکڑوں لقمۂ اجل بن جاتے تھے لیکن اس کے باوجود یہ ان کے لئے محبوب کی مانند تھا۔ اس شیر دل دریا کے ہاتھوں صدمات جھیلنے کے باوجود وہ ایک دوسرے کے لئے ناگزیر تھے۔ اس دریا کے سبب ان کے ہر سال لاکھوں ایکڑ سیراب ہوتے تھے اور اس کے دم سے وادی سندھ میں زندگی اپنے شباب پر تھی۔ نیا ہزاریہ اس کے دامن میں پناہ گزیں آبادیوں کے لئے بدبختی کے پیغامات لے کر آیا ہے، اب اس کے وجود پر نحوست کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ اس کی آس پر زندہ رہنے والے اب اس کے پانی کو ترس گئے ہیں۔ پانی کی کمیابی سے تہذیب نے نئے رنگ اپنا لئے ہیں تو یہاں صورتِ حال بھی یکسر بدل گئی ہے۔

دریائے سندھ قدرت کی طرف سے ہمارے لئے عطیہ تھا، ہم نے اس عطا کی قدر نہیں کی تو اس نے بھی ہم سے بے رخی اختیار کر لی ہے۔ آج سندھو میں اتنا پانی بھی نہیں ہے کہ ہم اپنی ضروریات پوری کر سکیں تو مدتوں بعد ہمیں پانی ذخیرہ کرنے اور اس مقصد کے لئے ڈیم بنانے کی سوجھی ہے۔ تاریخ کے اس اہم موڑ پر کہ جب پانی کے وسائل اپنی مٹھی میں رکھنے کے لئے ملکوں میں جنگوں کے خطرات پیدا ہو گئے ہیں، سندھ کا پانی پاکستان کی مختلف اکائیوں میں بھی وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ برسوں پہلے حکومت نے دریائے سندھ پر کالا باغ کے مقام پر ڈیم کی تعمیر کا منصوبہ دیا جس کی تعمیر کے حوالے سے پنجاب اور ملک کے دیگر تین صوبوں میں تنازعات نے جنم لیا ہے۔ کالا باغ ڈیم کے مستقبل کے حوالے سے پاکستانی صوبوں میں ایک نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی ہے جو نہ جانے کس انجام سے دوچار ہو گی۔ اس مسئلہ نے ''قومی سلامتی'' خطرات سے دوچار کر دی ہے۔ دریائے سندھ کے پانی پر سندھ اور پنجاب میں یہ نزاع اور کالا باغ ڈیم پر اختلافِ رائے ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جس کا مختصر جائزہ لینا یقیناً قارئین پر گراں نہیں گزرے گا۔



کالاباغ ڈیم کا قومی قضیہ

دریائے سندھ یا ''سپت سندھو'' جسے رگ وید میں سرسبز و شادابی کا دیوتا کہا گیا ہے اور گلگت بلتستان کے لوگ اسے ''اباسین'' (دریاؤں کا باپ) کہتے ہیں۔ آج کل بہت متنازعہ مسئلہ بن کر رہ گیا ہے اور اس کے پانی کی تقسیم پر سندھ اور پنجاب کی حکومتوں کے درمیان اختلافی نقطہ ہائے نظر پیش کئے جا رہے ہیں جس کی بنیاد پنجاب اور سرحد کے علاقے میں بننے والا ''کالا باغ ڈیم'' کا منصوبہ ہے۔ دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم کے مسئلے پر سندھ، پنجاب اور سرحد تین فریق ہیں جن میں سے دو فریقوں کا نقطہ نظر مجموعی طور پر اس کے خلاف ہے اور ایک فریق (پنجاب) اس کے حق میں ہے۔ وسائل کی تقسیم اور اقتدار میں شراکت کے حوالے سے مختلف قومی اکائیوں میں کئی اختلاف موجود ہیں لیکن کالاباغ ڈیم کا قضیہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے ملک کے مختلف صوبوں ہی نہیں ساری قومیتوں کو مزید تقسیم کر دیا ہے۔

اس اہم قومی مسئلے کی تاریخ اور تنازعات کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں ذرا ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا پڑے گا۔ انگریزوں نے سندھ اور پنجاب کے علاقے تقریباً ایک ہی دور میں فتح کئے تھے۔ لارڈ ایلن برو نے ۱۸۴۳ء میں میانی اور دُبے کی جنگ میں سندھ پر قبضہ کیا اور دو چار برس بعد فیروز پور، علی وال اور سوبران کی جنگوں میں پنجاب کو بھی فتح کر لیا۔

عام طور پر سندھ میں ربیع کی فصلوں کے لئے فضا سازگار تھی کیونکہ سندھ کے لوگ بیراجوں کے بغیر بھی بعض مقامات پر گندم کی کاشت کیا کرتے تھے۔ حکومت ہندوستان کو اچھی طرح معلوم

تھا کہ سندھ میں آبپاشی کے فروغ کے لئے موافق حالات موجود ہیں اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن سیاسی وجوہات کی بنا پر انہیں پہلے پنجاب پر توجہ دینا پڑی۔ جس کے پس منظر میں یہ بات بھی شامل تھی کہ پنجاب کے دریا' دریائے سندھ کی نسبت بہت چھوٹے ہیں اور ان پر پل یا بیراج تعمیر کرنا نسبتاً آسان تھا حالانکہ ''دائی پانی'' کا مواد سندھ میں زیادہ موجود تھا کیونکہ پنجاب کے سارے دریا مٹھن کوٹ کے مقام پر دریائے سندھ میں شامل ہو جاتے ہیں۔

سندھ میں پیداوار پنجاب کے مقابلے میں بہت آگے تھی لیکن انگریز حکمرانوں کی سیاسی مصلحت کے تحت پنجاب میں پانی کی بہتر منصوبہ بندی کی وجہ سے صرف سات دہائیوں میں پنجاب کی پیداوار سندھ سے تیس گنا زیادہ ہوگئی۔ آبی منصوبہ بندیوں کے آغاز سے قبل ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۵ء تک پنجاب کی فصلیں ۷/لاکھ ۵۰ ہزار ایکڑ جبکہ سندھ میں ۱۰/لاکھ ایکڑ تھیں جو آبی منصوبوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ روز افزوں زیادہ ہوتی گئیں۔ ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۰ء تک پنجاب اور سندھ کی فصلیں پندرہ لاکھ ایکڑ' ۱۸۸۰ء سے ۱۸۸۵ء تک پنجاب کی فصلیں ۲۰/لاکھ اور سندھ کی ۱۶/لاکھ ایکڑ اور پھر ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۰ تک صورتِ حال یکسر تبدیل ہوگئی اور یہ تناسب پنجاب میں ۹۰/لاکھ ایکڑ تک پہنچ گیا اور سندھ میں صرف ۳۴/لاکھ ایکڑ تک رہا۔

پروفیسر جاوید چانڈیو کی تحقیق کے مطابق سندھ میں آبی اصلاحات کا آغاز سر چارلس نیپئر نے ۱۸۴۳ء میں سندھ فتح کرنے کے بعد کرنل والٹر اسکاٹ کی زیرِ نگرانی یہاں محکمہ انہار قائم کر کے کیا جو زیادہ عرصہ نہ چل سکا۔ ۱۸۵۵ء میں جنرل فائیف نے سندھ میں نہری نظام کی بہتری کے لئے تجاویز دیں مگر ان پر بھی عمل نہ ہو سکا۔ ۱۹۱۰ء میں ڈاکٹر سمرس نے سندھ کے لئے روہڑی پراجیکٹ بنایا جو ایک بار پھر سیاسی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے پنجاب کے آبی منصوبوں کو سندھ کے لئے خطرناک قرار دیا مگر اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

انگریزوں کے ہندوستان میں زیرِ قبضہ علاقوں میں آبی منصوبوں کی شروعات کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یو پی کا ''بارے دوآب کینال پراجیکٹ'' ۱۸۸۴ء میں اور پنجاب کا ''لوئر چناب کینال پراجیکٹ'' ۱۹۰۲ء میں شروع کیا گیا جبکہ سندھ میں ۱۹۱۳ء میں محض سوچ بچار شروع کیا گیا کہ کس طرح سے سندھ میں آبپاشی کے نظام میں بہتری لائی جائے۔ بڑی جدوجہد کے بعد سندھ کے لئے پہلا منصوبہ مسٹر مستو کی سفارشات پر سکھر بیراج ۱۹۲۳ء میں منظور ہوا۔

سندھ کے لوگوں کا کہنا ہے کہ پنجاب کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ اپنے پانچ دریاؤں بیاس، ستلج، راوی، چناب اور جہلم کا مکمل پانی بہ آسانی استعمال کر سکتے ہیں لیکن وہ معلوم نہیں کیوں ۱۸۷۱ء ہی یہ سرتوڑ کوشش کرنے لگے کہ انہیں دریائے سندھ میں سے کالا باغ کے مقام سے پانی لینے کی اجازت دے کر تھل پراجیکٹ منظور کیا جائے لیکن وائسرائے نے اس کی اجازت نہیں دی۔ جن دنوں سندھ ممبئی میں شامل تھا، ان دنوں اگست ۱۹۱۹ء میں حکومت ممبئی نے حکومت ہند کو اپنے اندیشوں سے آگاہ کیا کہ دریائے سندھ سے پانی کے حصول کے سلسلے میں حکومت پنجاب کے ارادے نیک نظر نہیں آرہے اور اگر حکومت پنجاب کے ذہن میں کوئی منصوبے ہیں تو اس سے حکومت ممبئی کو آگاہ کیا جائے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دریائے سندھ کے پانی کے حصول کے لئے پنجاب حکومت کے تقاضے بڑھتے گئے اور حکومت ممبئی کے خدشات میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں حکومت پنجاب نے سکھر بیراج پراجیکٹ کے مقابلے میں دوبارہ تھل پراجیکٹ منظوری کے لئے مرکزی حکومت کو بھیج دیا جسے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے غیر قانونی قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ حکومت پنجاب نے صرف پندرہ ماہ بعد تھل کینال کے ذریعے آزمائشی بنیادوں ۷۵۰ کیوسک پانی کی عرضداشت مرکز کو پیش کردی، ابھی مرکز اس کی اطلاع ممبئی کو کر ہی نہیں پایا تھا کہ پنجاب نے ایک بار پھر تھل کے بڑے منصوبے کی تجویز مرکز کو بھجوادی جسے وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے سختی کے ساتھ رد کر دیا اور کہا کہ ''ایسا کرنا سندھ کے ساتھ سنگین ترین ناانصافی ہوگی''۔

ادھر ان ہی دنوں سکھر بیراج پر کام شروع ہو چکا تھا جس کے ساتھ ساتھ ستلج ویلی پراجیکٹ کی بھی تکمیل ہوئی۔ ان تمام معاملات کی تکمیل کے بعد ایک طرف بیکانیر اور بہاول پور کا پنجاب کے ساتھ جھگڑا کھڑا ہو گیا تو دوسری طرف خیر پور نے ربیع کی فصل کے لئے مزید پانی کا تقاضا کیا اور پنجاب نے بھی ''حویلی پراجیکٹ'' میں اور زیادہ پانی مانگ لیا جبکہ سندھ کے پچھلے اعتراضات کے بارے میں ابھی تک مرکزی حکومت نے کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا۔ پانی کے حوالے سے تنازعات بڑھے تو حکومتِ ہند نے یو پی کے چیف انجینئر اینڈرسن کی سربراہی میں کمیشن بٹھا دیا جسے یہ سارے قضیے نمٹانے کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اس کمیشن نے ۱۶ ستمبر ۱۹۳۵ء کو اپنی سفارشات پیش کیں اور حکومت ہند نے ۳۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو ان سفارشات کو قبولیت کی سند دیتے

ہوئے عملدرآمد کے احکامات جاری کر دیئے۔ ان سفارشات کے مطابق سکھر بیراج' پہاڑپور کینال اور تھل کینال کے لئے ماہ وار کوٹہ مقرر کیا گیا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تھل کینال کا مسئلہ کمیشن کے ایجنڈے پر ہی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود اس وقت کی حکومت پنجاب تھل کینال کا کوٹہ مقرر کرانے میں کامیاب ہوگئی حالانکہ ۱۹۳۹ء تک سکھر بیراج کے حالات کا جائزہ لینے تک ایسی تقسیم کا انتظار کیا جانا ضروری تھا۔

حکومت ہندوستان ایکٹ میں سیکشن ۱۳۰' ۱۳۱' ۱۳۲ اور ۱۳۴ کے تحت صوبوں کو حق دیا گیا کہ وہ کسی فریق کی طرف سے پانی کے حوالے سے نقصان یا اعتراض کی صورت میں فیصلہ کے لئے گورنر جنرل سے رجوع کر سکیں گے۔ پنجاب نے ان تمام حالات کے باوجود دریائے سندھ سے زیادہ پانی حاصل کرنے کی مہم تیز کر دی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت ہندوستان ایکٹ کے تحت سندھ (جو ۱۹۳۶ء میں ممبئی سے الگ ہو چکا تھا) نے ۷/ جون ۱۹۴۱ء کو پنجاب کے رویئے کے خلاف اپنے اعتراضات گورنر جنرل کے سامنے پیش کر دیئے۔

گورنر جنرل نے سندھ کے اعتراضات کی تحقیقات کے لئے ۱۱ ستمبر ۱۹۴۱ء کو ایک کمیشن بٹھایا جس کی سربراہی کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک جج بی این اے رائے کو مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن بعد میں ''رائے کمیشن'' کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کمیشن نے رائے دی اور محسوس کیا کہ اگر سندھ کے پانی کے بارے میں پنجاب کے مطالبات پر غور کیا جائے تو اس کا خود سندھ کی نہروں پر منفی اثر پڑے گا۔ کمیشن نے قرار دیا کہ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ بالائی سندھ اور زیریں سندھ میں کم از کم دو نئے بیراج تعمیر کئے جائیں' جن کی لاگت کمیشن کے خیال میں ۱۶ کروڑ روپے تھی جن میں سے کمیشن نے سندھ کے پچھلے نقصانات کے ازالہ کے لئے دو کروڑ کا ہرجانہ پنجاب پر عائد کیا۔

رائے کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں سندھ اور پنجاب کے مابین یہ تنازعہ حل کرنے کے لئے اپریل ۱۹۴۳ء میں دونوں صوبوں کے چیف انجینئرز میں مذاکرات کا آغاز ہوا جو ۱۸/ ماہ جاری رہے۔ ان مذاکرات میں ہندوستان کے بابائے آبپاشی سر کلاؤڈ انگلس نے معاونت کی اور بالآخر ۲۸/ ستمبر ۱۹۴۵ء میں دونوں فریقین میں ایک عہد نامہ طے پا گیا جسے ''سندھ پنجاب سمجھوتہ ۱۹۴۵ء'' کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے میں پانی کی تقسیم کا قطعی فارمولا طے کر لیا گیا صرف ہرجانے کی رقم کا تعین ثالثی پر چھوڑ دیا گیا۔ کمیشن نے ہرجانے کی رقم دو کروڑ روپے مقرر کی' پنجاب تین

کروڑ دینے کو تیار تھا مگر سندھ چار کروڑ روپے مانگ رہا تھا' یہ مسئلہ لٹک گیا اور کہتے ہیں کہ سندھ کو پھوٹی کوڑی بھی نہ مل سکی۔

سندھ پنجاب سمجھوتہ ۱۹۴۵ء کے بعد ریڈکلف ایوارڈ کے نتیجے میں اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیمِ ہند عمل میں آ گئی تو صورتِ حال یکسر بدل گئی۔ قیامِ پاکستان کے بعد پانی کی تقسیم اور آبپاشی کے نظام کے تقاضے بھی اچانک بدل گئے۔ تقسیم کے بعد ریڈکلف ایوارڈ کے تحت دریا بھارت میں رہ گئے اور نہریں پاکستان میں آ گئیں۔ ایک نہر ستلج سے فیروز پور ہیڈ ورکس سے اور دوسری راوی سے مادھو پور ہیڈ ورکس سے نکلتی تھی' دونوں ناکارہ ثابت ہوئیں۔

تقسیمِ ہند کے نتیجے میں فریقین نئے آبی مسائل اور تنازعات کا شکار ہو گئے جس پر ان مسائل کے حل کے لئے دونوں فریقوں پاکستان اور بھارت کے ممبران پر مشتمل ایک اور کمیٹی بنائی گئی جسے ''کمیٹی بی'' کا نام دیا گیا۔ اس کمیٹی میں پاکستان کی طرف سے پنجاب کے علاوہ دیگر صوبوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا کیونکہ تینوں ارکان خان بہادر شیخ عبدالحمید' پیر محمد ابراہیم اور ایس آئی محبوب کا تعلق تقسیم سے پہلے متحدہ پنجاب اور تقسیم کے بعد مغربی پنجاب سے تھا۔ ایس آئی محبوب نے ستلج اور راوی دریاؤں سے نکلنے والی ان نہروں کا مسئلہ ''کمیٹی بی'' کے ایجنڈے پر رکھوایا مگر بعد میں وہ تصفیہ کمیٹی سے پراسرار طور پر الگ کر دیئے گئے تو بھارت نے ان نہروں کا معاملہ ایجنڈے ہی سے باہر کرا دیا۔ بھارت نے ۳۱ مارچ ۱۹۴۸ء تک یہ نہریں بہنے دیں لیکن جونہی ''کمیٹی بی'' کی عمر پوری ہوئی ان نہروں کا پانی بند کر دیا گیا۔ بعد میں پاکستان نے اپنے ہی دریاؤں کے پانی کی قیمت دے کر ان نہروں کی زندگی بچائی۔

جواہر لال نہرو کے داؤ پیچ میں آ کر پاکستان ایک معاہدہ کے جال میں پھنس گیا حالانکہ اگر پاکستان اس زیادتی کے خلاف ہیگ کی عالمی عدالت سے رجوع کرتا تو فیصلہ اس کے برعکس ہوتا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ پنجاب شملہ سمجھوتے پر دستخط کر کے اپنا اور دیگر صوبوں کا پانی کھو بیٹھا تو اس کے ناقدین کہتے ہیں کہ اب اس کی نگاہیں سندھ کے پانی پر جم گئیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''سندھ پنجاب معاہدہ'' کے تحت پنجاب سندھ کی منظوری کے بغیر صوبے میں کوئی نیا آبی منصوبہ شروع نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے بی آر بی نہر (بمباں والا' راوی' بیدیاں لنک) بنانے کا آغاز کر دیا۔ ایک طرف سندھ پنجاب میں پانی کی تقسیم اور حصول پر محاذ آرائی تیز ہو گئی تو دوسری طرف پاکستان اور

بھارت کے مابین بھی یہ تنازعہ شدت اختیار کر گیا۔

عالمی بینک کی مداخلت اور کوششوں کے نتیجے میں ۱۶ ستمبر ۱۹۶۰ء کو پاکستان اور بھارت کے درمیان ''سندھ طاس معاہدہ'' طے پا گیا جس کے تحت جہلم' چناب اور دریائے سندھ پاکستان کو ملے اور ستلج' بیاس اور راوی بھارت کے حصے میں آئے۔ پاکستان کو بھارت' عالمی بینک اور دیگر ذرائع سے آبی اصلاحات کی مد میں ۳۱۵ ملین ڈالر کی خطیر رقم بھی دی گئی اور یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ اپنی حدود میں کھل کر آبی منصوبوں پر کام کر سکتا ہے۔

ون یونٹ کے زمانے ۱۴ اکتوبر ۱۹۵۵ء سے ۲۸ نومبر ۱۹۶۹ء تک زمانہ سندھ کے لئے محرومیوں کا زمانہ قرار پایا۔ عالمی بینک کے ذریعے معاملہ فہمی کے زمانے ہی میں جونہی ون یونٹ قائم ہوا' سندھ کا نمائندہ ڈاکٹر محمد صالح قریشی واپس بلا لیا گیا تو سندھ کی شکایات بڑھتی ہی چلی گئیں۔ سندھ کی شکایات ٹھنڈی کرنے کے لئے "WATER ALLOCATION AND RATES COMMITTEE" بنائی گئی جس کا سربراہ سابق گورنر مغربی پاکستان اختر حسین کو بنایا گیا۔ پھر جب ون یونٹ کے خاتمے کا اعلان ہوا تو یہ کمیٹی اپنی افادیت کھو بیٹھی اور صدر پاکستان یحیٰی خان نے صوبوں کے آبی تنازعات نمٹانے کے لئے ''جسٹس فضل اکبر کمشن'' قائم کیا مگر یہ کمشن بھی صوبوں کے آبی تنازعات طے کرنے میں ناکام رہا۔ کئی کمیٹیاں بنیں اور کئی کمشن قائم ہوئے مگر پانی کی تقسیم کا معاملہ ایک مستقل تنازعہ ہی رہا۔ کبھی یہ مسئلہ مرکز کی سرد مہری اور مصلحت آمیز رویوں کا شکار رہا تو کبھی صوبے ایک دوسرے کے موقف سے متفق نہیں ہوئے' یوں تقسیمِ ہند سے قبل صوبوں کے مابین اور تقسیم کے بعد نوزائیدہ مملکتوں کے درمیان باعثِ نزاع بننے والا یہ معاملہ باون برس بعد بھی ایک سنگین نوعیت کے مسئلے کی شکل میں ملک اور قوم کے سامنے ایک سوالیہ نشان لئے کھڑا ہے۔

پروفیسر جاوید چانڈیو کی تحقیق کے مطابق جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو مغربی پاکستان جو اِس وقت کے نقشے پر پورا پاکستان ہے' میں ۲۹ ملین ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا جس کی آبپاشی کیلئے دریاؤں میں سالانہ بہنے والے ۱۶۷ ملین ایکڑ فٹ پانی میں سے صرف ۶۷ ملین ایکڑ فٹ پانی کو فصلوں کیلئے بروئے کار لایا جا رہا تھا۔ یوں فی ایکڑ دو ایکڑ فٹ سے زائد پانی میسر تھا۔ زیر استعمال وسائل آبپاشی میں سے سندھ' بلوچستان' پنجاب (متحدہ) اور سرحد کا حصہ بالترتیب

۲۷ء۱۶ ملین ایکڑ فٹ ۴۸ء۳۶ ملین ایکڑ فٹ اور ۲۷ء۳ ملین ایکڑ فٹ تک محدود تھا۔ چار اہم فصلوں گندم، چاول، گنا اور کپاس کی پیداوار بالترتیب ۳ء۳ ملین ٹن، صفر اعشاریہ سات ملین ٹن، ۴ء۵ ملین ٹن اور ۱ء۱ ملین گانٹھوں پر مشتمل تھی۔ ملکی آبادی ۵ء۳۱ ملین افراد جبکہ فی کس زیر کاشت رقبہ لگ بھگ ایک ایکڑ اور فی کس پانی ۵۰۰ء۵ کیوبک میٹر کی رینج میں تھا جبکہ بجلی صرف ۶۰ میگا واٹ تک محدود تھی۔

دھیرے دھیرے وسائل آبپاشی کی ترقی سے بجلی کی مقدار ۲۰ ہزار میگا واٹ، آبپاشی وسائل ۱۱۴ ملین ایکڑ فٹ اور قابل کاشت رقبہ ۵۷ ملین ایکڑ سے بھی تجاوز کر گیا۔ وسائل آبپاشی کی ترقی میں اہم حصہ اور کردار منگلا اور تربیلا ڈیم کا تھا جس کی بنا پر سندھ، بلوچستان، پنجاب اور سرحد کا سالانہ نہری پانی کا حصہ بھی بڑھتا ہوا بالترتیب ۴۸ء۷۶ ملین، ۸۷ء۳ ملین، ۹۴ء۵۵ ملین اور ۸۷ء۵ ملین ایکڑ فٹ تک جا پہنچا، جس کی بدولت اہم فصلوں گندم، گنا، چاول اور کپاس کی پیداوار بالترتیب ۲۳ ملین ٹن، ۵۵ ملین ٹن، ساڑھے ۵ ملین ٹن اور ۱۴ ملین بیلز سے تجاوز کر گئی لیکن اسی اثنا میں آبادی میں وسائل کی نسبت زیادہ اضافہ ہوا اور ملکی آبادی کا گراف ۱۶ کروڑ کے ہندسہ سے جا ٹکرایا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ۱۹۷۴ء میں تربیلا کی تکمیل کے بعد سے کوئی نیا ڈیم معرض وجود میں نہ آ سکا جس کی وجہ سے قابل کاشت بنجر رقبہ کی بحالی مکمل رک گئی۔

ہمارے آبپاشی وسائل گزشتہ چند برسوں سے ۱۰۰ ملین ایکڑ فٹ کے قرب و جوار میں گردش کر رہے ہیں جس سے فی ایکڑ پانی لگ بھگ ڈیڑھ ایکڑ فٹ اور فی کس رقبہ کم ہوتا ہوا آدھے ایکڑ سے بھی کم کی سطح پر آ گیا ہے جبکہ فی کس پانی مارجن پر یعنی ایک ہزار ایک سو کیوبک میٹر کے لگ بھگ ہے۔ قابل کاشت رقبہ اور مجموعی پیداوار میں اضافہ بلاشبہ ڈیموں کا مرہون منت ہوتا ہے اگر نئے ڈیموں کی تعمیر جاری رہتی اور لگ بھگ ہر دس سال بعد ایک مزید ڈیم نظام آبپاشی کا حصہ بنتا جاتا تو زیر کاشت رقبہ اور پیداوار دونوں میں اضافہ کا عمل جاری رہتا ہے۔ برآمدات کی بدولت زرمبادلہ کے ذخائر مزید بڑھتے فی کس آمدنی بھی بلندیوں کی طرف گامزن رہتی اور ملک ۴۶ ملین ڈالر کے بیرونی قرضے کا مقروض اور ۱۷ بلین ڈالر کے تجارتی خسارہ کا شکار ہونے کی بجائے معاشی طور پر مستحکم پوزیشن میں ہوتا۔ لیکن پاکستان کی اشرافیہ کی ملک دشمن چالوں اور اقتدار پر قبضے کی ناجائز روش نے اداروں میں ٹکراؤ کی کیفیت استوار رکھی جس کی وجہ سے ہم مسائل اور

وسائل میں توازن کے اہداف حاصل نہ کر سکے۔

پاکستان کے صوبوں میں پانی کی تقسیم کا مسئلہ یوں تو قیامِ پاکستان ہی سے اختلافِ رائے کا شکار رہا لیکن ۸۰ء کی دہائی میں پانی کی تقسیم کے حوالے سے اس قضیے نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا جب ۱۹۸۵ء میں ''کالا باغ ڈیم'' منصوبے کے حوالے سے ایک نئی بحث کا آغاز ہوا۔ یہ منصوبہ ساٹھ کی دہائی میں تشکیل دیا گیا لیکن ہمیشہ کسی نہ کسی وجہ سے معرض التوا میں پڑ جاتا تھا۔ ۱۹۸۵ء میں جب ایک بار پھر اس کی تعمیر کا معاملہ اٹھا تو ملک کے تین صوبوں سندھ' سرحد اور بلوچستان نے اس منصوبے کو چھوٹے صوبوں کے خلاف سازش قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا۔ اس سلسلے میں حکومت پنجاب کا موقف جس سے وفاق بھی اتفاق کرتا ہے' یہ کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر ملک میں بجلی کے بحران کے خاتمے کا باعث ہوگی اور یہ منصوبہ پورے ملک کے لئے یکساں مفید ثابت ہوگا۔ لیکن دیگر فریقین اس موقف کو مذاق سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔

کالا باغ ڈیم کے مجوزہ منصوبے کے لئے ایک لاکھ ۳۴ ہزار ۱۵۰۰ ایکڑ اراضی درکار ہوگی۔ اس میں سے ۹۹ / ہزار ۱۵۰۰ ایکڑ رقبہ غیر آباد ہے جبکہ اس منصوبے کے لئے جو زرعی زمین زد میں آئے گی اس کا حجم ۲۷ ہزار ۱۵۰۰ ایکڑ ہے جس میں سے ۲۴ ہزار ۱۵۰۰ ایکڑ پنجاب اور صرف ۳ ہزار ایکڑ سرحد سے حاصل کی جائے گی۔ منصوبہ سازوں کا دعویٰ ہے کہ سرحد صرف ۳ / ہزار ایکڑ قابلِ کاشت اراضی دے کر اپنی ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ بنجر زمین آباد کرنے کے لئے آب پاشی کی جدید ترین سہولتوں کا حق دار بن جائے گا۔

کالا باغ ڈیم کے حامیوں کا موقف ہے کہ کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے ۳۶۰۰ / میگاواٹ بجلی ارزاں ترین نرخوں پر پیدا ہوگی جس پر ۰۷ پیسے فی یونٹ لاگت آئے گی۔ اس ڈیم کی تعمیر پر صوبہ سرحد کے جو تحفظات ہیں ان میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی تعمیر سے نوشہرہ ڈوب جائے گا جو سطح سمندر سے ۹۴۰ / فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ کالا باغ ڈیم کی اونچائی ۹۲۵ / فٹ رکھی گئی تھی جو بعد میں ۹۱۵ / فٹ کر دی گئی ' منصوبہ سازوں کے مطابق اونچائی کم کرنے سے نوشہرہ کے ڈوبنے کا خطرہ ٹل گیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کالا باغ کے ارد گرد کا علاقہ چٹانی ہونے کے باعث ڈیم سے سرحد کے علاقوں صوابی' مردان' پبی اور نوشہرہ میں سیم پھیلنے اور زرخیز زمینوں کے برباد ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

۱۹۹۸ء میں جب میاں نواز شریف نے ایک بار پھر کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا اعلان کیا تو اس کی تعمیر کے خلاف ملک بھر میں اودھم مچ گیا۔ پنجاب کے علاوہ تینوں اسمبلیوں نے اس کی تعمیر کو قومی سلامتی کے لئے خطرناک قرار دے کر منصوبہ مسترد کر دیا لیکن ان ہی دنوں سرحد سے تعلق رکھنے والے واپڈا کے دو سابق چیئرمینوں شاہ نواز خان اور شمس الملک نے سرحدی عوام کے تحفظات کو مسترد کرتے ہوئے اسے صوبہ سرحد کے لئے نعمت قرار دیا اور کہا:

''صوبہ سرحد جو پنجاب سے گندم من مانی قیمتوں پر خریدتا ہے' اس ڈیم کی تعمیر کے بعد زرعی اجناس میں نہ صرف خود کفیل ہو جائے گا بلکہ اس قابل ہو جائے گا کہ فاضل اجناس بیچ کر زرِ مبادلہ کما سکے۔ اس ڈیم کی تعمیر کے بعد سرحد کے علاقے ٹانک' بنوں' لکی مروت اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کی ایک لاکھ ۲۵ ہزار ایکڑ بنجر اراضی قابلِ کاشت ہو جائے گی جس سے سرحد کو زرعی اجناس میں پنجاب کی محتاجی سے نجات مل جائیگی۔''

سندھ میں کالا باغ ڈیم کے مخالفین کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ڈیم کی تعمیر کے نتیجہ میں صوبہ خشک ہو جائے گا اور اس سے بالخصوص کچے کا علاقہ بنجر بن جائے گا لیکن منصوبے کے حامی کہتے ہیں کہ کچے کا علاقہ ڈیم کی عدم تعمیر کی وجہ سے تو بنجر ہو سکتا ہے ڈیم بننے سے نہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ دریائے سندھ میں سال کے ۹ ماہ میں لگ بھگ ۲۰ فیصد پانی بہتا ہے جبکہ بقیہ ۳ ماہ کے دوران ۸۰ فیصد' ۳ ماہ میں دریا سیلابی رنگ دکھا رہا ہوگا اور کھڑی فصلوں' انسانوں اور مال مویشیوں کو کچلتا ہوا سمندر کی گود بھر رہا ہوگا جبکہ سال کے باقی نو ماہ میں یہ خشک سالی سے فصلوں' انسانوں اور مال مویشیوں کی جان کے درپے ہوگا۔ گویا دونوں صورتوں میں صورتحال تباہ کن اور بربادی کا سبب ہوگی۔ اس کے برعکس کالا باغ ڈیم کی تعمیر سے دریا میں پانی کے بہاؤ کو پورا سال یکساں کنٹرول کیا جا سکے گا اور ضرورت کے مطابق پانی جب چاہا جیسے چاہا میسر ہوگا۔ دریائے سندھ کی گزرگاہ کا صحیح تعین کر کے سندھ کے قریباً ۱۶ر لاکھ ایکڑ سیلابہ کے رقبے کو دریا کی آماجگاہ سے باہر نکال کر شیلو ویلز کی بدولت میٹھے دریائی پانی سے نسبتاً آسان لاگت پر زیر کاشت لایا جا سکے گا۔ جس سے وہ سیلابوں کے رحم و کرم سے نجات حاصل کر کے پورا سال بھرپور انداز میں حسب منشا فصلیں کاشت کر کے وافر زرعی پیداوار حاصل کر سکیں گے۔

کالا باغ ڈیم کے منصوبے پر جنرل ایوب خان کے دور سے لے کر جنرل پرویز مشرف

کے دور تک پاکستان کی نو حکومتیں اعتماد کی فضا ساز گار نہ بنا سکیں جس کی بدولت یہ ڈیم بتدریج سیاسی مسئلے کی شکل اختیار کرتا گیا۔ ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک اس پر باقاعدہ وفاقی حکومتوں اور سندھ' بلوچستان اور سرحد کی حکومتوں کے مابین ایک جنگ سی چھڑی رہی ہے۔ اب یہ منصوبہ تیکنیکی سے زیادہ سیاسی ہو چکا ہے اور اس کا وجود قومی سلامتی کے لئے مہیب خطرہ بن چکا ہے۔ میری ایک سندھی قوم پرست سے اس منصوبے کے حوالے سے ایک بار بات ہوئی تو اس نے کہا:

''اصل مسئلہ نیت اور اعتماد کا ہے۔ پنجاب کی نیت شروع ہی سے ٹھیک نہیں ہے۔ وہ سندھ کے وسائل پر غاصبانہ قبضہ جمانا چاہتا ہے اور ہم اسے ہرگز ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ وہ ہمارا پہلے ہی پانی چوری کر رہے ہیں اب کالاباغ ڈیم بنا کر ہمارے پانی پر ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں' ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ وفاق' پنجاب کے دباؤ اور مٹھی میں ہے اس لئے اس پر بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ تاریخ گواہ ہے ہم سے جو وعدے کئے گئے وہ کبھی پورے نہیں ہوئے اس لئے اب ہم کیسے بھروسہ کر لیں کہ کالاباغ ڈیم ہمارے فائدے میں بنایا جا رہا ہے۔ ماضی کے تجربوں کی بنیاد پر یہی کہا جا سکتا ہے کہ کالاباغ ڈیم سندھ کی سرزمین کو بنجر کرنے کی سامراجی سازش ہے جسے ہم اپنی جان پر کھیل کر ناکام بنا دیں گے۔''

اس طائرانہ خاکے کے بعد آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہ اتنا سادہ اور آسان مسئلہ نہیں کہ پاکستانی اشرافیہ کی جادوئی چھڑی یا کسی بھی جمہوری یا غیر جمہوری حکومت کی چٹکی سے حل ہو سکے۔ اس کے لئے جس ظرف' رواداری اور حقیقت شناسی کی ضرورت ہے وہ نہ ماضی میں کبھی رہی ہے اور نہ مستقبل میں اس کے امکانات موجود ہیں۔ جس کام میں ہم مخلص نہیں ہوتے' ہم جان چھڑا کر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں مجھے بھی یہ معاملہ اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد کر کے آگے چلنا چاہئے۔



ٹھنڈی شاموں کے شہر میں

ئیں دیرینہ ہمدم دریائے سندھ کا دکھ اپنے دامن میں سمیٹے' اس کے کنارے آباد' حیدرآباد میں داخل ہوا تو جی داروں کے اس شہر نے میرے لئے اپنی وسیع بانہیں پھیلا دیں۔ سرد ہواؤں میں لپٹی ٹھنڈی سرمئی شاموں کے حوالے سے مشہور اس شہر سے میری آشنائی کم وبیش دو عشروں پر محیط ہے۔ میرا' دریائے سندھ کا اور اس شہر کا دکھ سانجھا ہے۔ جب سے دریا کا آبِ رواں اس سے روٹھا ہے' اس شہر سے اس کی ٹھنڈی شامیں بھی روٹھ گئی ہیں۔ کہتے ہیں انگریزوں کے دور میں عروس البلاد کراچی کی سڑکیں روزانہ علی الصباح دھلا کرتی تھیں تو اس شہر کے بارے میں مشہور ہے کہ دریائے سندھ کی موجوں اور روانیوں سے اٹکھیلیاں کرتی ٹھنڈی ہواؤں میں بسی حیدرآباد کی شامیں سارے دن کے جھلسے لوگوں کو ماتا کی مانند اپنی آغوش میں لے لیتی تھیں۔ حیدرآباد کا پہلو اپنی روانیوں سے محروم ہو گیا ہے لیکن اس کی شاموں کا تذکرہ اب بھی خوش گوار اور تازہ ہے۔

اس شہر کے لوگوں نے مجھے بے پناہ اپنائیت دی ہے۔ میں جب بھی اس شہر میں وارد ہوا عثمان اجمیری' یٰسین راہی' اسلم چنہ اور دریا کے اس پار کے مستقیم خان نے اپنے دوستوں کے جلو میں' میرے جیسے کم مایہ انسان کے لئے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کیں۔ میرے رگ وپے ان دوستوں کی محبت کے قرض میں جکڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاس بھی ان دوستوں کو دینے کے لئے دعاؤں اور محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ان احباب کا والہانہ پن' آنکھوں میں تڑپتا اشتیاق اور ان کے دلوں میں موجزن محبت میرا سرمایہ حیات ہے۔ مولا علی کا قول ہے:

''دنیا اس کو یتیم سمجھتی ہے جس کے ماں باپ نہیں ہوتے، مگر میں اس کو یتیم سمجھتا ہوں جس کے اچھے دوست نہ ہوں۔''

اچھے دوست انسان کی زندگی کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ میں نے اپنی پوری صحافتی زندگی میں اس قول کو مشعلِ راہ بنائے رکھا۔ میں نے شہد' اجرک' سندھی ٹوپی' تحائف اور لفافے کی تحریص پالے بغیر سندھ میں صرف اچھے دوست بنائے ہیں جن کی دوستی پر میں آج بھی نازاں ہوں۔ مجھے اپنے اس انتخاب پر کبھی شرمندگی یا پچھتاوا نہیں ہوا۔ مولا علی کے قول نے مجھے بہت ساری رسوائیوں اور جگ ہنسائیوں سے بے نیاز اور محفوظ کر دیا ہے۔ مولا علی کے صدقے' خدا ان دوستوں کو سلامت اور اس سرزمین کو شاد و آباد رکھے۔

میں جب ۱۹۸۶ء میں محراب والا (بہاول پور) سے کراچی کے لئے عازمِ سفر ہوا تھا تو مجھے کچھ عرصہ کے لئے اسی شہر نے پناہ دی تھی۔ میں تقریباً دو مہینے لطیف آباد میں اپنے ایک دوست رفیق بلوچ پلے دار کے شناسا کا مہمان رہا۔ رفیق بلوچ ایک غریب محنت کش تھا اور میرے تازہ عقائد کا حد درجہ معتقد تھا۔ جب میں ۱۹۸۰ء میں صادق عباس کالج احمد پور شرقیہ (بہاول پور) کی یونین کا صدر منتخب ہوا تھا تو رفیق بلوچ نے دو تین سو تانگوں کے ساتھ میرے لئے اعزازی جلوس کا اہتمام کیا تھا۔ ایسا جلوس پھر کبھی ہمارے شہر کے لوگوں کو دیکھنے کو نہیں ملا۔ پھر جب میں اپنے عقائد اور عزائم سے کنارا کشی اختیار کر کے کراچی فرار ہوا تو بھی اس مزدور دوست نے دستِ تعاون کھینچا نہیں بلکہ میرے ساتھ حیدر آباد تک آیا اور اگلے سفر میں اپنی موجودگی کا احساس دلا کر مجھے تنہائی کے کرب سے محفوظ رکھا۔ یہ نیا شہر میرے لئے قطعی اجنبی تھا لیکن اس مختصر قیام میں اس شہر اور میرے درمیان اجنبیت کی ساری دیوا یں زمین بوس ہو گئیں۔ میں تہی دامن اور شکستہ حال تھا۔ دریائے سندھ کے کنارے اس شہر میں رہ کر میں نے اپنے اوسان بحال کئے اور خود کو نئی زندگی جینے پر آمادہ کیا۔ اس شہر نے مجھے جینے کی امنگ دی' میں اس کا تا زندگی احسان مند رہوں گا۔

حیدر آباد کے لاتعداد سپوتوں نے کراچی میں شعر و ادب' ثقافت' صحافت اور افسر شاہی سمیت مختلف شعبوں میں بڑی شہرت کمائی۔ ان میں سے بہت سے لوگ میری طرح بے سروسامانی کے عالم میں کراچی آئے ' اپنے جوہر کی دریافت کے لئے دن رات محنت کی اور پھر اس کی بھیڑ میں گم ہوئے بغیر دھوم مچا دی۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ تھا مگر کوئی طلب یا

تڑپ ضرور تھی جو انہیں روشنیوں کے اس شہر کھینچ لائی۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن سے میرے یارانے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن سے میرا تعلق شناسائی تک محدود ہے اور بیشتر وہ ہیں جو مجھے نہیں پہچانتے یا میں انہیں نہیں جانتا مگر میں ان کا تذکرہ کر دوں تو نامناسب نہیں۔ کراچی کی خوبی کہیے یا دل نشینی' ایک بار جو یہاں آتا ہے یہ شہر اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیتا ہے۔

حیدر آباد کی ٹھنڈی شاموں سے منہ موڑ کر کراچی کے ساحلوں سے ناطہ جوڑنے والوں میں معروف دانشور اور میرے بڑے اخی پروفیسر انوار احمد زئی' جو مجھے دعاؤں اور کتابوں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں' معروف صحافی اظہر عباس' ظفر عباس' مظہر عباس' حبیب خان غوری' مجید عباسی' قاضی اسد عابد' قاضی محمد اسلم' شیخ عزیز' سہیل دانش' الیاس شاکر' مختار عاقل' ادریس بختیار' دی نیشن کے ضمیر شیخ' مومن خان مومن' نصرت مرزا' معین کمالی' رفیق شیخ' ظفر احمد فوٹو گرافر' رشید نیاز المعروف رشید آرٹ' محمد علی خالد' غازی صلاح الدین' عطا محمد تبسم' وفاقی سیکرٹری فردوس عالم' سابق سیکرٹری خارجہ نجم الدین شیخ' پی ٹی وی کی رعنا نجم الدین شیخ' سابق کمشنر کراچی شفیق الرحمن پراچہ' ڈائریکٹر انفارمیشن شجاعت علی' گورنر سندھ کے پریس سیکرٹری وجاہت علی' سابق چیف انجینئر ہائی ویز شفیق اعوان' سابق چیف سیکرٹری سندھ سعید احمد صدیقی' ان کے چھوٹے بھائی جاوید احمد صدیقی' سابق ایڈووکیٹ جنرل یوسف لغاری' شہید منور سہروردی' متحدہ قومی موومنٹ کے سردار احمد' ان کے بھائی سرفراز احمد' ڈاکٹر عشرت حسین' سابق ایم این اے آفتاب شیخ' مہاجر اتحاد تحریک کے ڈاکٹر سلیم حیدر' صالح فاروقی' برکات رضوی' کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے سابق ایم ڈی غلام عارف خان' جسٹس (ر) مجید خانزادہ' انسدادِ دہشت گردی کی عدالت کے جج ارشد نور خان' شعیب وقار' سائیٹ کراچی کے سیکرٹری سمیع صدیقی' سہیل راجپوت' نرگس گھلو' سابق ایڈیشنل سیکرٹری فنانس رضوان احمد کے علاوہ آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے روحِ رواں سیف الرحمن گرامی' رضوان صدیقی' ڈرامہ نگار عبدالقادر جونیجو' ضیاالاسلام زبیری' محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر شامل ہیں۔ اور ہاں معروف گلوکار احمد رشدی بھی تو حیدر آباد سے تھے اور پھر کراچی چلے آئے۔ اداکار محمد علی بھی حیدر آباد سے کراچی منتقل ہوئے اور پھر لاہور سدھار گئے۔ بی بی سی کے قمر احمد کا ذکر بھی تو ضروری ہے۔ حیدر آباد میں پلے بڑھے اور گریجویشن کر کے گوروں کے دیس جا آباد ہوئے اور اب ۴۴ برس بعد وطن پلٹے ہیں تو کراچی کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

سندھ کے پہلے وزیرِ اعلیٰ اور پہلے مسلمان گورنر شیخ غلام حسین ہدایت اللہ شکار پور میں پیدا ہوئے' حیدر آباد میں وکالت کرتے رہے' حیدر آباد لوکل بورڈ کے نائب صدر بھی رہے' پھر کراچی آ گئے' یہیں عمر بتائی اور یہیں وفات پائی۔ پکا قلعہ میں قائم ان سے منسوب ایک اسکول آج بھی ان کے حیدر آباد میں طویل قیام کی یاد دلاتا رہتا ہے۔ قائداعظم کے ابتدائی مادرِ علمی سندھ مدرستہ الاسلام کے بانی حسن علی آفندی کا تعلق بھی حیدر آباد سے تھا' وہ بھی کراچی آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ڈی جے سائنس کالج کے بانی دیوان دیارام جیٹھامل بھی حیدر آباد سے کراچی آ گئے تھے۔ عہدِ حاضر کے معروف مورخ ڈاکٹر مبارک علی کا تعلق بھی حیدر آباد سے تھا۔ وہ سندھ یونیورسٹی میں معلم تھے' اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونِ ملک گئے تو واپسی پر وائس چانسلر غلام مصطفیٰ شاہ نے ان کی خدمات قبول نہیں کیں تو پھر وہ لاہور منتقل ہو گئے۔ حیدر آباد کے روشن دماغ لوگ ''کسی چمن میں رہو تم بہار بن کے رہو'' کے مصداق' جہاں بھی رہے بہار بن کر رہے۔

یہ فہرست کسی طور سے بھی مکمل نہیں' مزید سیکڑوں لوگ ہیں جنہوں نے حیدر آباد سے کراچی یا ملک کے دوسرے شہروں اور بیرون ملک جا کر نام کمایا۔ یہ اور ان جیسے بے شمار لوگ حیدر آباد سے کراچی آئے' آ کر چھا گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بس آنا جانا لگا رہتا ہے۔ یہ میرے دوستوں اور شناساؤں کا شہر ہے' یہ میرا شہر ہے۔ یہ شہر سندھ کے شہروں میں اپنی مثال آپ ہے۔ صحرائے تھر جاتے ہوئے یہاں سے گزر ہوا ہے تو لگے ہاتھوں حیدر آبا کی تاریخ کا طائرانہ جائزہ لے لیا جائے تو یہ بھی بہت مناسب ہو گا۔

اس شہر کی تاریخ مقدونیہ سے دنیا کو فتح کرنے کا عزم لے کر نکلنے والے عظیم سپہ سالار سکندر اعظم کی ۳۲۷ سال قبل مسیح سندھ آمد کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہاں پہلی بار بستی اسی زمانے میں بسائی گئی تھی۔ دستیاب تاریخ کے مطابق دریائے سندھ کے کنارے گنجو ٹکر نامی ٹیکری پر جو پہلی بستی وجود میں آئی اسے ''رون'' ''ارون'' اور پھر ''ارون پور'' کے نام سے موسوم کیا گیا اور غالباً اسے سکندر اعظم کے ایک کارندے نے بسایا تھا۔ اس کے بعد تاریخ ایک طویل مدت کے لئے خاموشی کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔ ہزاروں سال بعد پھر یہی جگہ ''پٹالہ'' ''پٹال پور'' اور پھر ''پٹالہ بندر'' کے نام سے تاریخ کے اوراق میں جگہ بنا لیتی ہے۔ بستیوں اور شہروں کے وجود تہذیبوں کے مستقبل سے جڑے ہوتے ہیں۔ تہذیبیں کروٹ لیتی ہیں' اتھل پتھل میں ہنستے بستے

رنگوں اور روشنیوں میں کھلتے شہر دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے ''گنجوٹکر'' ٹیکری پر قائم اس شہر نے بھی ہزاروں برسوں میں کئی جنم لئے۔ یہ کئی بار بسا اور اجڑا مگر اس کے مقدر میں دائمی زندگی لکھی تھی اور اسے ایک روز حیدرآباد کے نام سے جدید شہر کا روپ دھارنا تھا۔

سکندر اعظم نے جب ارضِ مہران پر دھاوا بولا تو اس وقت سندھ پر بدھ مت کا پیروکار حکمران برسرِ اقتدار تھا۔ امن وآشتی کے داعی بدھ حکمران نے آگ اور شعلے اگلتے اس طوفان سے الجھنے کی بجائے اسے گلے لگانے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔ کئی مورخین نے خیال آرائی کی ہے کہ چونکہ اس شہر کے پہلو سے عظیم دریا سندھ گزرتا تھا لہٰذا یہاں کسی زمانے میں بندرگاہ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے زمانہ قدیم میں پٹالہ بندر کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ مورخین کے مطابق پٹالہ بندر بڑا کاروباری مرکز اور تجارتی گیٹ وے تھا جہاں سے مشرقِ وسطیٰ، خلیج فارس، مصر، سیلون، انڈیمان، مالدیپ، سنگاپور اور کئی ممالک کو سامان تجارت کی ترسیل ہوتی تھی۔ ایک وقت آیا کہ یہ شہر ایک بار پھر تاریخ کے دھندلکوں میں کھو گیا۔ وقت نے اس شہر کو پھر ایک کچوکہ لگایا اور ایک بار پھر یہ صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

میری متجسس نگاہیں تاریخ کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہیں۔ میں اس کے نئے جنم کی تلاش میں ہوں۔ مورخ علامہ شمس الدین محمد بن محمود میری مدد کو آتے ہیں، انہوں نے اپنی تصنیفات ''نزہتہ الارواح'' اور ''روضتہ الافراح فی تواریخ الحکما المتقدمین والمتاخرین'' کے صفحات میرے سامنے پھیلا دیئے ہیں۔ انہوں نے اس شہر کو ''نیرون'' بیرون، مدینۃ السند لکھا ہے۔ مورخ اور معروف جغرافیہ دان ابوالفدا نے سندھ کے اس قدیم اور تاریخی شہر کو ''بیرون'' اور علامہ بلاذری نے اپنی کتاب ''فتوح البلدان'' میں اسے ''باالنون'' سے موسوم کیا ہے۔ ان سب نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں میں اس شہر کی نئی شناخت کو کیا نام دوں۔ اچانک میرے سامنے دو گورے مستند تاریخ دان اور محقق کپتان میکمر وڈ اور سر چارلس ایلیٹ نمودار ہوتے ہیں۔ انہوں نے برِصغیر کی تاریخ کھوجنے میں برسوں عرق ریزی کی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس شہر کے حوالے سے بھی بے پناہ تحقیق کی ہے۔ وہ مجھے متفقہ رائے دیتے ہیں کہ یہ ''بیرون'' نہیں ''نیرون'' ہے۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ اس شہر پر نیرون سندر سمنی نامی شخص حکومت کرتا تھا،

جس نے اپنے نام سے اس شہر کو نیا جنم دیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ چونکہ یہ شہر ایک وسیع وعریض قلعہ میں محدود تھا اور سندھ میں قلعہ کو کوٹ کہتے ہیں' اس لئے اسے نیرون کوٹ کا نام دیا گیا۔

دریائے سندھ کے کنارے ٹیکری پر قائم ہونے والی بستی رون نے پٹالہ سے پٹالہ بندر اور پھر پٹالہ بندر سے نیرون کوٹ کا روپ کب اور کیسے دھارا؟ مورخین نے میرے سوال کے جواب میں اپنی بے بسی کا اظہار کر دیا ہے البتہ نیرون کوٹ کے ذکر پر ان کی آنکھوں میں چمک آ گئی ہے' اس کے بارے میں مورخین نے بتایا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں رائے خاندان کا رائے سیمرس ماہی اس علاقے کا حاکم تھا۔ اس شہر کی حکمرانی برہمن آباد کے گورنر کے دائرہ اختیار میں تھی۔ ساتویں صدی عیسوی کے آخری عشرہ میں راجہ داہر نے نیرون کوٹ کا حاکم سندر سمنی کو مقرر کیا۔ یہ حاکم بدھ مت کا پیروکار تھا۔ اس قلعہ کی تجارتی' تاریخی اور فوجی اہمیت تھی اس لئے راجہ داہر کا بیٹا جیسنا اکثر یہاں دورے کیا کرتا تھا۔ دریائے سندھ کے کنارے ٹیکری پر واقع ہونے اور ارد گرد کی شادابی کی وجہ سے نیرون کوٹ کا قلعہ بڑا دلفریب منظر پیش کرتا تھا۔ اس وقت دریا گنجوٹکر کے مشرق میں بہتا تھا اور اس طرح اس کے مغرب میں خشکی تھی۔ مورخین نے مجھے بتایا ہے کہ اس کا جو حصہ نشیب میں تھا' وہاں وسیع وعریض خوبصورت جھیل تھی۔ جسے رنگ برنگے پھولوں کی طویل کیاریاں اپنے حصار میں لئے رہتی تھیں۔

آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم سندھ وارد ہوا تو دیبل فتح کرنے کے بعد جب ۷۱۲ء میں نیرون کوٹ کی طرف بڑھا تو یہاں بروری کے قریب خوبصورت چراہ گاہ ''بلہار'' کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ محمد بن قاسم کی جانب سے نیرون کوٹ پر دھاوے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اس وقت کے حاکم بدھ رکھیو کے ایک طرف تو حجاج بن یوسف کے ساتھ دیرینہ مراسم اور مراسلت تھی' دوسرا وہ بدھ مت کا پیروکار تھا' اسے مذہبی طور پر انسانی خون بہانے کی ممانعت تھی۔ اپنے عقائد اور حجاج بن یوسف کی دوستی کے ''احترام'' میں اس نے جنگ کئے بغیر نیرون کوٹ کی چابی جواں سال عرب سپہ سالار کو پیش کر دی۔

محمد بن قاسم نے نیرون کوٹ کے قلعہ میں جامع مسجد تعمیر کرائی اور یوں یہاں اسلامی دور کا آغاز ہوا۔ محمد بن قاسم کی آمد کے صرف پچیس سال بعد نیرون کوٹ کے شمال مشرق میں برہمن آباد کے قریب ساٹھ کلومیٹر دور ''دلور'' کے مقام پر ایک نئے پایہ تخت ''منصورہ'' کی بنیاد رکھی گئی جس

کے آثار آج بھی ضلع سانگھڑ کی تحصیل سنجھورو میں موجود ہیں۔ منصورہ کی تعمیر و ترقی نے وقتی طور پر، کسی حد تک نیرون کوٹ کی اہمیت کو متاثر کیا مگر نیرون کوٹ تاریخ کے افق پر تابندہ ستارے کی طرح ہمیشہ چمکتا رہا۔ نیرون کوٹ پر عربوں کی حکومت طویل مدت تک قائم رہی۔ وہ یہاں ۷۱۲ء سے ۱۰۴۶ء تک کم و بیش تین سو سال تک برسرِ اقتدار رہے۔ تین صدیوں بعد اس شہر کا اقتدار محمود غزنوی کے قبضے میں آ گیا اور اگلے چالیس برسوں تک یہاں محمود غزنوی کے نمائندے مقرر رہے۔ پھر اس شہر کا انتظام دہلی تخت کے تابع چلا گیا۔ محمد بن قاسم کے ۷۱۲ء میں نیرون کوٹ پر کنٹرول کے بعد سے ۱۷۰۱ء تک لگ بھگ ایک ہزار سال میں یہاں عربوں کے علاوہ غزنوی، غوری، شاہان غلام غلاماں، خلجی، سومرو، سمہ، ارغون، ترخان، مغل اور کلہوڑا خاندان برسرِ اقتدار رہے۔

گنجو ٹکر سے حیدر آباد تک کا ہزاروں سال کا سفر اور وجود اس شہر کی مستقل اقتصادی اور تاریخی اہمیت و افادیت کا گواہ ہے۔ ۱۶۱۲ء میں نیرون کوٹ پر مغلوں نے اپنا تسلط جما لیا۔ ۱۷۰۱ء تک یہاں براہِ راست مغلوں کا راج رہا۔ اسی دور میں جب حیدر قلی نامی قلعہ دار مقرر ہوا تو اس نے اس قلعہ کی از سرِ نو تعمیر کرائی اور اسے اپنے نام سے جوڑ دیا۔ سترہویں صدی کے اواخر میں نیرون کوٹ کو حیدر آباد کی شناخت مل گئی۔ نیا نام اس شہر کے لئے بڑا اسعد ثابت ہوا۔ نام بدلتے ہی یہ شہر طلسماتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا اور آبادی قلعہ سے باہر نکل کر اطراف میں بھی پھیل گئی۔ لیکن مستند روایات اس شہر کی نئی شناخت کے حوالے سے کچھ اور کہتی ہیں۔

روایات میں ہے کہ نیرون کوٹ کو حیدر آباد کا نام میاں غلام شاہ کلہوڑا نے ۱۷۶۸ء میں حضرت علیؑ کے صفاتی نام حیدر پر دیا تھا۔ اسی سال پکا قلعہ کی بنیاد رکھی گئی اور قرآنی فال نکالی گئی تو آیت نکلی ''یارب اجعل ھذا البلادالامنا'' جس کا مفہوم ہے ''اے اللہ! تو اس شہر کو امن کا گہوارا بنا۔'' قلعہ کی تعمیر مکمل ہونے پر یہ آیت سنگِ مرمر کی تختی پر کندہ کر کے مرکزی دروازے پر آویزاں کر دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قلعہ دو ماہ کی قلیل مدت میں تعمیر ہوا لیکن بعض مورخین کہتے ہیں کہ یہ قلعہ پہلے سے موجود تھا، میاں غلام شاہ کلہوڑا نے اسے صرف وسعت دی اور اس کی تزئین و آرائش کی۔ حیدر آباد پکا قلعہ کا قطر ایک میل اور سطح سمندر سے بلندی ۸۰ فٹ ہے۔ اس کی تعمیر ملتان کے معروف انجینئر استاد شفیع محمد کی نگرانی میں مکمل ہوئی۔

حیدر آباد کو نیا نام کس نے دیا، پکا قلعہ پہلے سے موجود تھا یا اسے غلام شاہ کلہوڑا نے تعمیر

کرایا؟ اس بحث میں الجھے بغیر یہ طے ہے کہ حیدرآباد کو صحیح معنوں میں ترقی اور اہمیت کلہوڑوں کے دور میں ملی۔ دہلی تخت نے ۱۷۰۱ء میں اس شہر کا نظم و نسق کلہوڑا سردار میاں یار محمد کے ہاتھ دیا تھا۔ کلہوڑے داخلی طور پر خود مختار اور خارجی طور پر مغلوں کے تابع تھے۔ ۱۷۶۲ء میں جب میاں غلام شاہ کلہوڑا نے حیدرآباد کی باگ ڈور سنبھالی تو اس شہر کی تقدیر بدل کر رکھ دی۔ اس نے اس شہر کی تعمیر و ترقی میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اسے ایک جدید شہر کا روپ دے دیا۔ موجودہ حیدرآباد شہر میاں غلام شاہ کلہوڑا کی ترقی پسند پالیسیوں کا ہی ثمر ہے۔

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے ۱۷۶۸ء میں میاں غلام شاہ کلہوڑو کے ہاتھوں اس قلعہ کی تعمیرِ نو تک یہ شہر زیادہ تر گمنامیوں کے اندھیروں میں کھویا رہا لیکن آبی گزرگاہ، تاریخی اور تجارتی اہمیت کے پیشِ نظر عالموں، تاجروں، سیاحوں اور محققین کے لئے سدا پرکشش رہا جس کے باعث کسی نہ کسی شکل میں زندگی اس کا مقدر بنی رہی۔ اسلام کی سندھ میں آمد کے بعد مختلف ادوار میں کئی صوفیا نے بھی اس شہر کو اپنی تعلیمات سے فیض یاب کیا۔

حیدرآباد میں تین قلعوں کے آثار پائے جاتے ہیں، ایک تو یہی پکا قلعہ ہے جس کا تفصیلی ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ دوسرا قلعہ غلام شاہ کلہوڑا کا مدفن ہے جو حیدرآباد قلعہ کی تعمیر کے چار سال گزرنے پر ۱۷۷۲ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے میاں سرفراز شاہ نے شہر کے شمال میں گنجو ٹکر کے سرے پر تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ بھی فنِ تعمیر کے حوالے سے خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ تیسرا کچا قلعہ ہے جو پکا قلعہ کے مغرب میں سطح سمندر سے ۲۵ فٹ کی بلندی پر ٹیکری پر موجود ہے۔ اس کی دیواریں مٹی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔ اس کے نو برج ہیں جو قلعہ کی دیواروں سے ملے ہوئے ہیں۔ قلعہ کے اندر مکی شاہ باباؒ کا مزار اور چند نامعلوم لوگوں کی قبریں ہیں۔ ایک بزرگ شاہ محمد مکی المعروف مکی شاہ باباؒ ۱۱۶۹ء میں عرب سے یہاں حاکم بن کر آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ آپ دُرویش صفت انسان تھے، جن کی تمام زندگی انسانیت کی بھلائی میں خرچ ہو گئی۔ مکی شاہ باباؒ کی دعاؤں اور شفقتوں کے طفیل اس شہر کو عظمت و شہرت نصیب ہو گئی۔ قلعے اور قلعہ دار صفحۂ ہستی سے مٹ گئے لیکن اللہ کے اس برگزیدہ بندے کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے۔ ہر سال ذوالحج میں آپ کے مزار پر میلہ لگتا ہے جس میں حیدرآباد کے علاوہ دور دراز سے ہزاروں زائرین شرکت کرتے ہیں اور آپ کی انسان دوستی کو ہدیہ سلام پیش کرتے ہیں۔

میاں غلام شاہ کلہوڑا نے حیدرآباد کو بسانے میں اہم کردار ادا کیا اور دور دراز سے ہنر مندوں، کاریگروں، تاجروں اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل افراد اور خاندانوں کو لا کر یہاں آباد کیا۔ اس کی وفات کے بعد حیدرآباد کے اقتدار پر کلہوڑوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ میاں غلام شاہ کا بیٹا میاں سرفراز کلہوڑا نا تواں حکمران ثابت ہوا۔ اسے حیدرآباد راس نہیں آیا تو اس نے اپنا پایہ تخت دادو کے قریب خدا آباد منتقل کر دیا۔ بعد میں جب تالپوروں نے کلہوڑوں کو شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تو انہوں نے دارالحکومت ایک بار پھر حیدرآباد منتقل کر دیا۔ اس طرح اس شہر سے ہتھیائی گئی اس کی اہمیت چند برسوں ہی میں دوبارہ مل گئی۔

کلہوڑا خاندان کا آخری حکمران سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی لپیٹ میں آ گیا۔ داخلی بحران نے اقتدار پر اس کی گرفت کمزور کر دی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک تو سماج میں بے چینی پھیل گئی، دوسرا احمد شاہ اور نادر شاہ کے حملوں نے رہی سہی کسر پوری کی اور سندھ ایک بڑے معاشی بحران سے دوچار ہو گیا۔ کلہوڑے کمزور پڑے تو تالپوروں نے سر اٹھایا اور ۱۷۸۳ء میں سندھ کے اقتدار پر غلبہ حاصل کر لیا۔ میر فتح علی خان تالپور نے ۱۷۸۹ء میں خدا آباد سے پایہ تخت دوبارہ حیدرآباد منتقل کر دیا۔ اس نے حیدرآباد قلعہ کی تعمیرِ نو کرائی اور شہر کو نئے اور جدید انداز سے وسعت دی۔ اس کے دور میں حیدرآباد میں دور دراز سے لوگ آ کر بسنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہنر منداور دوسرے پیشہ ور صلاحیتوں کے حامل خاندان بھی خدا آباد سے ترکِ سکونت اختیار کر کے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ میروں کا اقتدار ۱۷۸۳ء سے لے کر ۱۸۴۳ء تک قائم رہا، اس دوران میر فتح علی خان تالپور، اس کے تین بھائی میر غلام علی خان تالپور، میر کرم علی خان تالپور، میر مراد علی خان تالپور کے علاوہ میر نور محمد خان تالپور، میر نصیر خان تالپور حیدرآباد میں حکمراں رہے۔ میروں نے چویاری سلطنت کی بنیاد رکھی یعنی چاروں بھائی مل کر حکومت کرتے تھے۔ ان ساٹھ برسوں میں اس شہر نے انقلابی تبدیلیاں دیکھیں اور ترقی اور عروج اس کا مقدر بنے رہے۔ میر نور محمد خان کے دور میں انگریز حیلوں بہانوں سے اپنی افواج سندھ میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر میر نصیر خان تالپور کے دور میں حیدرآباد کا اقتدار مکمل طور پر ان کے ہاتھ آ گیا۔ اس کشمکش میں تالپور خاندان کے بعض غداروں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ اس حوالے سے سندھ میں ایک کہاوت ''میروں کو آگ، ان کے اپنے گھر سے لگی'' بھی مشہور ہے۔ جب کسی کو اپنے دوست عزیز سے زک

پہنچتی ہے تو اس کہاوت کو دہرایا جاتا ہے۔

سندھ پر ہلہ بولنے والے دیگر حملہ آوروں کے برعکس انگریزوں کا طریقہ واردات کچھ الگ تھا۔ ابتدا میں وہ تاجروں کے بھیس میں آتے تھے اور پھر تحریص و ترغیب اور سازشوں کے جال بچھا کر مقامی حکمرانوں کو اس میں الجھاتے' جب دشمن کمزور ہو جاتا تو پھر کاری ضرب لگا کر اسے کہیں کا نہ چھوڑتے۔ انگریز پہلے پہل ۱۶۳۵ء میں سندھ میں وارد ہوئے اور ٹھٹھہ میں پہلی تجارتی کوٹھی قائم کی۔ شروع شروع میں وہ سندھ سے قلمی شورہ خرید کر انگلستان برآمد کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ۱۶۶۲ء میں یہ تجارتی کوٹھی بند کر دی گئی لیکن جب وہ برِصغیر کے دوسرے علاقوں پر دسترس حاصل کر چکے تو انہوں نے ایک بار پھر سندھ پر اپنی نظریں گاڑ لیں۔ کلہوڑا دور میں وہ دوبارہ وارد ہوئے اور میروں کے دور میں سندھ کے سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔ سندھ پر قبضے سے ایک تو انہیں بڑی تجارتی منڈی ہاتھ آ گئی دوسرا ایک بڑی آبی گزرگاہ قابو میں آنے سے شمالی علاقوں تک ان کی رسائی آسان ہو گئی۔

کراچی پر انگریز ۱۸۳۹ء میں غلبہ حاصل کر چکے تھے۔ سر چارلس نیپئر کے ۱۸۴۳ء میں سندھ پر مکمل قبضے کے بعد انگریزوں نے ابتدائی کچھ برسوں میں تو حیدر آباد کی سماجی ترقی پر خاص توجہ دی اور یہاں اسکول' شفا خانے' مسافر خانے اور کئی ایک اہم تعمیرات کو وجود دیا۔ انہوں نے یہاں بلدیاتی اور ریلوے نظام قائم کیا' نہری نظام کو بھی جدید خطوط پر استوار کیا گیا' عدالتی اور پولیس کے نظام بھی قائم کئے گئے۔ پھر بتدریج ان کی توجہ حیدر آباد سے ہٹ گئی اور وہ ساحلی شہر کراچی کی تعمیر و ترقی میں جت گئے۔ چونکہ یہاں بندرگاہ تھی اس لئے گوروں نے کراچی کو اپنی تجارتی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے حیدر آباد مسلمان اکثریت کا شہر تھا لیکن نئے حکمرانوں نے ایک حکمت عملی کے تحت اس شہر کی نسلی اور سماجی ہیئت بدل کر رکھ دی اور بہت کم مدت میں اس شہر میں سیاسی' سماجی اور اقتصادی طور پر ہندو غالب آ گئے۔ اپنے دور میں ہندوؤں نے بھی حیدر آباد شہر کی تعمیر و ترقی میں اہم کردار کیا اور یہاں ہر وہ مثبت کام کیا جس سے ایک متمدن شہر کی شناخت بنتی ہے۔

سندھ میں نارتھ ویسٹرن ریلوے کے عنوان سے ریلوے کا منصوبہ ۱۸۵۸ء میں دیا گیا' اس کے اصل محرک کمشنر سر ہنری ایڈورڈ فریئر تھے۔ ابتدا میں کراچی سٹی تا کوٹری ۱۰۵ میل لمبی

ریلوے لائن بچھائی گئی اور ۱۳۶۱ء میں عوام کو سفری سہولت فراہم کردی گئی۔ ۱۸۹۷ء میں اس منصوبے میں توسیع کر کے ریلوے لائن کراچی بندرگاہ تک لے جائی گئی۔ جب پاکستان بن گیا تو نارتھ ویسٹرن ریلوے کو پاکستان ریلوے کا نام دے دیا گیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد حیدرآباد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تقسیمِ ہند کے نتیجے میں ہندو اکثریت بھارت چلی گئی جبکہ بھارت سے کھوکھراپار کے راستے ہجرت کر کے آنے والے لاکھوں مسلمان حیدرآباد آ کر بس گئے۔ لٹے پٹے اور بے سروساماں مسلمان اس شہر میں آئے تو حیدرآباد اور اس کے باسیوں نے جی جان سے انہیں خوش آمدید کہا۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دنوں میں جب کراچی نوزائیدہ مملکت کا دارالحکومت تھا تو ان دنوں حیدرآباد سے کچھ دنوں تک سندھ کا نسق و نظم چلایا جاتا رہا اور غالباً سندھ اسمبلی کا ایک اجلاس بھی دربار ہال کمشنر دفتر میں ہوا تھا۔ بعد میں اسے ضلعی صدر مقام کی حیثیت حاصل رہی اور جب ملک میں کمشنریاں وجود میں آئیں تو اسے ڈویژن کا درجہ حاصل ہو گیا۔ گنجوٹکر سے حیدرآباد تک ہزاروں سالہ سفر کے بعد یہ شہر عہدِ حاضر میں بلحاظِ آبادی سندھ کا دوسرا بڑا اور ملک کا چوتھا بڑا شہر بن چکا ہے۔

میں مزید کسی تفصیل میں نہیں پڑنا چاہتا۔ برسبیلِ تذکرہ مجھے جو کہنا چاہئے تھا وہ میں کہہ چکا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا ہے۔ مجھے حیدرآباد کی تاریخ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ہاتھ آ گئی ہیں جو بزرگ مورخین کے توسط سے میں نے آپ کی نذر کر دی ہیں۔ میں نے بڑھ کر علامہ شمس الدین محمد بن محمود، علامہ بلاذری، ابوالفدا، ابواسحٰق اصطخری، ابن دموقل، شمس العلما مرزا قلیچ بیگ، علی شیر قانع ٹھٹھوی، غلام رسول مہر کی قدم بوسی کی، رہنمائی پر ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کپتان میکمرڈو اور سر چارلس ایلیٹ، ڈبلیو جے اسمتھ سے مصافحہ کر کے ان کا بھی شکریہ ادا کیا اور رخصت چاہی۔ یہ گورے بھی غنیمت ہیں، لاکھ برے سہی لیکن جہاں بھی گئے وہاں کی زندگی کے سارے رنگ محفوظ کرتے چلے گئے۔ ہمیں اپنا ماضی جاننے کے لئے ان ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے۔



''مر ویسوں پر سندھ نہ ڈیسوں''

میں ٹھنڈی شاموں کا شہر اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب میری نگاہوں میں اگلے سفر کے اندازے اور خیالی منظر گردش کر رہے ہیں۔ میں میر پور خاص' ڈگری' جھڈو اور پھر جھڈو کے راستے پنگر یو ضلع بدین کئی بار جا چکا ہوں لیکن جھڈو' نوکوٹ کے راستے تھر جانے کا اتفاق پہلی بار ہو رہا ہے۔ مجھے پنگر یو میں سمن سرکارؒ کے دربار پر کئی بار حاضری کا موقع ملا ہے۔ میرے ذہن میں صحرائے تھر کی ان دیکھی زندگی کے مختلف زاویئے اور تراشے ہیں۔ میں سرخوشی کے عالم میں ہوں کیونکہ ایک نئی دنیا مجھ پر آشکار ہونے جا رہی ہے۔ میری طرح میرے ہمراہی بھی بڑے پر جوش ہیں اس لئے انہیں بھی سفر کی صعوبتوں کی ذرا پروا نہیں۔ ہماری گاڑی رواں دواں ہے' ہمیں ٹنڈو جام' ٹنڈو الہ یار اور میر پور خاص کے راستے اس عظیم صحرا کا رخ کرنا ہے۔

ٹنڈو جام سے گزرتے ہوئے سندھ کی واحد زرعی جامعہ ''ٹنڈو جام زرعی یونیورسٹی'' نظروں میں آئی جو تناور درختوں میں گھری ہوئی ہے۔ ایک زرعی صوبے میں محدود پیمانے پر کام کرنے والی اس یونیورسٹی کا دم غنیمت ہے۔ بہاول پور' ملتان اور ڈیرہ غازی خان ڈویژن ملک کو دوسرے علاقوں کی نسبت سب سے زیادہ گندم' کپاس اور دیگر اجناس دیتے ہیں مگر اب تک وہاں ایک بھی زرعی یونیورسٹی قائم نہیں کی گئی۔ میرا آبائی ضلع بہاول پور' کپاس کی ملکی پیداوار میں ۳۵ فیصد حصہ ڈالتا ہے مگر اس کا اسے اور اس کے لوگوں کو بدل کیا ملتا ہے؟ اس کا جواب بڑا مایوس کن ہے' آپ سے یہ جواب سانجھا کر کے میں اپنی طرح آپ کو بھی دکھی نہیں کرنا چاہتا۔ ملک

کوسب سے زیادہ کاٹن اور گندم دینے والے علاقے کی اکثریت کوتن ڈھانپنے کو کپڑا اور کھانے کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں۔ان کا گناہ یہ ہے کہ وہ سادہ ہیں' سخت محنت کرتے ہیں اور وطن سے بے لوث محبت کرتے ہیں۔لوگ لڑ جھگڑ کر' سودے بازی کر کے' سازش کر کے' سیاست کر کے اپنا ''حق'' وصول کرتے ہیں۔انہیں نہ سیاست آتی ہے اور نہ یہ احتجاج کرنا جانتے ہیں۔انہیں مانگنے کا سلیقہ کبھی آیا ہی نہیں۔مل جائے تو شکر کرتے ہیں' نہیں ملے تو صبر کر کے چپ سادھے رہتے ہیں۔حکمرانوں اور اشرافیہ نے نامنصفانہ نظام قائم کر کے ملک اور قوم کو گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے۔باون سال بعد بھی مملکتِ خداداد پاکستان ایک قوم کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ناانصافیوں نے ہر طرف کدورتیں پھیلا دی ہیں' کشمیر سے کراچی تک یکجہتی کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔

ٹنڈو جام کا ایک اور معتبر تاریخی حوالہ میرے پاس ہے۔۲۴ مارچ ۱۸۴۳ء کو اسی علاقے میں میروں اور انگریزوں کے مابین خوف ناک جنگ (جنگ دوآبہ) ہوئی تھی جس میں میر شیر محمد خان تالپور المعروف ''شیرِ سندھ'' کو اپنوں کی غداری کے سبب شکست ہوئی اور انگریزوں نے میر پور خاص تک اپنا قبضہ جما لیا۔اسی معرکے میں سندھ کے عظیم حریت پسند ہوشو شیدی نے غیر ملکی طالع آزماؤں کے خلاف دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کر کے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔بطلِ جلیل ہوشو میروں کے ساتھ مل کر سندھ کو گوروں کے قبضے سے تو نہ بچا سکا مگر اس نے اپنی زندگی دے کر اپنے نعرے ''مرویسوں پر سندھ نہ ڈیسوں'' (مر جائیں گے مگر سندھ دھرتی غیروں کے حوالے نہیں کریں گے) کی لاج رکھ لی۔(دھرتی کے یہ دونوں سپوت سرائیکی تھے۔) یہ تاریخی معرکہ ٹنڈو جام کے قریب ناریجوں کے گوٹھ میں پیش آیا۔اس سرزمین پر ہوشو کی للکار اور انگریزوں کی چیخ و پکار کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔''نعرہ سندھ' جئے سندھ''۔کوئی جیت کر ہار گیا اور کسی نے ہار کر بھی بازی مار لی۔ہوشو امر ہے' امر رہے گا۔

میں نے چشمِ تصور سے دیکھا' زخموں سے چُور ہوشو کی زبان پر ورد جاری ہے۔وہ اب تلوار اٹھانے کے قابل نہیں رہا مگر اس نے مر کر بھی اپنی تلوار دائیں ہاتھ میں مضبوطی سے دبوچ رکھی ہے اور اس کی جبین پر وطن سے انمٹ محبت کی داستاں نمایاں ہے۔اس کے نعروں سے میرے کان گونجنے لگے ہیں۔ہوشو شیدی نے اپنی بہادری سے اپنوں ہی کے نہیں انگریز حملہ آوروں کے بھی دل جیت لئے ہیں۔

انگریز سپہ سالار ہوشو شہید کی نعش پر حاضری دیتا ہے۔ اس نے اپنی ٹوپی اتار کر وطن پرست شہید کو فوجی سلام پیش کیا۔ شہیدِ سندھ کو ۲۱ توپوں کی سلامی دی کی گئی اور فوجی اعزاز کے ساتھ قلعہ حیدرآباد میں بصد احترامات قبر میں اتار دیا گیا۔ اس کے سرہانے توپ نصب کر دی گئی جو غیر ملکی جارحیت پسندوں کی طرف سے سندھ کے ایک دلیر انسان کی خدمت میں ہدیہ تبریک تھا۔ انگریزوں نے اس کی قبر پر کتبہ لگا دیا ہے:

''یہاں وہ بہادر انسان ابدی نیند سو رہا ہے جس نے جنگِ حیدرآباد میں بہادری سے لڑتے ہوئے اپنی جاں جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔''

تاریخ کا انتقام دیکھئے وہ چارلس نیپئر جس نے سندھ کو برطانوی نوآبادیاتی استعمار کا حصہ بنایا اور جس کی فوجیں ہوشو جیسے ہیرو کی شہادت کا سبب بنیں ' آج اس کا نام محض کراچی کی ایک ایسی گلی سے منسوب ہے جو تشنگانِ ہوس کے لئے ایک بڑی پناہ گاہ ہے۔ اب اگر چارلس نیپئر کسی کو یاد ہے تو کراچی کے نیپئر روڈ کے حوالے سے' باقی سارے حوالے تاریخ کے اندھے کنوئیں میں غرق ہو گئے ہیں۔ ہوشو آج بھی زندہ ہے۔

شیر محمد خان تالپور بھی اپنی شان بان اور آن رکھتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دوآبہ کی جنگ ہارنے کے بعد میر شیر محمد خان' سردار نواب احمد خان لغاری کی معیت میں پہلے نصیر پور اور پھر میر پور خاص پہنچے۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد یہاں سے کوچ کر کے تعلقہ سنجھورو ضلع سانگھڑ کے ایک گاؤں ابھپور کو اپنا مرکز بنا لیا جو دو ڈھائی سو سال پہلے ڈیرہ غازی خان سے سندھ ہجرت کرنے والے لغاری سرداروں نے بسایا تھا۔ لغاری سردار محبِ وطن اور سندھ پر انگریزی غلبے کے خلاف تھے اور تحریک آزادی میں میر شیر محمد خان کی کھلے دل سے مدد کر رہے تھے۔ سندھ میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے لئے میر شیر محمد خان نے ابھپور کو تحریک آزادی کا مرکز بنا لیا۔ ابھپور سے مجاہدین کی اٹھنے والی یہ تحریک انگریز استعمار کے لئے بہت بڑا خطرہ بن گئی۔ میر شیر محمد خان اور سردار نواب احمد خان لغاری کی انگریزوں سے مڈبھیڑ اور آنکھ مچولی تحریک آزادی سندھ کا روشن باب ہے۔ سندھ کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ کے لئے تیاریاں جاری تھیں کہ میر شیر محمد خان' جو اپنوں کی سازشوں اور چالبازیوں سے عاجز آ چکا تھا' نے برٹش ایجنٹ لارنس کی باتوں میں آ کر بالآخر جدوجہد آزادی ترک کرنے اور ہتھیار ڈالنے کی پیشکش قبول

کرلی۔ جو شرائط طے ہوئیں وہ یہ تھیں:

۱: نظر بند تالپور اور مجاہد غیر مشروط طور پر رہا کیے جائیں گے۔

۲: خود میر شیر محمد خان کو میر پور خاص میں رہنے کی اجازت ہوگی۔

۳: انگریز میر شیر محمد خان کو کبھی کسی بھی ایسی مدد اور تعاون کے لئے نہیں کہیں گے جس میں انہیں اپنے عوام کے خلاف لڑنا پڑے۔

انگریز میر شیر محمد خان کو "Lion of Sind" سے یاد کرتے تھے' انہوں نے نئی شرائط میں بھی میر صاحب کا ''شیر سندھ'' کا خطاب برقرار رکھا۔ میر صاحب کے نظر بند بھائی کو بھی رہا کردیا گیا۔ وہ ممبئ سے لاہور پہنچے جہاں سے دونوں بھائی میر پور خاص روانہ ہوئے۔ ان کی جاگیریں بھی بحال کردی گئیں۔ لب تاریخ سندھ میں لکھا ہے:

''میر شیر محمد خان نہایت بہادر' شجاع اور خدا ترس انسان تھے..... انہوں نے آزادی کی تحریک اور تاریخ میں اپنا نام روشن کیا۔''

میر شیر محمد خان کا رتبہ گورنر کے برابر تسلیم کیا گیا۔ انہیں انگریزی خطابات اور تمغے بھی دیئے گئے۔ انگریز کمشنر جب بھی میر پور خاص آتا تو انہیں ملنے ان کے گاؤں ضرور جاتا۔ پھر جب انہوں نے حج کا قصد کیا تو انگریزوں نے انہیں سرکاری جہاز فراہم کیا۔ وہ شیر مرد جس نے عمر کوٹ کے ریگزاروں میں چارلس نیپئر کو للکارا تھا:

''غیر کی غلامی سے موت بہتر ہے۔ دشمن کی موجودگی میں آزادی برقرار رہ سکتی ہے نہ سندھ کی حاکمیت شاندار کہلا سکتی ہے۔'' اپنوں کی بے وفائیوں کے ہاتھوں تحریکِ آزادی سے دستبردار اور مایوس ہو کر انگریزوں کی دوستی کا ہاتھ تھامنے والے ''شیر سندھ'' نے ۲۴ راگست ۱۸۷۶ء (۱۲۹۴ ہجری) کو وفات پائی۔

یہیں قریب ہی نصر پور کے ایک گوٹھ میں کہتے ہیں کہ ایک ہندو نوجوان نے ہندو دھرم سے ناطہ توڑ کر اسلام قبول کرلیا ہے۔ اس نے جوگیوں کا لبادہ اوڑھ کر مجذوبی اختیار کرلی ہے۔ وہ وتومل سے وتایو فقیر ہو گیا ہے۔ اسے نئے مذہب کے اختیار پر ہندو برادری اور سادھوؤں کی جانب سے دباؤ اور تنقید کا سامنا ہے۔ ایک مجذوب زمانے کی نظروں میں آیا ہوا ہے' ہر طرف ہاہا کار مچی ہوئی ہے۔ ہر شخص نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا رکھے ہیں' مارو مارو! وتو کو مارو۔ مگر اسے اپنی جان کی پروا

نہیں ہے' وتو بے خوف وخطر اپنی سادہ لوحی میں مست علم ودانش کے موتی معاشرے کی نذر کرتا پھرتا ہے۔ایک سادھو نے اسے گھیر لیا ہے:

''بھائی وتومل تُو پاگل ہو گیا ہے' تجھے کیا سوجھی کہ ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گیا؟

''میں ایک خدا کی عبادت کرتا ہوں جو بے مثال ہے۔ جو نہ بت ہے اور نہ اسے کسی نے تخلیق کیا ہے اور وہ پاک ہے۔'' وتائے نے جواب دیا۔ یہ سن کر ہندو نے اس سے ٹھٹھا کیا اور کہا:

''پاگل ہو گیا ہے' محض اس وجہ سے مسلمان ہو گیا ہے اگر عقلمند ہوتا تو ایسا نہ کرتا۔''

''ہم پاگل نادان سہی مگر ہم نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ہم ایسے نہیں کہ پیپل کے درخت پر چڑھ کر خوامخواہ بانسری بجانے بیٹھ جائیں اور نہ ہی اس کی شاخوں سے لٹک کر جھولنے والوں میں سے ہیں' ہم نے تو درخت کے تنے کو تھام لیا ہے''۔ ہندو سادھو' وتایو فقیر کے برجستہ جواب پر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

وتایو کبھی مانگ کر پیٹ نہیں بھرتا تھا' اگر کسی نے خود ہی کچھ دے دیا تو لے لیتا ورنہ بھوکا رہتا۔ایک بار اسی طرح بھوک سے بے حال ہو کر گلی میں گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔گوٹھ کے لوگ جمع ہو گئے اور آپس میں مشورے کرنے لگے کہ اب اس کا کیا کیا جائے؟ ان کا خیال تھا کہ وتایو مر گیا ہے۔ ہندو کہنے لگے کہ یہ ہندو تھا' اس لئے اس کی آخری رسومات وہ اپنے دھرم کے مطابق کریں گے۔ مسلمانوں کا اصرار تھا کہ وتایو کے افعال و اطوار اور باتیں مسلمانوں جیسی تھیں' وہ مسلمان ہو چکا تھا' اس لئے اس کو غسل دے کر نماز جنازہ پڑھانا اور دفن کرنا چاہئے۔ دونوں فریقوں کی تکرار جب بڑھ گئی تو اس شور پر وتایو ہوش میں آ گیا' اٹھا اور کسی سے کوئی بات کئے بغیر ایک جانب چل پڑا۔لوگوں نے پوچھا:

''فقیر! کدھر؟ تم تو مر گئے تھے نا؟''

وتایو فقیر کہنے لگا:

''یار! جس دیس کے لوگوں میں انسان کی شناس ہی نہ ہو' وہاں کیا مرنا؟''

وتایو فقیر ایک شادی کی تقریب میں شریک تھا۔ نکاح کے بعد دولہا والوں نے انہیں بزرگ جان کر چھوہارے حوالے کئے اور کہا کہ یہ آپ باراتیوں میں تقسیم کر دیں۔ وتایو نے ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ والی تقسیم کرنی ہے یا آدم والی؟

میزبانوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی جو تقسیم ہے' اسی طرح بانٹ دیجئے۔ اس پر وتایو نے اس طرح چھوہارے تقسیم کرنا شروع کئے کہ کسی کو دو' کسی کو چار اور کسی کو ایک چھوہارہ دیا۔ کسی باراتی کو بالکل نظرانداز کر دیا تو کسی کی جھولی بھر دی اور آخر میں جتنے بچے تھے' وہ اپنے برابر بیٹھے شخص کو دے کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

میزبانوں کو بہت تعجب اور تاسف ہوا کہ فقیر نے یہ کس طرح کی تقسیم کی ہے کہ کافی باراتی چھوہاروں سے محروم رہ گئے اور کچھ کو بہت زیادہ مل گئے۔ انہوں نے وتایو سے پوچھا:

''فقیر! تم نے یہ کس طرح چھوہارے بانٹے ہیں؟''

وتایو نے لاپروائی سے جواب دیا'' آپ ہی نے کہا تھا کہ اللہ کی طرح سے تقسیم کرنا' اگر آدم کی طرح کہتے تو سب کو برابر دیتا۔ اللہ تو اس طرح دیتا ہے جیسے میں نے چھوہارے بانٹے ہیں۔ وہ کسی کو کم' کسی کو زیادہ دیتا ہے' کسی کو بالکل نہیں دیتا اور کسی کو بہت زیادہ نواز دیتا ہے۔'' میزبان اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ایک بار راہ چلتے وتایو کو پاؤں میں کانٹا چبھ گیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا اور ایسی چیخ و پکار مچائی کہ لوگ جمع ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے:

''فقیر آخر کیا ہوا ہے کہ اتنا واویلا کر رہے ہو''؟

وتایو کہنے لگا:

''دیکھتے نہیں ہو؟ مجھے کانٹا چبھا ہے۔''

لوگوں نے کہا کہ:

''فقیر! کچھ تو ہمت کرو' اس معمولی سے کانٹے کے چبھنے پر پورا گاؤں اس طرح سر پر اٹھالیا ہے کہ بچے تک تمہاری بے ہمتی پر ہنس رہے ہیں۔''

کہنے لگا:

''بابا! آپ کو اللہ کا کیا پتہ؟ وہ تو بے پروا بادشاہ ہے۔ آج اگر میں اس چھوٹے سے کانٹے کے چبھنے پر چیخ و پکار نہ کرتا تو کل وہ کوئی بھالا یا نیزہ مار دیتا' تو میں کیا کرتا۔ آپ نے اس کی بات نہیں سنی کہ وہ کسی کو اس کی برداشت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ سو آج میں نے اللہ تعالیٰ کو جتا دیا ہے کہ مجھ میں اس معمولی کانٹے کی برداشت بھی نہیں ہے' اس لئے مہربانی کر کے مجھے کبھی کسی بڑی

آزمائش یا تکلیف میں نہ ڈالنا۔''

ایک مرتبہ وتایو نے کہیں سفر کا ارادہ کیا تو کسی نے زادِراہ کے لئے اسے ایک سکہ دیا۔ فقیر کو زادِراہ کی کیا ضرورت؟ پھر بھی وتایو نے وہ سکہ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ سفر میں جنگل سے گزرتے ہوئے اسے خدشہ ہوا کہ اگر ڈاکوؤں نے روک لیا تو یہ روپیہ دیکھ کر وہ سمجھیں گے کہ اس کے پاس اور بھی رقم ہوگی اور اس طرح وہ اسے ماردیں گے۔ یہ سوچ کر وتایو نے وہ سکہ پھینک دیا جو جنگل میں ایک جھاڑی کی جڑوں میں جاکر گرا۔

وتایو سفر سے واپس آتے ہوئے جب اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے سکہ پھینکا تھا تو دیکھا کہ وہ جھاڑی جڑ سے اکھاڑ پھینک دی گئی ہے۔ جس کسی کو جھاڑی کی جڑ سے سکہ ملا تھا' اس نے اس آس میں جھاڑی کو جڑ سے اکھاڑ دیا تھا کہ شاید یہاں کوئی خزانہ دبا ہوا ہے۔

فقیر نے یہ ماجرا دیکھ کر شکر کیا اور کہا:

''اچھا ہوا کہ اس سکے سے میں نے جان چھڑالی تھی' اگر یہ میرے پاس ہوتا تو آج میری بھی اسی جھاڑی کی طرح جڑیں اکھڑی ہوئی ہوتیں!''

یہ تھا سندھ کا مجذوب دانشور وتایو المعروف وتایو فقیر۔ وتایو کی حکایات اور قصے اتنے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ اس کے چٹکلے اور محاورے سندھی سماج کی روزمرہ عام زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ میں نے تبرکاً چند روایات پیش کر دی ہیں تاکہ یہاں سے گزرا ہوں تو اس عظیم لوک دانشور کی خدمت میں ہدیہ عقیدت پیش کرتا چلوں۔

وتایو فقیر کون تھا' کہاں پیدا ہوا اور کب پیدا ہوا؟ تاریخ اس کے حسب نسب' جائے پیدائش اور خاندان سے متعلق تفصیلات دینے سے قاصر ہے البتہ جو روایات سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہیں ان کے مطابق وتایو فقیر کے آباواجداد کھتری بنئے تھے اور مہرانو کے کسی گوٹھ میں رنگریزی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ پھر یہ خاندان اپنا گوٹھ دریا برد ہونے کے نتیجے میں نقل مکانی کر کے ایک اور گاؤں ''اکھے مانی'' آگیا۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے کہ وتایو نصرپور ہی کا تھا۔ اس کا سن پیدائش دستیاب نہیں لیکن بارہویں صدی ہجری میں اس کے کئی حوالے تاریخ میں محفوظ ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے اسی صدی کے کسی سال میں جنم لیا ہوگا۔

وتایو فقیر اپنی دُرویشی' حاضر جوابی' چٹکلوں اور زریں اقوال کی وجہ سے سندھ دھرتی ، علم

وادب اور تاریخ کا لازوال کردار بن گیا ہے۔ مجذوب دانشور وتایوفقیر کے قصے' طنز اور سبق سے لبریز حکایتیں اور دلچسپ واقعات آج تین صدیوں بعد بھی سینہ بہ سینہ ہماری سماجی زندگی کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ ضیائی مارشل لا میں علی احمد بروہی نے وتایوفقیر کی حکمت کو ڈھال بنا کر ایک نئے انداز سے کئی ایسے کالم لکھے جو لوگوں کے لئے آمریت کے سیاہ دور میں مینارا نور ثابت ہوئے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ایسے ہی قصے اور حکایتیں سرائیکی وسیب میں تونسہ کے خیر شاہ سے منسوب ہیں۔ یہ سندھی اور سرائیکی سماج کی قربتوں کی ناقابلِ تنسیخ نشانیاں ہیں کہ جو دونوں تہذیبوں کو باہم شیر وشکر کرتی ہیں۔

فقیر دانشور وتایو کا روح پرور مزار ٹنڈو اللہ یار سے ملحقہ راشد آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب مرجع خلائق بن چکا ہے۔ کوئی یہاں سے گزرے اور وتایو کو ہدیہ عقیدت پیش کئے بغیر آگے نکل جائے یہ کیسے ممکن ہے؟ اس کی لوح پر لکھا ہے:

''جیسا میں کل تھا ویسے آپ آج ہیں اور جو میں آج ہوں' آپ کل ویسے ہی ہوں گے۔'' وتایوفقیر بس ایسا ہی تھا' مر کر بھی اپنی یادیں دلوں پر نقش کر گیا۔

میں بھی خود کو خوش قسمت تصور کر رہا ہوں کہ مجھے اس عظیم دانشور اور فکری رہبر کی قبر پر مختصر حاضری اور فاتحہ خوانی کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔

''یہ راشد آباد ہے۔'' ڈرائیور کی پشت پر اس کی نشست سے لپٹے گائیڈ جمن سومرو نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! مجھے پتہ ہے۔ میں یہاں آچکا ہوں۔'' میں نے محسوس کیا کہ اسے میرے انکشاف پر دکھ ہوا ہے 'جیسے اس کی رہبری پر حرف آ گیا ہو۔ میں نے خود کو ملامت کی کہ مجھے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ شاید اس کی دل آزاری ہوئی ہو۔ جمن تھر کے تعلقے چھور کا باشندہ ہے۔ ہمارے میزبانوں نے اسے ہماری رہبری کے لئے ساتھ کیا ہے۔ وہ پیشہ ور گائیڈ تو نہیں مگر اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ یہ کام کئی بار خوش اسلوبی سے کر چکا ہے اور تھر کے چپے چپے سے واقف ہے۔

راشد آباد ایک ایسے شہر علم کا نام ہے جو ایک خدا ترس اور صابر باپ نے اپنے شہید بیٹے سے منسوب کر دیا ہے۔ ائیر کموڈور شبیر احمد خان قائم خانی کے بارے میں ائیر فورس کے افسران اور جوانوں کی رائے ہے کہ وہ ملنسار' انسان دوست اور ہر ایک کے کام آنے والے شخص ہیں۔ ائیر

فورس کی سروس کے دوران انہوں نے خود اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہزاروں خاندانوں کی خاموشی سے مدد کی اور جب ریٹائر ہوئے تو انہوں نے اپنے آبائی علاقے میں علم کی روشنی پھیلانے کے لئے ائیر فورس کی معاونت سے ایک غیر معمولی تعلیمی منصوبہ شروع کرنے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک سو ایکڑ رقبہ حاصل کیا اور اس نیک کام کا آغاز کر دیا۔ وہ اس منصوبے کے لئے نام موزوں کرنے کی سوچ رہے تھے کہ ایک اندوہناک حادثے نے صورت حال یکسر مختلف کر دی۔ ایک باپ کو یہ علم نہیں تھا کہ وہ جو منصوبہ تشکیل دینے کی جستجو میں ہے وہ اسے اپنے شہید بیٹے سے موسوم کرنا پڑے گا۔

ائیر کموڈور شبیر احمد خان کی اولاد نہیں تھی' انہوں نے اپنے لئے اولاد کی دعا کی جو اللہ نے قبول کر لی اور انہیں ایک بیٹا عطا کیا جس کا نام انہوں نے شہید راشد منہاس کے نام پر راشد احمد خان رکھا۔ راشد احمد خان کو وطن سے محبت ورثہ میں ملی تھی اور وہ اپنے ملک کیلئے کچھ کر گزرنا چاہتا تھا۔ وہ دفاعِ وطن کے لئے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ائیر فورس میں بھرتی ہو گیا۔ راشد احمد خان نے اپنے خالق سے شہادت کی موت مانگی' خدا نے اس کی دعا کو قبول کر لیا اور عالم شباب ہی میں اسے شہادت کے منصب پر فائز کر دیا۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۹۷ء کو جب عروس البلاد کراچی کے شہری اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔ اس دوران ایک میراج لڑاکا طیارہ اپنی معمول کی پرواز پر تھا جسے فلائٹ لیفٹیننٹ راشد احمد خان اڑا رہے تھے۔ دورانِ پرواز یہ طیارہ مزار قائداعظم کے قریب خراب ہو گیا اور اس میں آگ بھڑک اٹھی۔ اس موقع پر راشد احمد خان نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کو اولیت دی اور طیارہ آبادی پر گرانے کی بجائے ائیربیس مسرور کا رخ کیا۔ وہ چاہتے تو پیراشوٹ کے ذریعے چھلانگ لگا کر جہاز آبادی پر گرا کر اپنی جان بچا سکتے تھے مگر عظیم باپ کی تربیت نے انہیں اس سے باز رکھا۔ وہ جہاز کو ائیربیس مسرور کی طرف لے جانے کی کوشش میں کامیاب ہو گئے مگر مسرور بیس کے قریب جہاز گر کر تباہ ہو گیا اور فلائٹ لیفٹیننٹ راشد احمد خان اپنے اللہ کے حضور پیش ہو گئے۔ جواں سال بیٹے کی موت ائیر کموڈور شبیر احمد خان کے لئے بہت بڑا سانحہ تھی' مگر انہوں نے حوصلے کے ساتھ اس صدمے کو قبول کیا اور اپنی زندگی قوم کے بیٹوں اور بیٹیوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے وقف کر دی ہے۔ ائر کموڈور شبیر احمد خان قائم خانی نے

ریٹائرمنٹ کے بعد فروغِ تعلیم کا جو خواب دیکھا تھا اسے ان کے شہید بیٹے راشد احمد خان سے موسوم راشد آباد کی شکل میں تعبیر مل گئی ہے۔

منصوبے کے آغاز میں راشد آباد میں چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تعمیر کیا گیا' جو پاکستان کے روایتی ریلوے اسٹیشنوں سے بالکل مختلف اور بہت ہی خوبصورت ہے۔ اس کے زیریں حصے میں اسپتال اور ملحقہ میدان میں ہیلی پیڈ موجود ہے۔ کراچی سے میر پور خاص جانے والی ٹرینیں اب اس اسٹیشن پر بھی رکتی ہیں۔ اگر آپ کو کبھی راشد آباد جانے کا اتفاق ہو تو اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ایک نئی دنیا آپ کو اپنے سحر میں لے لے گی۔ اسکول' کمپلیکس' مسجد' اسپتال' فلاحی مراکز اور پارک' کیا کچھ نہیں ہے یہاں۔ راشد آباد پہنچتے ہی جو سب سے سرگرم اور فعال ہستی آپ کو نظر آئے گی وہ شبیر احمد خان ہی ہوں گے۔ چاک و چوبند' خوش لباس' خوش گفتار' تیزی سے چلتے ہوئے' ہدایات دیتے ہوئے' انہوں نے اپنے دکھ کو قوم کے سکھ میں بدلنے کا عزم کر لیا ہے تو پوری قوم بھی ان کے ساتھ ہے۔ شبیر احمد خان چند سال پہلے اکیلے ایک عزم لے کر جانبِ منزل نکلے تھے' چند برسوں میں ایک بڑا قافلہ ان کے ہم رکاب ہو گیا ہے۔

راشد آباد میں اس عظیم منصوبے کی نگرانی کے لئے راشد میموریل ویلفیئر آرگنائزیشن تشکیل دی گئی' جس کا مشن ملک سے ناخواندگی اور غربت کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک سو ایکڑ رقبہ پر ٹنڈو الہیار سے ۵ کلومیٹر دور راشد آباد قائم کیا گیا' یہ نیا شہر دیکھتے ہی دیکھتے جنگل میں منگل ہو گیا ہے۔ جہاں اردگرد کی دیہی آبادی کے لئے اسکول' اسپتال' یتیم بچوں اور بیواؤں کے لئے تربیتی مراکز قائم کئے جارہے ہیں۔ پارک اور تفریحی سہولتیں بھی فراہم کی جارہی ہیں۔ راشد آباد میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کی گئی ہے جو لفظ اللہ کی شکل میں بنائی گئی ہے۔ اس کی تعمیر پر ایک کروڑ روپے لاگت آئی ہے۔ یہ مسجد فنِ تعمیر کا عظیم شاہکار ہے جس کے اطراف میں ایک خوبصورت نہر تعمیر کی گئی ہے جس پر پل بھی تعمیر کیا گیا ہے' جس سے سارا منظر دلفریب نظر آتا ہے۔ مسجد کے تہہ خانے میں اسلامک انفارمیشن اور آڈیو ڈیجیٹل لائبریری قائم کی جارہی ہے۔ اس لائبریری میں ریفرنس بکس دستیاب ہوں گی۔ اس سینٹر میں دو کلاس روم بھی بنائے جارہے ہیں جن میں بچوں کو دینی تعلیم دی جائے گی اور قرآن کریم پڑھایا جائے گا۔ منصوبے کے تحت یتیموں اور بیواؤں کی کفالت اور رہائش کے لئے ۳ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک مرکز تعمیر کیا جارہا ہے جس

میں ۱۰۰ یتیم بچوں اور ۵۰ بیواؤں کو رکھا جا سکے گا۔ اس مرکز میں ان بچوں کی تعلیم و تربیت کا اعلیٰ انتظام کیا جائے گا جبکہ بیواؤں کو بھی ہنر مند بنا کر معاشرے کا کارآمد شہری بنایا جائے گا۔ راشد آباد میں ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی لاگت سے خصوصی بچوں کے لئے بھی ایک اسپتال بنایا جائے گا۔ مذکورہ منصوبے کے تحت خصوصی بچوں کو نہ صرف تعلیم و تربیت فراہم کی جائے گی بلکہ صحت کی بہترین سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔ یہاں دستکاری مرکز بھی قائم کیا جائے گا۔

مسجد کے بالمقابل ایک اسکول تعمیر کیا جا رہا ہے جو کئی منزلہ اور جدید سہولتوں سے مزین ہوگا۔ اندازہ ہے کہ راشد آباد کے اس منصوبے پر ۲۳۵ ملین روپے لاگت آئے گی۔ اس منصوبے پر سالانہ ۵۵ ملین روپے کے اخراجات کا تخمینہ ہے۔ راشد آباد میں اسکول ' سرگودھا میں قائم ائر فورس اسکول کی طرز پر قائم کیا جا رہا ہے۔ پائلٹ راشد احمد خان سے موسوم کثیر المقاصد ''راشد آباد فلاحی منصوبہ'' پر خاصا کام مکمل ہو چکا ہے۔ راشد میموریل ویلفیئر آرگنائزیشن کے زیر انتظام ایک ارب ۵ کروڑ روپے کی لاگت سے اس منصوبے کا آغاز دسمبر ۱۹۹۸ء میں ہوا تھا۔ جس میں ۲ ہزار ۲۴۴ طلباء کے لئے انٹرمیڈیٹ کی سطح تک کی تعلیم فراہم کرنے کے علاوہ آٹھویں جماعت سے اولیول تک کے تقریباً ۵ سو طلبہ کے لئے بورڈنگ اسکول کی جدید ترین عمارت تعمیر کی جائے گی' جس سے طلبہ کو رہائش کی اعلیٰ ترین سہولتیں بھی میسر ہوں گی۔ اس ادارے میں ایک تہائی طلبہ کو وظیفہ بھی فراہم کیا جائے گا۔ بتایا گیا ہے کہ یہاں ہاسٹل کی تعمیر کے سلسلے میں ''سرگودھین اسپرٹ ٹرسٹ'' مالی معاونت کر رہا ہے۔ بورڈنگ اسکول سے حاصل ہونے والی آمدنی اسکول کے مقامی غریب طلبہ پر خرچ کی جائے گی۔

اس اسکول میں ملک کے چاروں صوبوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کو داخلے فراہم کئے جائیں گے۔ اسکول کی تعمیر اور اس کے انتظامات کی ذمہ داری ''سرگودھین اسپرٹ ٹرسٹ'' نے لے لی ہے۔ اس منصوبے پر تقریباً ۲۵ کروڑ روپے کی لاگت سے ایک لائبریری بھی قائم کی جائے گی جس میں آڈیٹوریم اور ایک میوزیم بھی شامل ہوگا۔ راشد آباد میں ۲۰۰ بستروں کی گنجائش کا حامل تقریباً ۱۳ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی لاگت سے اسپتال بھی قائم کیا جائے گا' جس میں جدید ترین طبی سہولتیں میسر ہوں گی۔ منصوبے کے تحت ایک موبائل میڈیکل یونٹ بھی قائم کیا جائے گا۔ پاکستان میں پہلی بار مریضوں کے ساتھ آنے والے تیمارداروں کی رہائش کے لئے ایک علیحدہ

کمپلیکس بھی تعمیر کیا جارہا ہے جس میں مریض کے ساتھ آنے والے تیمارداروں کو علامتی رقم کی ادائیگی میں نہ صرف رہائش ملے گی بلکہ تین وقت کا کھانا بھی فراہم کیا جائے گا۔

راشد آباد ایک باپ کی اپنے بیٹے ہی سے نہیں قوم کے بیٹوں سے لازوال محبت کا ثمر ہے۔ بوڑھے کاندھے جب جواں سال بیٹوں کی میت اٹھاتے ہیں تو اس بوجھ سے ان کی کمر جھک جاتی ہے مگر آفرین ہے ائر کموڈور شبیر احمد خان قائم خانی پر" انہوں نے بیٹے کی جدائی کو زندگی کا المیہ بنانے کی بجائے اسے رنگ و نور کے سفر میں بدل دیا ہے۔ اب انہوں نے اپنے تعلیمی منصوبے کو شہید صاحبزادے کا نام دے دیا ہے اور تعلیم کے فروغ کو زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ کتنے عظیم ہیں یہ لوگ! قائم خانی سپوتوں کے بارے میں سوچتے ہوئے باپ بیٹے کی محبتوں کی قوس قزح میری آنکھوں میں گہری ہو گئی ہے۔

ہم ٹنڈو اللہ یار سے گزر رہے تھے تو مجھے نوائے وقت کے سابق نامہ نگار زاہد اختر خانزادہ یاد آ گئے جنہوں نے بے نظیر بھٹو کے پہلے دور اقتدار میں پی آئی اے میں ملازمت اختیار کر لی تھی اور پھر وہ بیرون ملک چلے گئے غالباً ٹیکساس امریکہ میں ملازمت اور رہائش اختیار کر لی۔ اب ان کے چھوٹے بھائی جاوید اختر خانزادہ ٹنڈو اللہ یار سے نوائے وقت کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ٹنڈو اللہ یار شہر کی بنیاد بانی میر پور خاص میر علی مراد خان تالپور کے چچا میر اللہ یار خان تالپور نے اپنے نام پر کلہوڑوں کی میروں کے ساتھ چپقلش کے زمانے میں رکھی تھی۔ اس علاقے میں تالپور اب بھی سیاسی اور سماجی طور پر خاصے موثر ہیں۔ تالپور وڈیرے ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کے لئے کشش رکھتے ہیں اور اکثر انتخابات میں پارٹی ٹکٹ سے نوازے جاتے ہیں۔

ہم راشد آباد سے نکلے تو سڑک خالی اور ویران دکھائی دی۔ افضل نے آبادی سے نکلتے ہی گاڑی کی رفتار بڑھا دی ہے۔ وہ جب بھی گاڑی بھگاتا ہے میری سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں۔ تیز رفتاری کے خوف سے چھٹکارا پانے کیلئے میری نظروں نے بل کھاتی سڑک سے ہٹ کر فصلوں کا رخ کیا جہاں ہر عمر کی دیہاتی عورتیں کھیتوں میں کام کرنے میں مصروف ہیں۔ ان کے وجود سے چپکے میلے کچیلے پیراہن ان کی غربت کی چغلی کھا رہے ہیں اور ان کے بدن پسینے سے شرابور ہیں۔ سادگی اور بے چارگی ان کے چہروں پر نمایاں ہے۔ اچانک میری نظر ایک دوشیزہ پر پڑی۔ کڑکتی دھوپ میں سنولایا ہوا دل موہ لینے والا چہرہ" ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں خودرو

پودوں کا چھوٹا سا گٹھا۔ اس کے تیکھے نقوش اس کی خوبصورتی کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ میری نگاہیں اس کے سراپے کا طواف کرنے لگیں۔

"سبحان اللہ! مولا نے کیا حسن دیا ہے۔" میں نے خود کلامی کی۔

میری نیت میں فتور نہیں تھا مگر دیہاتی لڑکی کو میرا یوں تاڑنا اچھا نہیں لگا۔ وہ میری خطا پر نالاں دکھائی دی۔ میری حیرت سے پھیلی نگاہوں کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ شرما سی گئی اور میری جانب سے منہ پھیرتے ہوئے اپنے پھٹے پرانے آنچل سے اپنا سراپا ڈھک لیا۔ میں دیہی حسن کی خود ستائی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"ویسے استاد چیز زبردست تھی"۔ افضل نے میری چوری پکڑ لی ہے۔

"نہیں یار! میں تو بس ذرا سا فصلیں دیکھ رہا تھا"۔" میں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا۔ ندامت کے زہر میں بجھی ہوئی ایک ٹیس نے میرے پورے وجود میں سنسنی پھیلا دی۔ میں نے خود کو احساس جرم میں مبتلا پایا۔ افضل نے بہ ظاہر میرے جھوٹ پر کسی طرح کی خفگی کا اظہار تو نہیں کیا البتہ ایکسلیٹر پر اس کے پاؤں کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے مجھے اس کے ملال کی شدت کا احساس ہو گیا۔ ہماری گاڑی دونوں طرف بلند قامت درختوں سے گھری میرپور خاص روڈ کے سناٹے چیرتی ہوا ہو رہی ہے۔ ایسے لگ رہا تھا دیو قامت درخت ہماری مخالف سمت میں تیزی سے محو سفر ہیں۔ حیدر آباد سے یہاں تک سڑک دونوں طرف بڑے بڑے فارم اور آم کے باغات ہیں جو مقامی زمینداروں کی زراعت کے حوالے سے ترقی پسندانہ تفصیلات کا مظہر ہیں۔ حیدر آباد سے یہاں تک بڑے بڑے فارم اور آم کے باغات ہیں جو اس تنگ سڑک کو دونوں اطراف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہم میرپور خاص شہر کے مضافات سے گزر رہے تھے۔ افضل نے سہراب گوٹھ سے میرپور خاص تک ۱۷۱ کلو میٹر کا سفر جو عام طور پر چار سے ساڑھے چار گھنٹوں میں طے ہوتا ہے' سوا تین گھنٹوں میں مکمل کر لیا ہے۔ میں اس کی فنکاری پر دنگ رہ گیا۔ میرپور خاص جدید و قدیم تہذیب کا آئینہ دار ہے جہاں شہری اور دیہی زندگی کے دونوں رنگ یکساں انداز میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں تھرپارکر کو ضلع کا درجہ دے کر میرپور خاص کو ضلعی صدر مقام بنایا گیا تو یہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ ۱۹۹۰ء میں میرپور خاص اور تھرپارکر دو الگ اضلاع بنا دیئے گئے تو اس کی

اہمیت دو چند ہوگئی۔ سندھ کے تالپور میروں کے ہاتھوں قائم ہونے والا یہ شہر ہر دور میں اس علاقے کے لوگوں کے لئے خیر و برکت کا وسیلہ بنتا رہا۔ اب یہ ضلع سے ڈویژن کا درجہ پا چکا ہے۔ ۷۱ مارچ ۱۹۹۳ء کو سندھ کے وزیر اعلیٰ سید مظفر حسین شاہ کے دورِ حکومت میں تعلقہ عمر کوٹ کو اس سے الگ کر کے ضلع اور میرپور خاص کو ڈویژن بنا دیا گیا۔ اس فیصلے پر مختلف حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی اور اسے ایک سیاسی چال قرار دیا گیا۔ بہر حال کچھ سیاسی اور سماجی حلقوں کی طرف سے اٹھنے والا یہ شور کچھ بیانوں اور کچھ نعروں کے بعد دم توڑ گیا۔ مبارک ہنگور جو میرپور خاص کے پہلے کمشنر مقرر کئے گئے۔ ضلعی حیثیت میں یہاں ۱۹۹۳ء تک قومی کی تین اور صوبائی کی چھ نشستیں تھیں جبکہ اب یہاں قومی کے دو اور صوبائی کے چار حلقے ہیں۔ (۲۰۰۰ء میں شہری حکومتوں کا تفویض اختیارات کا ''مشرفی نظام'' متعارف ہوا تو اس ضلع کو چھ تعلقوں میرپور خاص، ڈگری، کوٹ غلام محمد، سندھڑی، حسین بخش مری، جھڈو اور اکتالیس یونین کونسلوں میں بانٹ دیا گیا)۔

اس تاریخی شہر کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی میزبانی کا موقع بھی مل چکا ہے۔ میرپور خاص کے ریلوے اسٹیشن کی عمارت بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہے جو انگریزوں کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ اسی قدیم عمارت کے سامنے ۱۹۳۰ء میں سائیں جی ایم سید نے فقیر محمد منگریو، جان محمد پلی اور جمشید مہتہ کے ساتھ مل کر ایک بڑے اجتماع میں سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ بعد میں سندھ کی شہرہ آفاق شخصیت کامریڈ حیدر بخش جتوئی اس کے صدر بنے اور انہوں نے کامریڈ غلام محمد لغاری، کامریڈ میر محمد تالپور اور دیگر ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہاریوں کے لئے فصل کی نصف بٹائی کی تحریک چلائی تھی۔

کامریڈ حیدر بخش جتوئی کے بارے میں میرے ایک دوست نے بعض کتب کے حوالے سے تاریخی انکشاف کیا ہے کہ جب وہ انگریزی ملازمت میں تھے تو وہ سورھیہ بادشاہ پیر صبغتہ اللہ شاہ راشدی (پیر صاحب پاگاڑو سید علی مردان شاہ کے والد) کے خلاف اس مقدمے کی جیوری کے رکن تھے جس کے فیصلے کے نتیجے میں پیر صاحب پاگاڑو پھانسی پر چڑھا دیئے گئے اور سندھ میں انگریزوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ کامریڈ کے پسماندگان اور سندھ کے محققین کو اس موضوع پر تحقیق کرنی چاہئے تاکہ اصل حقائق سامنے آسکیں۔ کامریڈ حیدر بخش جتوئی نے بعد ازاں انگریزوں کی ملازمت ترک کر کے ہاریوں کی رہنمائی کا بیڑا اٹھا لیا اور اپنی زندگی کی آخری

سانسوں تک جاگیردارانہ نظام کے خلاف سینہ سپر رہے۔ انگریزوں کے اثرات سے نجات کے بعد ترقی پسند حیدر بخش جتوئی نے اپنی شناخت ایک ہاری اور عوام دوست رہنما کے طور پر کروائی تو قوم نے ان کی ساری لغزشیں معاف کر دیں اور انہیں ایک عظیم قوم پرست رہنما کا درجہ دے دیا۔

میر پور خاص شہر کے مضافات میں ایک تاریخی مقام'' کاہو جودڑو'' خاصی اہمیت کا حامل ہے جہاں بدھ اسٹوپا مرجعٔ خلائق رہا ہے۔ اور روایت ہے کہ یہیں میر پور خاص کے قریب ہی'' چندر موریہ'' کے مقام [illegible] کا ایک بدھ مت کا پجاری حکمران راجہ چندر گپت موریہ محو استراحت ہے۔ اب تو وہاں سال بہ سال میلہ بھی لگتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ نے اس سرزمین کو اپنے قیام سے سرفراز کیا تھا اور یہاں اسٹوپا گوتم بدھ کی آمد کے موقع پر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے آثار ۱۸۵۶ء میں دریافت ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں نوادرات اور قدیم آثار کے عاشق انگریز سرجان مارشل نے اس کی کھدائی کروائی اور قدیم زیورات' سنگی اور سنہری مورتیاں' نقرئی وطلائی ظروف اور دیگر نوادرات چن چن کر برطانیہ لے گئے اور وہاں انہیں برٹش میوزیم کی زینت بنا دیا گیا' ان میں سے کئی ایک نوادرات دہلی کے عجائب گھر میں بھی محفوظ ہیں۔ کاہو جودڑو کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں مگر یہ تاریخی مقام ابھی تک پاکستانی محکمہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی خصوصی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔



بوڑھے "پران" کے کنارے

میں ایک بار پھر تاریخ کے اوراق میں کھو گیا ہوں۔ میں بوڑھے دریا "پران" کے کنارے کھڑا ایک نہ ختم ہونے والا تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ۳۲۷ سال قبل مسیح سکندرِ اعظم سپاہِ عظیم لے کر ڈھول اڑاتا، پھریرے لہراتا اور انسانیت کو تہہ تیغ کرتا بحیرہ عرب اور بحر ہند کی جانب گامزن ہے۔ وہ بہت عجلت میں ہے۔ وہ تھوڑے وقت میں زیادہ خون بہانا اور وسیع علاقے ہتھیانا چاہتا ہے۔ اس کے سر پر "فاتحِ عالم" بننے کا بھوت سوار ہے۔ وہ "پران" کے کنارے مہاویر اور گوتم بدھ کے پھیلائے ہوئے پیغامِ امن کو بھی خاطر میں نہیں لایا، اس کے چیتھڑے اڑاتا آگے نکل گیا اور اپنے پیچھے سروں کے مینار، لاشوں کے انبار، آہیں، سسکیاں اور غم واندوہ کے پہاڑ اور ملبے کے ڈھیر چھوڑ گیا ہے۔ اس کے لگائے ہوئے زخموں کے نشاں ابھی تک تازہ ہیں۔

یہ ۱۰۲۶ء کا ایک منظر ہے۔ مجھے پھر وہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں اور ہاتھیوں کی چنگھاڑیں سنائی دیں۔ راجستھان کی طرف سے اٹھنے والے گرد و غبار کے بادلوں میں سے ایک اور فاتح نمودار ہوا۔ یہ سلطان محمود غزنوی ہے، فاتحِ سومنات۔ ابھی ابھی سومنات کو تاراج کر کے فتح کے پھریرے لہراتا، خوشی کے شادیانے بجاتا "پران" کے اُس پار سے افغانستان واپس پلٹ رہا ہے۔ مقامی ہندوؤں نے اسے بھٹکا دیا ہے۔ پہلے وہ پارکر میں بھٹکتا رہا اور پھر پران کے کنارے تھر میں واپسی کی راہیں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ سیکڑوں پابہ زنجیر قیدی اور ڈھیر سارا مالِ غنیمت اس کے قبضے میں ہے۔ افغانستان سے سومنات تک کوئی رکاوٹ، کوئی طاقت، اس سیلاب

کے سامنے نہیں ٹھہر سکی لیکن پر فریب صحرائے تھر نے اس سرخ آندھی کے قدم روک لئے ہیں۔اس کی سپاہ پیاسی اور تھکی ہوئی ہیں۔وہ ستانے اور صحرا کے اس پر آشوب سفر میں جان سے ہاتھ دھونے والے ساتھیوں کی تدفین کے لئے یہاں پران کے کنارے قیام پر مجبور ہو گیا ہے۔وہ تھر سے جاتے جاتے ایک قبرستان یادگار چھوڑ گیا ہے۔

اب میری نظروں کے سامنے ۱۷ویں صدی اپنا سینہ پھیلائے کھڑی ہے۔''پُران'' ہی کے کنارے دُھول اڑاتے سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسمٰعیل سکھوں کے خلاف علمِ جہاد بلند کئے اپنے ساتھیوں کی ہمراہی میں دہلی سے بالاکوٹ کے لئے عازمِ سفر ہیں۔وہ جس طرف جاتے ہیں اور جہاں سے بھی گزرتے ہیں لوگ اپنی آنکھیں ان کی راہوں میں بچھا دیتے ہیں۔انہیں اس سرزمین پر بے پناہ توقیر ملی ہے مگر وہ یہاں زیادہ لوگوں کو جہاد کے لئے اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ نہیں کر سکے۔یہاں ان کے نظریئے کے حامیوں کی کوئی کمی نہیں ہے لیکن ان کی جدوجہد میں ساتھ دینے والے منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔لوگ کہتے ہیں کہ سید برادران انگریزوں کی ترغیب میں آگئے ہیں۔اہلِ سندھ انگریزوں کی سندھ پر یلغار کے خلاف متحد ہو چکے ہیں لیکن وہ ہیں کہ مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف لڑائی پر اکساتے پھر رہے ہیں۔وہ ان کی جہاد کے لئے دعوت کو بے وقت کی راگنی سے تعبیر کرتے ہیں۔

پھر کہیں سے نادرشاہ اور مدد خان پٹھان آ دھمکے اور انہوں نے یکے بعد دیگرے عمرکوٹ کے قلعہ پر دھاوا بول دیا ہے۔ان دونوں نے ہر طرف تباہی پھیلا کر رکھ دی ہے۔مقامی حکمرانوں کے انکار کی سزا عام لوگوں کو دی جا رہی ہے۔ظالموں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے ہیں۔نادرشاہ' سلطان نصیرالدین محمد شاہ کو سبق سکھانا چاہتا ہے۔محمد شاہ نے اس کے بھیجے گئے خطوط کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا اور اس کے ایلچیوں کو بھی دلی سے واپس نہیں آنے دیا' اسے نہیں خبر کہ وہ زندہ بھی ہیں کہ کسی زنداں کے تاریک نہاں خانے میں پڑے زندگی کے دن گن رہے ہیں۔ایک سال کی خاموشی کے بعد اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔وہ سخت اشتعال میں ہے۔سلطان محمد شاہ کے دو اہم درباریوں دکن کے گورنر آصف جاہ نظام الملک اور اودھ کے گورنر سعادت خان نے نادرشاہ کے ساتھ ساز باز کر لی اور انہوں نے نادرشاہ کو دلی کے تخت پر یلغار کی ترغیبات دیں۔نادرشاہ نے سلطان کی طرف سے اختیار کئے گئے ناروا' گستاخانہ طرزِ عمل کے پیشِ نظر دلی تخت کے غداروں کی

دعوت قبول کر لی ہے۔ اسے دلی کے لال قلعہ پر علم نصب کرنے کی جلدی ہے' وہ ہوا بن کر آیا ہے اور اس نے ہر طرف سب کچھ اُڑا کر رکھ دیا ہے۔ میں اس کی دہشت سے سہم گیا ہوں۔ اس کے راستے میں جو بھی آتا ہے ملیا میٹ کر دیا جاتا ہے۔ نادر شاہ کے صحرائے تھر پر لگائے ہوئے زخموں کی ٹیسیں ''کاہو جودڑو'' تک محسوس ہو رہی ہیں۔ مجھے ہر طرف خاک اور خون میں لتھڑے منظر دکھائی دے رہے ہیں۔ تاریخ اپنا سفر تیزی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔ پھر میں دیکھتا ہوں کہ میر پور خاص پر سومروں اور سموں کے اقتدار کا سورج بھی غروب ہو چکا ہے۔ تاریخ بڑی سرعت کے ساتھ اپنے صفحات پلٹ رہی ہے اور ایک کے بعد ایک تماشا میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔

یہ ۱۷۸۳ء کی کہانی ہے۔ وادیٔ مہران کے میدانوں میں ایک بار پھر لام بندی ہو رہی ہے۔ اس بار لڑنے والا کوئی غیر نہیں' آپس کے لوگ ہیں۔ سندھی نوجوانوں کے علاوہ ہندوسندھ سے کرائے کے فوجی بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ گھوڑے' ہاتھی' اونٹ' خچر اور تیر و تفنگ اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ انگریزوں کی سازش کام آ گئی ہے' اس نے میانی کے میدانوں میں اہل سندھ کی طرف سے لگائے جانے والے چرکے ابھی تک فراموش نہیں کئے۔ سندھ پر قبضے کے خواہش مند دو مقامی طاقتور خاندان عباسی کلہوڑے اور میر تالپور تلواریں سونتے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ دونوں طرف انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ تالپور' کلہوڑوں سے پُرانی شکست کا انتقام لے کر سندھ کی باگ ڈور دوبارہ اپنے ہاتھ لینا چاہتے ہیں۔ ''ہالانی'' کے مقام پر خونریزی کے بعد میر تالپوروں نے کلہوڑوں کو ہزیمت سے دوچار کر کے سندھ کے اقتدار پر ایک بار پھر قبضہ جما لیا ہے۔ کلہوڑہ حکمران شکست کے بعد جائے اماں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

فتح کے بعد میروں کی حکمتِ عملی بدلتی ہے۔ انہوں نے سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اقتدارِ اعلیٰ کو اپنے خاندان میں تقسیم کر لیا ہے۔ خیر پور کا علاقہ میر سہراب خان تالپور کے حصے میں آتا ہے' حیدر آباد میر فتح خان تالپور اور میر پور خاص کا علاقہ میر فتح خان کے صاحبزادے میر ٹھارو خان تالپور کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس تقسیم کے بعد سندھ میں تعمیر و ترقی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ میر ٹھارو خان اپنوں پرایوں کے لگائے کچوکوں اور ڈھلتی عمر کے ہاتھوں بے بس ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر کے اقتدار اپنے بڑے بیٹے میر علی مراد خان تالپور کے حوالے کر دیتا ہے۔ میر مراد خان نوجوان ہے' کچھ کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے خاندان سے منسوب ایک شہر بسانا چاہتا

ہے۔اس کے خواب کو تعبیر ملتی ہے' اسے اقتدار ملتا ہے تو ۱۸۰۶ء میں اُس نے اس شہر کی بنیاد رکھی اور ایک کچا پکا قلعہ تعمیر کیا۔ یہاں سڑکیں بنائی گئیں' بازار تعمیر کئے گئے اور شہر کے چاروں جانب محلے قائم کر کے اردگرد قبائل کو بسایا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میر پور خاص کا جہان آباد ہو گیا۔ جلد ہی اس شہر اور قلعہ کی دُھوم پورے ہند سندھ میں پھیل گئی۔

میروں کے اس دربار کو روجھان مزاری کے مزاری سرداروں کی ''میری'' کی طرح لوگوں میں خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ انگریزوں نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں بلوچستان اور پنجاب کے بلوچ قبائل کو ۹ تمنوں میں تقسیم کر کے ایک تُمن مزاریوں کو عطا کی تھی۔ مزاری سردار جس نشست گاہ پر بیٹھ کر اپنے زیرِ اثر افراد اور قبائل کی قسمتوں کے فیصلے کیا کرتے تھے وہ ''میری'' کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ روایتیں ہیں کہ مزاری بلوچوں کے علاوہ سرداروں کے زیر اثر لوگ ایک دوسرے کو اعتبار دینے کے لئے اللہ' قرآن اور پیر پیغمبر کی قسمیں کھانے کی بجائے ''میری'' پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتے تھے۔ ان کا خدا ''میر صاحب'' اور تقدیر سنگ و خشت سے بنی ''میری'' تھی۔ مزاری سرداروں کا روایتی جاہ و جلال مٹی میں مل گیا ہے مگر ''میری'' کی باقیات آج بھی موجود ہیں اور ''میری'' کی آبرو پر مر مٹنے والوں کی بھی کمی نہیں۔

۱۸۰۶ء میں تعمیر ہونے والا قلعہ میر پور خاص ۱۸۴۱ء میں بتدریج زمین بوس ہونے لگا تو ۱۸۵۴ء میں اس کی مرمت کرائی گئی مگر ۱۸۹۲ء میں اس کی خستہ حالی کے پیشِ نظر اسے مسمار کر دیا گیا۔ اس قلعہ کے آثار قیامِ پاکستان کے بعد تک موجود تھے۔ قلعے کی فصیل کا ایک کونہ ۱۹۶۶ء تک برقرار رہا مگر جب بزرگ مکھن شاہؒ کے مزار کی تعمیرِ نو کی گئی تو قلعہ کے اس آخری برج کی مٹی درگاہ میں استعمال کی گئی اور یوں یہ تاریخی یادگار یادداشتوں کا حصہ بن کر رہ گئی۔ روایت ہے کہ جب میر پور خاص کا قلعہ تعمیر کیا جا رہا تھا تو یہاں پہلے سے موجود معروف دُرویش مکھن شاہؒ کے دربار کی وجہ سے قلعہ کی ایک فصیل میں کجی پڑ رہی تھی۔ تعمیراتی عملہ اس دربار کو ہٹانا چاہتا تھا مگر مقامی لوگوں کی مکھن شاہؒ سے بے پناہ عقیدت کے باعث دربار کو مسمار کرنے کا فیصلہ واپس لے لیا گیا۔ ۱۶۰/ سال بعد میروں کا سرکاری قلعہ اور دربار صفحہ ہستی سے مٹ گیا مگر اللہ کی برگزیدہ ہستی کا مزار اور دربار آج بھی زندہ جاوید ہے۔ دنیاوی حکمران باقی رہے نہ ان کا جاہ و جلال' دُرویش کا آستانہ آج بھی مرجع خلائق ہے اور یہاں ہر سال مکھن شاہؒ کا عرس بھی منایا جاتا ہے۔

اقبال کی آواز پر تاریخ کے اوراق پھڑ پھڑانے لگے اور میں اپنی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

""ہم میرپور خاص پہنچ گئے ہیں۔"" وہ خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے خود بھی اپنے وجود میں خوشی کی ایک لہر دوڑتے ہوئے محسوس کی۔

میرپور خاص پہلے بھی اجلا اجلا اور نکھرا نکھرا شہر تھا مگر ڈویژنل صدر مقام کا مرتبہ پانے کے بعد اس میں مزید نکھار آ گیا ہے۔ سڑکیں صاف ستھری اور چوڑی دکھائی دیں اور کئی نئی عمارتیں وجود میں آ چکی ہیں۔ کئی نئے اسپتال، اسکول، کالج اور کھیلوں کے میدان تعمیر ہو چکے ہیں۔ کاروباری زندگی بھی پہلے سے کہیں زیادہ پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ اردگرد کے علاقوں سے مختلف قبائل کے کھاتے پیتے لوگ کثرت کے ساتھ یہاں بس گئے ہیں جبکہ تقسیم ہند کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آنے والے اردو بولنے والوں کی بڑی تعداد نے بھی اسے مستقل رہائش کے لئے منتخب کیا ہے۔ سندھیوں اور اردو بولنے والوں نے اپنی اپنی سیاسی اور سماجی حیثیت میں حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے اس لئے یہاں دوسرے علاقوں کی نسبت عصبیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ شہر سندھی اور مہاجر تمدن کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اب اس کی آبادی پانچ لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔

یہ شہر میرے لئے اجنبی نہیں ہے" میں یہاں اس وقت سے آ رہا ہوں جب یہ لاکھ سوا لاکھ کا شہر ہوتا ہوگا۔ یہ شہر مجھے اس لئے بھی اچھا لگتا ہے کہ یہاں میرے دوست ہیں۔ احمد سعید قائم خانی اور لالا عبدالخالق خان کی محبتوں کو کیسے فراموش کیا جا سکتا ہے۔ مہمان نوازی کے آداب کوئی ان سے سیکھے۔ ان کا وصف یہ ہے کہ یہ سرتاپا مہمانوں پر نچھاور ہو جاتے ہیں۔ مجھے پتہ ہے جب انہیں میری میرپور خاص آمد کا علم ہوگا تو دونوں بہت ناراض ہوں گے مگر خیر ہے میں انہیں منالوں گا۔ لالا عبدالخالق خان کو منانا ذرا مشکل ہوگا۔ بولیں گے:

""خادو جان!! آپ نے اچھا نہیں کیا" آئے اور چپکے سے چل دیئے" ہم مر گئے تھے کیا؟ ایک فون کر دیا ہوتا" آپ کا بھائی میرپور خاص کے داخلی دروازے پر آپ کو گلے لگانے کے لئے بے تاب کھڑا ہوتا۔ آپ کے کراچی والے دوست کیا سوچیں گے" ہم اتنے بھی غریب نہیں ہیں یار؟" لالا عبدالخالق کی اپنائیت کا کوئی بدل نہیں۔

لالا عبدالخالق خان کے والد شین گل خان ۱۹۲۳ء میں قندھار کے قصبے شوراوک سے ہجرت کر کے میرپور خاص آئے اور پھر پلٹ کر نہیں گئے۔ وہ ملور کے اچھے پہلوان تھے۔ قندھاری

ملھو اور سندھی ملھو ملتی جلتی کشتی ہے۔ شین گل خان کا ذریعہ معاش یہی تھا" زور آزمائی کر کے شہرت سمیٹتے رہے اور بچوں کا پیٹ بھی پالتے رہے۔ ایک معرکے میں ایک بازو ضائع ہو گیا تو گھر کی ذمہ داری جوان سال لالا عبدالخالق پر آن پڑی۔ انہوں نے محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ سلسلہ تعلیم بھی جاری رکھا" ان کی محنت اور ایمانداری رنگ لائی اور وہ بہت جلد اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے۔ سندھ یونیورسٹی سے دو شعبوں میں ماسٹرز کیا اور اس دوران اپنا کاروبار جمانے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ آج لالا عبدالخالق کا شمار میر پور خاص کے کامیاب تاجروں میں ہوتا ہے۔ لالا سادہ لوح" درد مند اور محبت کرنے والے انسان ہیں" ان کا حلقہ احباب وسیع اور دستر خوان کشادہ ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ میرا شمار بھی ان کے دوستوں میں ہوتا ہے۔

مجھے شہر عمارتوں کی وجہ سے نہیں بلکہ وہاں کے لوگوں کی وجہ سے اچھے لگتے ہیں۔ میر پور خاص کے لوگ اچھے ہیں اس لئے یہ شہر بھی مجھے اچھا لگتا ہے۔ میر پور خاص یا کہیں اردگرد جاتا ہو" میری کیا مجال کہ میں ان دوستوں سے ملے بغیر نکل جاؤں۔ مگر اس بار میرے دوستو! مجھے معاف کرنا" بار زندہ صحبت باقی۔ میں احمد سعید قائم خانی اور لالا عبدالخالق خان سے دل ہی دل میں معذرت کرتا رہا اور ہماری گاڑی تھر کو جانے والے ایک راستے نوکوٹ روڈ پر رواں دواں ہو گئی جہاں راستے میں کئی اہم شہر پڑتے ہیں جنہیں کئی جنگجوؤں کی ""میزبانی"" کا شرف حاصل ہوا۔ یہ علاقے آج بھی ان کی آمد کے نشانوں کا پتہ دیتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق ان کے حملوں اور لگائے گئے چرکوں سے بھرے پڑے ہیں۔ محبت فاصلے سمیٹتی ہے اور نفرت فاصلوں کو بڑھاتی ہے۔ یہاں آنے والوں نے کبھی نفرتوں کے بیج بو کر مقامی لوگوں سے فاصلے بڑھا لئے تو بعض نے محبتوں کی سوغات بانٹ کر ان دوریوں کو ابدی قربتوں میں بدل دیا۔ تاریخ نفرت اور محبت کے ایسے ہزاروں حوالوں سے بھری پڑی ہے۔ تاریخ سے بڑی اور معتبر کوئی شہادت نہیں ہو سکتی۔ تاریخ کا نوحہ میری سماعتوں سے ٹکرا رہا ہے۔ جنگی ترانوں اور نعروں کی گونج میں میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے ہیں۔ میں نے انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں۔

میر پور خاص اس علاقے کا بڑا" تجارتی مرکز تو ہے ہی" اس کے علاوہ یہ کئی مشہور شہروں کا گیٹ وے ہے۔ ایک اہم راستہ تو یہی ہے جس پر ہم جا رہے ہیں۔ یہ میر واہ گور چانی" ڈگری" ٹنڈو جان محمد اور جھڈو کے قصبوں سے ہوتا ہوا نوکوٹ جاتا ہے جہاں سے تھر کا اہم ""شہر"" مٹھی صرف

۴۵ رکلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ میر پور خاص سے نوکوٹ ۹۵ رکلو میٹر کی مسافت پر ہے۔ میر پور خاص کی طرح نوکوٹ بھی گیٹ وے ہے جہاں سے ایک سڑک نبی سر' کنر ی' دوسری مٹھی' اسلام کوٹ' تیسری سڑک ڈیپلو اور چوتھی وانگو کے راستے لاڑ کے سیاسی' ثقافتی مرکز بدین سے جا مصافحہ کرتی ہے۔ میر پور خاص سے شمال مشرق کی جانب دوسرا اہم راستہ عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے چھور اور پھر مٹھی کو جا نکلتا ہے' عمر کوٹ سے ایک سڑک جودھ پور بھارت جا نکلتی ہے۔ شمال میں ایک راستہ میر پور خاص کو سانگھڑ اور نوابشاہ کے اضلاع سے جوڑتا ہے اور شمال ہی سے ایک اور راستہ کھپر و سے ہتھنگو جا نکلتا ہے جہاں تھر اور بھارت کی سرحدیں گلے مل رہی ہیں۔ ہتھنگو کے قریب نمک کی وسیع کانیں ہیں۔ یہ علاقے بھی اب کاروباری مراکز کی شکل اختیار کر چکے ہیں

میر پور خاص کے علاقوں کی اہم فصلیں گندم ' کپاس اور گنا ہیں۔ میر پور خاص میں آموں اور کیلے کے وسیع باغات بھی ہیں۔ آموں کے ترقی پسند کاشت کاروں نے اس کاروبار کو بام عروج پر پہنچا دیا ہے اور اب یہ کاروبار ایک صنعت کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ ویسے تاریخی سچائی یہ ہے کہ مقامی لوگوں کو یہ ترغیب ۱۹۲۶ء میں انگریزوں نے ہی دی اور اس کاروبار کو وسعت دینے کے لئے مقامی لوگوں کی رہنمائی کی۔ یہ علاقے افرادی قوت اور زراعت کے روایتی اوصاف سے تو مالا مال تھے' انگریزوں کی ذرا سی سر پرستی اور رہنمائی سے ان علاقوں میں سبز انقلاب آ گیا اور زرعی پیداوار کئی گنا بڑھ گئی۔

انگریزوں کا یہ وصف انہیں دوسرے حملہ آوروں پر فوقیت دیتا ہے کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں بنیادی انسانی ترقی کے معاملات کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔ نہ صرف ذرائع آمد و رفت کو وسعت دیتے ہیں بلکہ مقامی صنعت و حرفت کے لئے تمام وسائل بروئے کار لاتے ہیں۔ گو کہ ان کی آمد کا بنیادی مقصد مقامی علاقوں سے دولت سمیٹ کر اپنے ملک کو روانہ کرنا ہوتا ہے مگر وہ مقامی آبادی پر غالب آنے کے بعد پہلی فرصت میں ان کے دل جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے لئے وہ خطیر رقوم خرچ کر کے بیراج' سڑکیں' پل' ریلوے لائن' کارخانے تعمیر کرتے ہیں اور مقامی معیشت کی ترقی کے لئے بھی منصوبہ بندی سے کام کرتے ہیں۔ اردو زبان آج جس مقام پر ہے اس میں بھی انگریزوں کے قائم کردہ فورٹ ولیم کالج کی خدمات کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ انگریز جب برِ صغیر پر قابض ہوئے تو انہوں نے یہاں ترقی کے نئے دور کا آغاز کیا جو مقامی حکمرانوں کے

مقابلے پر کارکردگی کے اعتبار سے زیادہ ذمہ داری کا تاثر چھوڑ گیا ہے۔ چونکہ یہ علاقہ زرعی اعتبار سے زیادہ کارآمد تھا اور پانی کی بھی فراوانی تھی تو انگریزوں نے یہاں قدم جماتے ہی زرعی ترقی کو اپنی اولین ترجیحات میں رکھا۔ انہوں نے یہاں نہری نظام قائم کیا' بند اور بیراج بنائے اور دریائے سندھ سمیت یہاں کے تمام دریاؤں کے پانی کی تقسیم کو قواعد وضوابط میں لانے کی کوششیں بروئے کار لائے۔ انگریزوں کے انقلابی فیصلوں اور اقدامات سے سندھ اور پنجاب میں صحیح معنوں میں زرعی ترقی کی بنیادیں پڑیں۔

میر پور خاص آموں کے حوالے سے بڑی شہرت رکھتا ہے۔ یہاں آم کے باغات قائم کرنے کا رواج بہت پُرانا تھا لیکن اس کو ایک صنعت کے طور پر رواج دینے اور پروان چڑھانے میں انگریزوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ آم کی درآمدات کو بڑھاوا دینے کا سہرا انگریزوں کے سر ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ان علاقوں سے بڑے پیمانے پر عمدہ قسم کے آم بیرونِ ملک برآمد کئے جاتے ہیں اور کروڑوں کا زرِمبادلہ کمایا جاتا ہے۔ یہاں پیدا ہونے والے ''سندھڑی'' آم نے تو پوری دنیا کو اپنا شیدائی بنالیا ہے۔ ان علاقوں کے لوگ ہر فصل پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کو آموں کی پیٹیاں سوغات کے طور پر بھجواتے ہیں۔ اس کے علاوہ کنری اور عمرکوٹ کے علاقوں میں مرچ کی فصل بڑے پیمانے پر کاشت کی جاتی ہے۔ کنری کے لوگوں کا تو دعویٰ ہے کہ وہاں ایشیا کی سب سے بڑی مرچ منڈی ہے۔ اس دعویٰ کی حقیقت جاننے کی بحث میں پڑے بغیر اس دعویٰ سے یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ وہاں مرچ کی کتنی پیداوار ہوتی ہوگی۔



وڈیروں کی نجی جیلیں

میر پور خاص سے نکلتے ہی زندگی کے رخ اور رنگ بدل جاتے ہیں۔شہروں کے اپنے رنگ روپ ہوتے ہیں مگر یہاں نقشہ مکمل طور پر تبدیل ہو گیا ہے۔میر پور خاص سے نکل کر میر واہ کی طرف سفر کرتے ہوئے ہمارے اطراف کے سارے منظر بدل گئے ہیں۔یہاں غربت نے ہر طرف ڈیرے جما رکھے ہیں۔سروں پر میل سے اٹی رنگین سندھی ٹوپیاں پہنے' میلی اجرکیں اوڑھے گرد آلود لڑکھڑاتے وجود' مدقوق چہرے' الجھے بال' پھٹے پُرانے لباس۔ایسے لگتا ہے' لوگ زندگی کو گھسیٹ رہے ہیں یا زندگی ان کے کاندھوں پر بوجھ ہے۔ان کی زندگیوں میں کوئی خوشی نہیں' یہ غلاموں کے گھر پیدا ہوئے غلام ہیں اور غلام جنم دے کر مر جائیں گے۔اندھیروں کا مقدر لے کر دنیا میں آئے تھے' اندھیرے کا کفن لپیٹ کر قبروں میں اتر جائیں گے۔

''کولہو کے بیل۔'' میں نے خود کلامی کی۔

''کون؟'' افضل نے پوچھا۔ایسے لگتا ہے کہ اس نے کان میرے ہونٹوں پر رکھے ہوئے ہیں۔میں اس کی توجہ پر دل میں اسے سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

''یار! یہی لوگ..... یہ ہاری' یہ جو زمین پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں۔ انہیں ذرا بھی اپنی زندگی بدلنے کا ہوش نہیں۔'' میں ان دیہاتیوں کی حالتِ زار پر دہل گیا ہوں۔ اچانک میرے اندر کالج کے زمانے کا باغی جاگ گیا جسے میں نے کئی برسوں سے سمجھا بجھا کر سلا دیا ہے۔میں جب بھی کبھی ایسے علاقوں میں جاتا ہوں' ناانصافی اور عدم مساوات دیکھ کر میرا خون

کھول اٹھتا ہے لیکن جوں ہی میں کراچی پلٹتا ہوں میرے اندر کا انقلابی نوجوان مصلحت اور مجبوری کی چادر اوڑھ کر ان حقیقتوں سے منہ چھپا لیتا ہے۔قومی مفادات پر وقتی مفادات کی چادر تن جاتی ہے۔میں اپنی کمزوریوں کو نظام کی کمزوریوں میں چھپا کر دل کو بہلا لیتا ہوں تو تسلی سی ہو جاتی ہے۔ حالات اور کمزور نظام نے مجھے مصلحتوں کی راہ پر لگا دیا ہے۔

''وڈیروں نے ان کی زندگیاں یرغمال بنا رکھی ہیں۔'' اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''آپ اخبار والے ہو' ان ناانصافیوں اور ناروا اونچ نیچ کے خلاف آواز کیوں نہیں اٹھاتے؟'' اس کے لہجے میں مایوسیوں میں لتھڑی ہوئی التجا تھی۔

''یار لکھنے والے نصف صدی سے زیادہ ہو گیا ہے لکھ رہے ہیں' صفحات کے صفحات کالے ہو چکے ہیں' کوئی شنوائی نہیں ہے۔' ساری تحریریں فضاؤں میں گم ہو گئی ہیں۔روشنی کی آس میں کروڑوں آنکھیں بے نور ہو گئیں ' دل کے دیئے بھی بجھ گئے ۔تاریک راہوں میں سیکڑوں ہزاروں لوگوں نے جان کے نذرانے بھی پیش کیے مگر امید کی کوئی کرن نظروں میں نہیں آئی۔اس ملک کے عوام کے مقدر میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔اس ملک میں خواب دیکھنے والی آنکھوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہے۔ملک کے وڈیروں ' صنعت کاروں' سول بیوروکریسی' ملٹری بیوروکریسی اور ان کی آلہ کار مافیاؤں نے فیصلہ سازی کے اختیار پر قبضہ کر رکھا ہے۔عوام کے پاس ایک چھوٹی سی خوشی تھی کہ وہ اپنا ووٹ اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے تھے' ان سے یہ خوشی بھی چھین لی گئی ہے۔ اب حکومتیں بنانے اور گرانے کے فیصلے پولنگ اسٹیشنوں پر نہیں کہیں اور ہوتے ہیں۔عوامی ضرورتوں اور مسائل سے ناآشنا ایک مخصوص طبقہ ہے جو قومی وسائل پر قابض ہے۔یہ جو ایوانوں میں بیٹھے ہیں نا' انہیں اپنی تجوریاں بھرنے سے فرصت نہیں' ان محروموں کا احساس وہ کیوں کریں گے۔ان کے دوزخ بھریں گے تو شاید انہیں ان کا خیال آ جائے۔'' میں مسلسل بڑبڑا رہا تھا مگر میری آواز میں بھی دم نہیں تھا۔مایوسی اور بے چارگی میں ڈوبے میرے الفاظ خود مجھے اخلاص سے خالی محسوس ہوئے۔افضل اور میرا دکھ سانجھا ہے مگر ایک فرق واضح ہے۔ان پڑھ ہونے کے باوجود اس کی آنکھوں میں تبدیلی کے جگنو جگمگا رہے ہیں اور میں صحافی ہونے کے باوجود مستقبل سے مایوس۔مجھے دور دور تک اندھیرے کی ایک چادر سی تنی دکھائی دیتی ہے۔میری زبان گنگ ہو گئی۔میری قوتِ گویائی سلب ہو چکی ہے۔

میر پور خاص' نوکوٹ روڈ انتہائی خستگی کا شکار ہے اور دو رویہ بھی نہیں۔ آئے دن اس سڑک پر ٹریفک کا دباؤ بڑھتا چلا جا رہا ہے' جس کی وجہ سے حادثات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ۵۲ /برسوں میں اسے وسعت دینے کی کسی کو توفیق نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ ہو یا پیپلز پارٹی' سب کو اپنا اُلو سیدھا کرنے کی فکر ہے' انہیں ان علاقوں کے بے نواؤں کی قطعی پروا نہیں۔ کہتے ہیں تھوڑا بہت جونیجو کے دور میں اس علاقے میں کام ہوا تھا' نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد' پھر کوئی پلٹ کر نہیں آیا۔ سڑک کے اردگرد کہیں کہیں اِکا دُکا درخت نظر آ جاتا ہے۔

دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ حیدرآباد میں دیا جانے والا ناشتہ لمبے سفر کے لئے ناکافی ثابت ہوا' گرمی کی وجہ سے پیاس کی شدت میں بھی اضافہ ہوگیا۔ میں نے گائیڈ سے پانی کا ایک گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ آتی جاتی گاڑیاں دُھول اڑاتی جاتی تھیں۔ دھوئیں اور گرد کے بادل فضاؤں میں بس کر رہ گئے۔ میرا تو دم گھٹنے لگا' میں نے موسم کی حدت کے باوجود اپنی طرف کا شیشہ چڑھا لیا۔ میرے شریکِ سفر ابھی تک نشستوں میں دبکے اونگھ رہے تھے۔ دھواں اور گرد اُن کے نتھنوں میں گھسی تو ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ان میں سے کئی وحشیانہ انداز میں کھانسنے لگے۔ ایک جنگ گروپ کے غلام محی الدین بھائی تھے جو آدھی ناک پر چشمہ جمائے گردونواح کا جائزہ اور مستقل نوٹس لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنا سیاہ چرمی بیگ گود میں دبا رکھا تھا اور اپنا کیمرہ مستقل اپنے گلے کا ہار بنایا ہوا تھا جو چوبیس گھنٹے ان کے موبائل دفتر کا لازمی حصہ ہے۔ دوسروں کے لئے میں حیران ہوں۔ کیا کرنے آئے ہیں یہ لوگ یہاں؟ مستقل مشاہدہ کے بغیر مطالعاتی سفر بے کار ہوتا ہے۔ سفر میں آنکھ اور دماغ کے روزن کھلے رکھنے چاہئیں مگر بیشتر نشستوں میں منہ دیئے خراٹے لے رہے ہیں۔ مجھے ان پر حیرت ہوئی۔ میر پور خاص سے جھڈو کا ٦٦ کلومیٹر کا سفر کراچی سے میر پور خاص تک کے طویل سفر سے زیادہ صبر آزما ثابت ہوا۔ کہاں جیسی تیسی ''موٹر وے'' اور کہاں یہ ٹوٹی پھوٹی نوکوٹ روڈ۔ جھٹکوں سے کمر کمان ہوگئی ہے۔ ان راستوں کے سفر میں کئی مقامی مریض اسپتالوں تک رسائی سے پہلے ہی خالقِ حقیقی سے جا ملتے ہوں گے اور بقول ہمارے مقامی صحافی دوستوں کے کہ کئی بار حاملہ خواتین راستے ہی میں وقت سے پہلے بچے جنم دے دیتی ہیں۔ نہ دائی کی احتیاج نہ لیڈی ڈاکٹر کی مجبوری۔

جھڈو جاتے ہوئے ڈگری اور ٹنڈو جان محمد سے گزرے تو بزرگ صحافی مشتاق نیاز اور

افتخار گاندھی بھی یاد آئے کہ ان سے بھی دیرینہ نیاز مندی ہے۔ مشتاق نیاز کی چھوٹی سی دکان ''مشتاق نیوز ایجنسی'' دُھول اڑاتی نوکوٹ روڈ پر ہی ہے۔ وہ پچھلے دو ڈھائی عشروں سے ڈگری میں نوائے وقت کے لئے نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی کم گوئی' سادگی' نیاز مندی' محنت اور ایمانداری کا مکمل نمونہ ہے۔ ایسے لوگ صحافت پر احسانِ عظیم ہیں۔ میرا جب کبھی ڈگری آنا ہوا' ان سے مل کر میرا ایمان تازہ ہو جاتا ہے مگر اس بار ان سے ملاقات ممکن نہیں تھی' اس لئے انہیں گاڑی ہی میں سے دل ہی دل میں سلام کہا اور گرد اڑاتے' گرد پھانکتے آگے نکل گئے جہاں جھڈو میں ہمارے میزبان بڑی بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے دیکھا' مشتاق صاحب اپنا نظر کا روایتی چشمہ لگائے لکھنے میں مصروف تھے۔ زندگی یوں ہی گزر جائے گی آرام کے ساتھ۔

سندھ میں ہاریوں کی مظلومیت اور زمیندار طبقہ کی جانب سے ان پر روا ظلم وستم کی داستانیں اکثر سننے میں آتی رہتی ہیں۔ ۷۰ کی دہائی میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کے دور اقتدار میں ہونے والی اصلاحات میں ہاریوں کو حقوق دینے کی بات کی گئی تو وڈیرہ شاہی کی صفوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ بھٹو صاحب کے اقدامات سے طاقتور جاگیردارری سماج کو آنچ آئی کہ نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے دور میں ہاریوں کو اپنے حقوق کے بارے میں آگاہی ہوئی اور وہ استبداد کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ دور تھا کہ جب وڈیروں اور ہاریوں کے مابین صدیوں سے جاری خاموش جنگ نے کھلی لڑائی کی شکل اختیار کر لی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں سندھ میں ہاریوں کی تحریک نئے زاویوں کے ساتھ ابھری اور مظلوم ہاریوں کو زبان مل گئی۔ جن جاگیروں پر وڈیرے ہاری خاندانوں کو یرغمال بنا کر رکھتے تھے صحافی دوستوں نے انہیں نجی جیلوں کا نام دیا۔

سندھ میں پہلی نجی جیل کا انکشاف نوے کی دہائی میں ہوا جب ۱۹۹۲ء میں میاں محمد نواز شریف کے دورِ حکومت میں ٹنڈو الہ یار کے علاقے شیخ بھرکیو کے معروف زمیندار غلام حسین کھوکھر کے قلعہ نما کوٹ میں نجی جیل دریافت ہوئی۔ سندھ کے ایک بڑے زمیندار کی جاگیر پر نجی جیل سے سرکاری اعانت سے بڑی تعداد میں ہاریوں کی بازیابی کے بعد تو جیسے سندھ میں نجی جیلوں کے انکشافات کا تانتا بندھ گیا۔ ایسا محسوس ہونے لگا کہ پورا سندھ نجی جیل بنا ہوا ہے اور سندھ کے تمام زمیندار اتنے ظالم ہیں وہ اپنے کھیتوں میں کام کرنے والوں کو قیدی بنا کر رکھتے ہیں۔ نجی

جیلوں کے معاملے کو ملکی، غیر ملکی ذرائع ابلاغ نے بہت مرچ مسالا لگا کر پیش کیا۔ اسے بہت اچھالا گیا' اس کا نقصان بھی ہوا اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ ہوا کہ نجی جیلوں کے حوالے سے پاکستان کی انسانی حقوق کے معاملہ پر دنیا بھر میں کافی رسوائی ہوئی اور فائدہ یہ ہوا کہ وڈیرے محتاط ہو گئے اور ہاریوں کے حوالے سے اپنی روایتی پالیسیاں بدلنے لگے۔

۱۹۹۲ء میں زمیندار غلام حسین کھوکھر کی نجی جیل کا کھوج لگائے جانے کے بعد شاید ہی کوئی مہینہ ایسا ہو کہ جب سندھ میں کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی علاقے میں نجی جیل کا انکشاف نہ ہوا ہو۔ لیکن چند زمیندار جن میں غلام حسین کھوکھر' سلیم بگٹی' عبدالرحمان مری' مرید خان مری' غلام قادر مری' غلام قادر شر' پالوشر' ٹھاکر نذیر خان قائم خانی اور تھر کے اربابوں اور رانوں کے نام قابلِ ذکر ہیں' جن کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ انہوں نے اپنی جاگیروں میں ہزاروں ہاری خاندانوں کو مقید کر رکھا ہے۔ سندھ میں نجی جیلوں کے حوالے سے ضلع سانگھڑ' عمر کوٹ' نوکوٹ' ڈھورو نارو' کھپرو اور میر پور خاص کے کچھ مخصوص علاقے خاصے بدنام رہے ہیں۔ نجی جیلوں کے حوالے سے یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ غلام حسین کھوکھر کی نجی جیل ایسی تھی جس میں بازیاب ہونے والوں میں کولہی برادری کے علاوہ مسلمان ہاری خاندانوں کے افراد بھی شامل تھے جبکہ اس کے علاوہ سندھ میں اب تک جتنی بھی نجی جیلیں دریافت ہوئی ہیں' ان سے بازیاب ہونے والے تمام افراد کا تعلق کولہی برادری سے تھا۔

ہاریوں کی نجی جیلوں سے بازیابی کے اس معاملے میں ہیومن رائٹس کمیشن نے اہم کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں ٹاسک فورس قائم کی گئی جس کے کوآرڈی نیٹر شکیل پٹھان تھے اور ان کی معاونت صحافی علی حسن' آفتاب کھوکھر اور ماسٹر لال جی کر رہے تھے۔ شکیل پٹھان کے انتقال کے بعد ان کا مشن ان کی بیوہ نسرین پٹھان جو کہ بھابھی کے نام سے مشہور ہوئیں' نے جاری رکھا۔ اپنے شوہر کی وفات کے بعد وہ ٹاسک فورس کی کوآرڈی نیٹر مقرر ہوئیں۔ سندھ میں ہاریوں کی بازیابی کے لئے سرگرم قوتوں اور افراد کو مقامی وڈیروں نے غیر ملکی اداروں کا گماشتہ قرار دیا اور ان پر رقوم اینٹھنے کی تہمتیں بھی دھریں مگر ہاری ان کے کردار کے معترف تھے کہ ان لوگوں اور اداروں کی تحریک کی وجہ سے انہیں وڈیروں کی غلامی اور جبری مشقت سے نجات ملی۔

وڈیرے غلام حسین کھوکھر کی نجی جیل کے بعد ۱۹۹۳ء میں ڈھورو نارو کے علاقہ سے لال

منگریو کی نجی جیل پکڑی گئی' اس کے بعد تو سندھ بھر میں اس حوالے سے ہاہا کار مچ گئی۔ ۱۹۹۳ء میں سندھ بھر کی نجی جیلوں سے بازیاب ہونے والے ہاری خاندانوں کی عارضی رہائش کیلئے پہلا ہاری کیمپ ماتلی شہر میں اکرم واہ کے قریب قائم ہوا' جس کے انچارج ماتلی میں عیسائی مشنری اسکول کے ٹیچر ماسٹر لال جی بنائے گئے۔ اس ہاری کیمپ میں سندھ کے مختلف علاقوں سے بازیاب کئے جانے والے اقلیتی کولہی برادری کے ہاری خاندانوں کے ساڑھے چھ ہزار افراد کو پناہ دی گئی۔

۱۹۹۶ء میں کھپرو' ضلع سانگھڑ میں زمیندار عبدالرحمان مری کی جاگیر سے انسانی حقوق کی علم بردار تنظیموں اور انتظامیہ کی مدد سے ایک ہی خاندان کے ایسے بیالیس افراد بازیاب کرائے گئے جن سے وہاں مبینہ طور پر جبری مشقت لی جارہی تھی۔ بعد میں بااثر وڈیرے عبدالرحمان مری نے ۸ اور ۹ ستمبر ۱۹۹۸ء کی درمیانی شب مریم آباد ماتلی کے ہاری کیمپ پر دھاوا بول کر اس پورے بھیل خاندان کو بزورِ طاقت اغوا کرلیا۔ اس خاندان کا سربراہ منوں بھیل آج بھی اپنے پیاروں کی بازیابی کے لئے مارا مارا پھر رہا ہے۔

۱۹۹۸ء میں مقامی صحافی علی حسن اور ان کے ساتھیوں نے ''آزاد ہاری یونین'' کی بنیاد ڈالی۔ علی حسن اس یونین کے وائس چیئرمین اور آفتاب کھوکھر کو آرڈی نیٹر نامزد کئے گئے اور اس تحریک نے اس موقع پر ایک نیا موڑ لیا۔ ماتلی ہاری کیمپ کے بعد سندھ کے مختلف مقامات ہوسڑی' کوٹڑی' سکندر آباد' اڈیرو لعل' جامشورو میں مزید ہاری کیمپ قائم کئے گئے۔ ہیومن رائٹس اور آزاد ہاری یونین کے ذرائع سے ملنے والے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت سندھ بھر میں زمینداروں کی نجی جیلوں سے بھاگ کر یا بازیاب کرائے جانے والے ۲۸ ہزار ہاری ان کیمپوں میں آباد ہیں اور محنت مزدوری کر کے اپنی گزر بسر کر رہے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سندھ بھر میں قائم وڈیروں کی نجی جیلوں میں اٹھارہ لاکھ ہاری جبری کھیت مزدوری پر مجبور ہیں۔ ان میں عورتیں' بچے اور بوڑھے بھی شامل ہیں۔

سندھ میں نجی جیلوں کے اس معاملہ نے اتنی شہرت پائی کہ حکومت' میڈیا' انسانی حقوق کی علمبردار ملکی' غیر ملکی تنظیمیں سب ہاریوں کی دادرسی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ ہاریوں کی اس اندھی حمایت کا نقصان یہ ہوا کہ اس سے سندھ میں کھیتی باڑی کے روایتی نظام کو کافی دھچکہ لگا اور ہاریوں کی اکثریت خودسری پر اتر آئی۔ اس حمایت کا یہ نتیجہ نکلا کہ جس ہاری

پر بھی زمیندار کا قرض بڑھا وہ قرض کی ادائیگی سے بچنے کیلئے اپنے زمیندار پر نجی جیل میں قید رکھنے' زیادتی کرنے' جبری مشقت لینے اور کھانے کیلئے وسائل فراہم نہ کرنے کے الزامات لگا کر زمیندار کی جاگیر سے فرار ہو جاتا۔ اسے اخبارات میں بھرپور کوریج ملتی' پولیس' انسانی حقوق کی تنظیموں سے وابستہ افراد اور حکومتی اہلکار انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے رہے اور تحفظ دیتے رہے۔

نجی جیلوں کے انکشافات کے بعد تو یہ فضا بن گئی کہ کہیں سے معمولی سی بھی شکایت ملتی اور کہیں نجی جیل کا بھانڈا پھوٹتا تو میڈیا حرکت میں آ جاتا' ضلعی حکام بھی موقع پر پہنچ جاتے۔ پھر یہ نہیں دیکھا گیا کہ ہاری کا قصور کتنا ہے اور زمیندار کا کتنا؟ بس کارروائی شروع۔ زمیندار تھانے میں بند کر دیئے جاتے اور ہاری خاندانوں کو انتظامیہ کی جانب سے مہیا کی گئی ٹرانسپورٹ کے ذریعے محفوظ ٹھکانوں کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ غیر جانب دار تجزیہ نگار کہتے ہیں کہ بڑے بڑے زمینداروں کی نجی جیل یا ہاریوں پر ظلم وستم کی کہانیوں میں تو بڑی حد تک حقیقت تھی جو سمجھ میں آتی بھی ہے مگر جب ۱۰ سے ۵۰/ ایکڑ کے چھوٹے زمینداروں پر بھی نجی جیل اور جبری مشقت کے الزامات لگنے لگے اور ہاری خواتین کے ساتھ جبری زیادتی کا سن کر یہ خیال آتا کہ کیا یہ الزامات حقیقت پر مبنی ہیں یا محض ڈرامہ بازی ہے۔

جب سندھ کے زمینداروں خصوصاً ضلع بدین کے زمینداروں جن میں سابق نگراں صوبائی وزیر اور سندھ آبادگار بورڈ کے سابق صدر سید علی میر شاہ' سیٹھ وریانہ مل' غلام قادر بگھیو پر بھی نجی جیل میں جبری مشقت لینے کے الزامات لگائے گئے تو ملک بھر میں اودھم مچ گیا۔ ماتلی کے تالپور برادری کے دو سگے بھائیوں پر ہاریوں کو نجی جیل میں بند رکھنے اور فصلوں کا حساب کتاب نہ کرنے کے الزامات کے بعد مقامی صحافیوں نے محسوس کیا کہ اب یہ کہانی کسی اور طرف جا رہی ہے۔ نجی جیلوں کے تواتر کے ساتھ انکشافات والزامات کی روشنی میں ماتلی کی صحافی برادری نے اپنے طور پر ٹیم تشکیل دے کر نجی جیلوں کی حقیقت جاننے اور رپورٹ منظر عام پر لانے کا فیصلہ کیا۔ مقامی صحافیوں کی طرف سے غیر جانبدارانہ رپورٹ آنے کے بعد حکومت نے اس کا نوٹس لیا۔ حکومت کی ہدایت پر محتسب اعلیٰ اسلام آباد نے ۹۷-۱۹۹۶ء میں سندھ کا سروے کر کے تحقیقات کیں اور حقائق منظر عام پر لائے گئے تو سندھ میں نجی جیلوں کے انکشاف اور ہاریوں کی بازیابی کا معاملہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔

نجی جیل سے ہاریوں کی بازیابی اوران ہاریوں کی آبادکاری کے حقائق معلوم کرنے کے لئے میں نے ایک بار اپنے صحافی دوست اسلم قائم خانی کے توسط سے مظلوم ہاریوں کے نمائندے ہیومن رائٹس کمیشن اورآزاد ہاری یونین کے رہنما ماسٹر لال جی سے ملاقات کی تھی تو انہوں نے بتایا کہ ہاریوں کی مدد کی پاداش میں عیسائی مشنری نے انہیں ملازمت سے علیحدہ کردیا تو انہوں نے اپنی زندگی مظلوم ہاریوں کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کردی۔ ماسٹر لال جی نے بتایا کہ ہیومن رائٹس کمیشن کے ذمہ دارافراد سے ان کا اختلاف رہا کہ صرف ایک درخواست ملتے ہی کسی زمیندار کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے چھان بین ضروری ہے۔ ماسٹر لال جی نے الزام لگایا کہ بعض ترقی پسند افراد نے ہاریوں کے معاملہ کو اپنی کمائی کا ذریعہ بنالیا ہے۔انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ ہاریوں کی نمائندہ تنظیموں کو مختلف ملکی وغیرملکی این جی اوز کی جانب سے ملکی وغیرملکی کرنسی میں لاکھوں روپے دیئے گئے جن کا کوئی حساب کتاب موجودنہیں۔ ماسٹر لال جی نے یہ بھی بتایا کہ این جی اوز نجی جیلوں سے رہائی پانے والے ہاری خاندانوں کی رہائش' علاج معالجہ کی سہولیات کی فراہمی اور ہاریوں کے بچوں کو تعلیمی سہولتوں کی فراہمی کیلئے خطیر فنڈ ز فراہم کرتی ہیں مگر یہ فنڈ ز خرچ کرنے کی بجائے ہڑپ کر لئے جاتے ہیں۔

انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ بعض ''کامریڈ'' کیمپوں میں موجود ہاری خاندانوں کو کھیت مزدوری کے بہانے مختلف زمینداروں کی جاگیروں تک پہنچاتے رہے ہیں جہاں جاکر ہاری ایک بار پھر زمینداروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں اور یہ کامریڈ رقم لے کر رفو چکر ہو جاتے ہیں۔ ماسٹر لال جی نے بتایا کہ سندھ میں ترقی پسنداور روشن خیال لوگوں کو احتراماً ''کامریڈ'' کہا جاتا ہے لیکن ان مفاد پرستوں نے لفظ کامریڈ کو بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔انہوں نے بتایا کہ صرف ایک سماجی تنظیم گرین رورل ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن نے ہوسٹری کے قریب ہمت آباداورآزادنگر کے نام سے ہاریوں کی بستی بسانے کیلئے پلاٹ فراہم کئے ہیں باقی سب ادھر اُدھر سے ہاریوں کی آبادکاری کے نام پر لاکھوں کروڑوں لاتے ہیں اور ہڑپ کر جاتے ہیں' کوئی ان سے حساب لینے والا نہیں۔

میرے دوست بتاتے اور لکھتے رہتے ہیں اور خود مجھے بھی اس موضوع پر لکھنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی ہے کہ تھر سمیت سندھ کے مختلف علاقوں میں ہرطرف وڈیروں نے پولیس اور

انتظامیہ کی سرپرستی میں اپنی جاگیروں میں بیگار کیمپ قائم کر رکھے ہیں جہاں ہزاروں کولہی، بھیل، مینگوال اور دوسرے لاچار مسلمان ہاری خاندانوں کو انہوں نے نسلوں سے غلام بنا رکھا ہے۔ اطلاعات ہیں کہ تھرپارکر کے زرعی علاقوں میں بھی بڑے بڑے وڈیروں کی جاگیروں میں ہاری خاندانوں سے جبری کھیت مزدوری لی جارہی ہے۔ چونکہ یہ وڈیرے بااثر اور طاقتور ہیں اس لئے کوئی ان کے خلاف آواز بلند کرنے کی جسارت بھی نہیں کرسکتا۔ اس حوالے سے رانوں اور اربابوں کا نام کھلے عام لیا جاتا ہے۔ پاکستان میں نجی جیلوں کے حوالے سے میرے دوست اور معروف سماجی شخصیت حاجی مسعود پاریکھ کہتے ہیں کہ یہ نجی جیلیں محض وڈیروں کی جاگیروں تک محدود نہیں ہیں۔ مغرب اور امریکہ کے پروردہ وڈیروں، سول بیوروکریسی اور فوجی بیوروکریسی کے اتحاد نے پورے ملک کو نجی جیل بنا کر رکھ دیا ہے، جہاں ہماری زندگی ایک مخصوص طبقے کے رحم و کرم پر ہے۔ وہ کہتے ہیں اس ملک کا عام آدمی اتنا بے بس اور لاچار ہے کہ وہ کوئی اچھا خواب بھی دیکھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

سندھ میں ''بنیا سسٹم'' اپنے تمام سب وشتم کے ساتھ تادمِ تحریر مروج ہے۔ سود اور قرض جیسی لعنت کی جڑیں معاشرے میں بہت گہری ہیں۔ نسلوں کی نسلیں قرضوں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ زراعت کا پورا نظام اُدھار اور قرض کے محور پر گھوم رہا ہے۔ یہ ہاری بھی نام نہاد قرضوں کی آڑ میں غلام بنا کر رکھے گئے ہیں۔ سندھ کے سماج میں انگریزوں اور بنیوں کے پھیلائے ہوئے سودی جال کے تانے بانے ابھی تک موجود ہیں۔ بیگار کیمپوں میں مقید ہاریوں کے نام قرض کی کوئی حد نہیں اور کوئی حساب نہیں ہے۔ انہیں فصلوں کی بٹائی میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ ہر فصل کی بٹائی ان کے لئے ایک نئے قرض کی تقدیر لے کر آتی ہے۔ انہیں کسی بھی حال میں ان بیگار کیمپوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ علاج معالجہ کی سہولتیں تو دور کی بات ہے، ان خاندانوں کو اتنی خوراک دی جاتی ہے کہ بس سانس کی ڈوریاں ان کے بدن کے ساتھ جڑی رہیں اور وہ ان کے لئے کام کرتے رہیں۔ صدیوں سے یہ سلسلہ یونہی چل رہا ہے۔

یہاں ایسے لوگوں کی تعداد لاکھوں میں ہے جن کے لئے ان بیگار کیمپوں سے باہر کی دنیا اچھوتی ہے اور پورا ملک ان کے لئے اجنبی ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوتے ہیں اور یہیں مر کھپ جاتے ہیں۔ وڈیروں کے مسلح افراد چاروں پہر اِن پر پہرہ دیتے ہیں۔ وڈیرے اور ان کے یہ مسلح

کارندے نت ان کی زندگیوں اورعزتوں سے کھلواڑ کرتے رہتے ہیں مگران کے خلاف آواز اٹھانا ناقابلِ معافی جرم کے مترادف ہے۔ان زیادتیوں کے خلاف جوبھی آواز اٹھتی ہے خاموش کرادی جاتی ہے۔وڈیروں کے باغی اورغدار ہاریوں کی سزاعبرت ناک موت ہے۔موت کے منہ سے بچ کرعلاقائی پریس کلبوں تک رسائی حاصل کرنے والے اِکا دُکا ہاریوں کی چیخیں چند روز تک مختلف اخبارات کی سرخیاں بنتی ہیں' ہمدردی کے چند بولوں اورتنقیدی بیانوں کے بعد فضا میں پھر وہی زہر میں بجھی خاموشی بس جاتی ہے۔ان خبروں پرکبھی کوئی اعلیٰ عدالت ازخود آگاہی کے اختیار کے تحت اورکبھی کوئی اعلیٰ حکومتی شخصیت خودنمائی کے لئے ان وڈیروں کے خلاف کارروائی عمل میں لانے کی نوید سناتی ہےاورچھوٹی موٹی کارروائی کے نتیجے میں ایک آدھ ہاری خاندان کواس چنگل سے نجات مل جاتی ہے ورنہ ہزاروں خاندان اس اذیت ناک زندگی کومقدر کالکھا جان کرجھیلنے پرمجبور ہیں۔

وڈیروں کی ان نجی جیلوں کوعالمی سطح پر بڑی شہرت حاصل ہےاورپاکستان میں کئی این جی اوز ہاریوں کے نام پرسیاست چمکاتی ہیں غیرملکی ''مہربان''اداروں سے کروڑوں بٹورتی ہیں۔ مقتدرقومی ادارے پڑوسی ملک کے برعکس (جہاں آزادی کے ابتدائی دنوں ہی میں جاگیرداریاں توڑ دی گئی تھیں) ہاریوں کو وڈیرہ شاہی کی جکڑ بندیوں سے نجات دلانے میں ناکام رہے ہیں۔پاکستان میں کئی بار زرعی اصلاحات کے نام پر جاگیریں ختم کر کے اراضی ہاریوں اور کسانوں میں تقسیم کرنے کاڈرامہ رچایا گیامگراس ملک کاجاگیرداراوروڈیرہ آج بھی اتناہی طاقتور ہے جتناانگریزوں کے دورمیں تھا۔ملک کے مظلوم ہاری' کسان اورمحنت کش گورے انگریزوں کی غلامی سے نکل کراپنے ہی ہم وطن کالے انگریزوں کی غلامی میں آگئے ہیں۔جاگیردار پاکستانی اشرافیہ کے آلۂ کاربن کرمفادات سمیٹ رہے ہیں۔اس ملک کے بدقسمت انسان ''آزادی'' کے ۵۶ (اب تریسٹھ) سال بعدبھی غلاموں اورجانوروں سےبھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔

میری نگاہوں میں تحریکِ پاکستان کے مناظر کاسلسلہ چل رہاہےاورمیرے کانوں میں ''پاکستان زندہ باد'' اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعروں کی صدائیں گونج رہی ہیں۔میرے دل ودماغ میں بھونچال ساآ گیاہے۔دفعتاًمیرے ہونٹوں پربھی ''پاکستان زندہ باد'' کانعرہ مچل گیا۔میں گھبراکرپچھلی نشستوں کی جانب گھوما' میں نے دیکھا' میرے سفر کے سب ساتھی آنکھیں مسل رہے تھےاورحیرت سے میرامنہ تکنے لگے۔پھرایک زوردار باجماعت قہقہہ

فضاؤں میں بکھر گیا۔ غالباً میرا مذاق اڑایا گیا۔

معافی چاہتا ہوں یار! پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا' میں نے دل ہی دل میں ان سے اعتذار کیا اور نظریں دوسری طرف پھیر لیں۔ سڑک کے بائیں جانب سنگِ میل پر لکھا تھا' ٹنڈو جان محمد' ایک کلو میٹر۔ سخی جان محمد کا شہر بلکہ ہمارے یار افتخار کا شہر' جو صحافی بھی ہے اور سماجی خدمت گار بھی۔ افتخار گاندھی جیسے لوگ صحافت کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ جنہوں نے اپنے کردار سے ' اپنی گفتار سے ااور اپنے قلم سے اس مقدس پیشے کی ہر عہد میں آبرو رکھی ہے۔



چند سطریں ''سخی مرد'' کی نذر

جب تالپوروں نے کلہوڑوں کو شکست دے کر حیدرآباد کا اقتدار حاصل کیا تو ایک طرف ان کا پایہ تخت حیدرآباد بے مثال ترقی کی راہ پر گامزن ہوا تو دوسری طرف انہوں نے اپنے خاص مصاحبین کو جاگیریں عطا کیں جہاں انہوں نے اپنے ناموں سے ''ٹنڈو'' آباد کئے جو بعد میں بڑے شہروں کی شکل میں ڈھل گئے۔ لفظ ٹنڈو سندھی زبان کے لفظ ''تڈو'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ہے کسی پیارے کی وفات پر ہمدردوں سے تعزیت قبول کرنے کی جگہ۔ زمانہ قدیم سے سندھی سماج میں عام طور پر کھجور کی چھال سے بنی چٹائی پر بیٹھ کر پرسہ دیا اور لیا جاتا ہے' اسے ''تڈو'' کہا جاتا ہے۔ سندھی سماج میں اس کی خاص اہمیت ہے کیونکہ اگر کوئی شادی میں نہ آئے تو اس کا کفارہ قبول کرلیا جاتا ہے مگر جب کوئی وفات پا جائے اور اس کی تعزیت کے لئے دوست احباب ''تڈو'' پر حاضری نہ بھریں تو اسے نسلوں تک یاد رکھا جاتا ہے۔ اسی بنیادی اہمیت کے پیش نظر میروں کے مصاحبین نے اپنی جاگیروں میں آبادیاں قائم کرتے وقت انہیں ''تڈو'' کے نام دیئے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ کسی کے رہنے کی جگہ۔

غالب امکان یہی ہے کہ ٹنڈو اللہ یار' ٹنڈو جام' ٹنڈو مٹھا خان ' ٹنڈو سرور اور دیگر ٹنڈو آبادیوں کی طرح ٹنڈو جان محمد کی بنیاد بھی میروں کے دور میں پڑی۔ پھر جب انگریزوں نے حیدرآباد کے اقتدار پر غلبہ حاصل کرلیا تو بھی انہوں نے بعض میروں کی اطاعت گزاری پر ان کی جاگیریں اور مراعات بحال رکھیں۔ بعض روایات میں ہے کہ ٹنڈو سے مراد چھاونیاں ہیں جو

میروں نے اپنے جرنیلوں کے توسط سے آباد کرائیں۔

ٹنڈو جان محمد شہر کے قیام کی تاریخ ۱۸۱ رسال پرانی ہے۔ یہ شہر روحانی بزرگ سخی جان محمد تالپور کے نام سے منسوب ہے۔ سخی جان محمد کی وفات ۱۲۴۸ ہجری میں ہوئی۔ سخی مرد کے حوالے سے مشہور اس شہر کو سخاوت وراثت میں ملی ہے۔ سخی جان محمد ایک دُرویش صفت' ولی اللہ طبیعت کے مالک تھے جن کا روحانی تعلق درگاہ لواری شریف کے خواجہ محمد زمان سلطان اولیاء کی گدی سے تھا۔ ان کے آستانے پر سارا سال میلہ سالگا رہتا تھا۔ مرحوم کی طبیعت میں حد درجہ سادگی' متانت اور سخاوت تھی۔ انہیں زندگی میں جو بھی ملا' مقہور اور مجبور لوگوں پر لٹا دیا۔ اس در سے کبھی کوئی سائل بھوکا پیاسا اور حاجت مند خالی پیٹ اور خالی ہاتھ نہیں گیا۔ ان کی سخاوت کے قصے انگریزوں کے دربار تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز جنرل سر چارلس نیپئر نے اس بزرگ کی عظمت اور سخاوت سے متاثر ہو کر ان کی جاگیر اور مراعات بحال رکھیں تا کہ انگریزوں کے لئے مقامی لوگوں میں ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں۔ میر جان محمد خان تالپور خود نمائی اور ذاتی ضرورتوں سے بے نیاز تھے' سخی مرد نے اس جاگیر کو خدا اور خلقِ خدا کی امانت سمجھتے ہوئے اس کی آمدنی کو غریب اور نادار لوگوں کے لئے وقف کر دیا۔

سخی جان محمد المعروف سخی مرد کی سخاوت اور عجز و نیاز کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ سخاوت اس خاندان کی آئندہ تمام نسلوں تک پہچان بنی رہی۔ اس خاندان کے جس فرد کو بھی سخی مرد کی نیابت نصیب ہوئی اس نے اس شناخت پر حرف نہیں آنے دیا۔ اسی گھرانے کے میر احمد خان مرحوم بھی غریب پرور شخص تھے۔ ٹنڈو جان محمد میں میر قادر بخش تالپور کے نام سے ہائی اسکول کی شاندار عمارت اور طلباء کیلئے وسیع دارالاقامہ جس کا رقبہ ۱/۱۶ ایکڑ پر محیط ہے' اس خاندان کی علم پروری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ضلع میر پور خاص کا نمایاں اسکول ہے جہاں سے اب تک لاکھوں طلبہ فیض یاب ہو چکے ہیں اور ان میں سے کئی اہم عہدوں پر فائز ہیں۔

حاجی عبداللہ خان کے صاحب زادے میر حاجی خدا بخش تالپور سخی مرد کے خاندان کے روشن چراغ تھے۔ وہ ایوب خان کے دورِ حکومت میں رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے۔ حکومت نے ان کی بے پایاں سماجی خدمات کے اعترف میں انہیں تمغہ امتیاز دیا۔ مرحوم میر خدا بخش تالپور نے اپنی جائیداد کو بے دریغ فلاحی کاموں میں استعمال کیا۔ نواب کالا باغ امیر محمد خان جب مغربی

پاکستان کے گورنر تھے' میر پور خاص کے بعد سب سے پہلے ٹنڈو جان محمد میں گورنمنٹ ڈگری کالج کا قیام عمل میں لایا گیا جو میر حاجی خدا بخش تالپور مرحوم کی خدمات کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔اس کیلئے میر حاجی خدا بخش تالپور مرحوم نے ۱۶/۱ ایکڑ اراضی تدریسی عمارت' کھیلوں کے میدان اور دارالاقامہ کیلئے مفت فراہم کی۔اس کے علاوہ انہوں نے پبلک پارک' ٹاؤن کمیٹی کیلئے بھی مفت زمین فراہم کی۔ جب وہ بقیدِ حیات تھے تو دارالاقامہ میں مقیم غریب طلبا کیلئے مفت گندم فراہم کی جاتی تھی۔ میروں کی سخاوت اور مہمان نوازی کے سماج پر اثرات کافی گہرے ہیں' یہی وجہ ہے کہ شہرِ سخی مرد ''ٹنڈو جان محمد'' کے باشندے ابھی تک اس روایت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

مجھے افتخار گاندھی نے بتایا کہ اسی خاندان سے محبت وعقیدت کا تعلق رکھنے والے قاضی محمد اشرف مرحوم بھی انتہائی سادہ طبیعت کے مالک ' شرافت وسخاوت کا پیکرِ عظیم تھے۔انہوں نے بھی سخی مرد کے شہر ٹنڈو جان محمد میں سخاوت کی اس روایت کو زندہ رکھا جس کی بنیاد سخی جان محمد نے رکھی تھی۔ قاضی صاحب مرحوم کیلئے آج بھی لوگوں کے دلوں میں احترام اور عقیدت کا جذبہ موجود ہے۔ قاضی اشرف مرحوم کے بعد ان کے دو صاحبزادوں قاضی فیض اللہ ساند اور قاضی نور محمد ساند نے اپنے والد کی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے قاضی اشرف مرحوم کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہوا ہے' جس سے سارا سال غریب اور مستحق افراد کی مالی مدد کی جاتی ہے جبکہ مفلس اور نادار لوگوں کے علاج ومعالجہ پر بھی سالانہ لاکھوں روپے خرچ کئے جاتے ہیں۔قاضی کالونی جو کہ شہر کے وسط میں واقع ہے ' قاضی فیض اللہ نے وہاں غریب لوگوں میں مفت قطعات ارضی تقسیم کئے جو کہ چھت کی نعمت سے محروم تھے۔قاضی فیملی اس علاقے میں بہت بڑی زمینداری رکھتی ہے مگر دنیاوی نمود ونمائش نام کی بھی اس خاندان میں نہیں ہے۔ یہ لوگ غریب پرور تو ہیں ہی عاجزی اور انکساری میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ٹنڈو جان محمد میں تالپور' ڈاہری' قائم خانی' آرائیں' جاٹ' کمبھار' خاصخیلی' منگنہار' شیدی' راجپوت' کھٹی' ماچھی' دیوان' سید' مستوئی' میانہ' قریشی' بروہی' بھٹی' جبکہ اقلیتی برادری کے بھیل' کولہی' لاباری' میگھواڑ سمیت دیگر برادریوں کے لوگ صدیوں سے آباد ہیں۔ٹنڈو جان محمد سماجی' معاشرتی' کھیل کود اور صفائی وستھرائی کے حوالے سے بھی ضلع بھر میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔اس شہر کی تاریخی اہمیت کے حوالے سے ۱۹۹۰ء سے ایک تنظیم ''سخی جان محمد ادبی' سماجی اور ثقافتی تنظیم''

قائم کی گئی ہے ' یہ تنظیم تاریخی مقامات' ماحولیات اور جنگلی حیات کے تحفظ سمیت سماجی و ثقافتی حوالے سے قابلِ قدر کام کر رہی ہے۔ اس تنظیم کو قائم کرنے میں افتخار گاندھی' خیر محمد ڈاہری' ثنا اللہ جمالی' شیخ محمد شفیق' غلام رسول عرف گلو خاصخیلی' فیض محمد ڈاہری' محمد حسن زاہد' مہر مظہر الحق کی کاوشیں کارفرما ہیں۔ حال ہی میں اپنی مدد آپ کے تحت ''سخی ویلفیئر اسپتال'' کے نام سے ایک شفا خانہ بھی قائم کیا گیا ہے' جہاں ہر قسم کے مریضوں کا صرف ۲۰ روپے کی علامتی فیس کے عوض مکمل علاج کیا جاتا ہے نیز مریضوں کو ادویہ مفت فراہم کی جاتی ہیں۔ اسپتال میں ڈاکٹر حضرات مفت خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان ڈاکٹرز میں ڈاکٹر محمد اکرم طور اور ڈاکٹر ایوب کلوئی کی نمایاں خدمات ہیں۔ فیض کا سلسلہ جو سخی مرد سے شروع ہوا تھا' آج بھی اس شہر کی شناخت ہے۔

یہ شہر مہمان نوازی میں بھی اپنی مثال آپ ہے۔ مجھے اس علاقے میں کئی بار آنے کا موقع ملا ہے لیکن ان لوگوں کی مہمان نوازی کی سعادت سے محرومی میرا مقدر رہی ہے مگر ارد گرد کے شہروں ڈگری ' جھڈو کے دوستوں سے سن رکھا ہے کہ اس شہر کا ہر غریب امیر' سخی مرد میر جان محمد تالپور کے کردار اور سیرت کی مجسم تصویر ہے۔ یہ لوگ مہمانوں پر جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں مہمان نوازی کے حوالے سے ایک زمانے میں یہاں بدر دین شاہ' قاضی محمد منٹھار' بھیموں حجام' ماسٹر سا ہومل' میر ولی محمد تالپور مرحوم کی اوطاقیں مشہور تھیں جہاں غریبوں اور مستحق طلبہ کیلئے باقاعدہ کھانے کا اہتمام ہوتا تھا اور طلبا کی حصولِ تعلیم میں اس طرح مدد کی جاتی تھی کہ ان کی عزتِ نفس بھی مجروح نہ ہو۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی کہ جب بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے' ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو بانی شہر میر جان محمد تالپور کے اسوہ کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔

ٹنڈو جان محمد شہر بھی پُران کے کنارے پر آباد ہے۔ پُران کسی زمانے میں ان علاقوں کی جان تھا' اس حوالے سے آگے جا کر کچھ معلومات آپ کی بصارت کے حوالے کروں گا۔ یہیں پُران کے دوسرے کنارے پر' جو اس شہر سے صرف ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہے' آمری کا ایک قدیم قبرستان ہے۔ آمری کا یہ تاریخی قبرستان جس کے بارے میں روایت ہے کہ یہاں املی کا ایک درخت تھا جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہاں غوث بہاء الدین ذکریا ملتانیؒ نے چلہ کشی کی تھی جس کے باعث وہ جگہ متبرک بن گئی اور اس جگہ کا نام ''سمن الصالحین'' یعنی اللہ کے نیک بندوں کا مسکن' پڑ گیا۔ یہ مقام روحانیت کا مرکز بن گیا ہے اور یہاں فیوض و برکات کا سلسلہ تا

دمِ تحریر جاری ہے۔ یہاں ہر وقت لوگوں کی حاضری رہتی ہے۔

آمری کے تاریخی قبرستان سے متعلق یہ روایت عام ہے جس کا میں پچھلے صفحات میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ یہاں سے سلطان محمود غزنوی کے لشکر کا سومنات کے مندر پر حملے اور فتح کے بعد واپسی کا عمل ہوا تو تھر کے ہندوؤں نے سلطان کے لشکر کو اصل راہ سے بھٹکا دیا جس کی وجہ سے لشکر تھکاوٹ ' بھوک اور افلاس کا شکار ہو گیا اور لشکر میں ایک خوفناک وبائی مرض پھیل گیا۔ غذائی قلت اور وبائی مرض پھیلنے سے سلطانی سپاہ کے سیکڑوں سپاہی لقمہ اجل بن گئے۔ سلطان محمود غزنوی نے آمری کے مقام پر پڑاؤ ڈال کر مرنے والوں کی تدفین کی اور یہاں کئی مقابر تعمیر کروائے جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ یہاں پر اجتماعی قبریں بھی قائم ہیں جن کا طرزِ تعمیر ماضی کے تاریخی قبرستانوں سے ملتا جلتا ہے۔ کچھ روایات میں ہے کہ سلطان محمود غزنوی کا لشکر صحرائے تھر میں بھٹک گیا تھا اور پانی کی تلاش میں بوڑھیسر تالاب کے قریب کچھ عرصہ قیام پذیر رہا۔ کافی عرصہ قیام کے بعد یہ سپاہ وطن لوٹ گئیں۔

روایت ہے کہ یہ قبرستان مکلی ٹھٹھہ اور چوکنڈی کے قبرستانوں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ ٹنڈو جان محمد سے متصل ''خواجہ سداتورہ'' کا قدیم قبرستان آج بھی موجود ہے جو کہ آٹھ ایکڑ پر محیط ہے یہ قبرستان صفائی وستھرائی اور سرسبز درختوں کی وجہ سے دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ ٹنڈو جان محمد کا کاروباری حوالے سے کوئی اہم مقام نہیں مگر یہاں کے شہری تعمیری سماجی سوچ کے مالک ہیں اور معاشرتی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ سخی مرد کا یہ شہر ہندو مسلم بھائی چارے کی مثالی تصویر پیش کرتا ہے۔



جڈو سرکار کے دربار میں

جھڈو میں ہمارے میزبان عمر خان دوپہر کے کھانے پر ہمارے منتظر تھے' مگر ہمیں وہاں پہنچتے پہنچتے شام ہوگئی۔ میرے سب ساتھیوں نے بھوک' پیاس اور تھکاوٹ کے باوجود صحرا کی کڑی دھوپ سے نجات پاکر سکھ کا سانس لیا ہے۔ طویل صحرا کی مسافتیں چھان کر ہم یہاں زرخیز علاقے میں پہنچے ہیں تو شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ میں نے تپش سے پیچھا چھڑاتی صحرا کی مختصر شام میں' ہچکولے لیتی اداس فضا میں' لمبے لمبے سانس لئے تو خوشگوار احساس نے میرے وجود کو ٹھنڈک بخشی۔ تھر کا دن تن بدن جھلسا دیتا ہے' اس کی شام صحرا کی طرح اداس اور ویران مگر اس کی رات ریشم کی طرح نرم' ملائم اور گداز ہوتی ہے۔ اس کی آغوش میں سارے دن کے تھکے ہارے تھری یوں ہمکنے لگتے ہیں کہ جیسے ماں نے گود لے لیا ہو۔ جھڈو میں ڈھلتی شام کے سائے مجھے بھی غنیمت محسوس ہو رہے تھے۔ اس تھری شہر میں ' جہاں قائم خانیوں کی اکثریت آباد ہے ' مجھے قطعی اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

سندھ بھر میں قائم خانیوں سے میرے بڑے یارانے ہیں۔ میرا ایک قائم خانی یار تو نوائے وقت میں بھی برسوں میری جان کا عذاب رہا ہے' آنجہانی ذوالفقار علی خان المعروف زیڈ اے خان قائم خانی۔ اب وہ ایک بار پھر امریکہ کو پیارا ہو گیا ہے تو ہماری جان میں جان آئی ہے۔ جھڈو میں بھی حاجی لیاقت علی قائم خانی اور بابو شوکت علی قائم خانی میرے جسم و جاں ہیں۔ میری ان سے دوستی کا سلسلہ پندرہ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ میں نے جب سے نوائے وقت گروپ میں

ملازمت اختیار کی' تب سے ان کے ساتھ گہری راہ و رسم ہے۔ میں چار پانچ سال نوائے وقت میں اضلاع کی خبروں کے شعبے کا ذمہ دار رہا ہوں' میں نے اس عرصے میں بس یہی دوستیاں کمائی ہیں۔ اچھے دوست میرے جیسے مولائیوں کے لئے جائیداد سے کم نہیں ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ جھڈو میں مجھے رفاقت دینے کے لئے میرے دونوں مختلف المزاج دوست' جو آپس میں بھائی ہیں' سراپا عجز و نیاز موجود تھے۔ ہم عمر خان کی رہائش گاہ کے احاطے میں گاڑی سے برآمد ہوئے تو دونوں بھائیوں نے روایتی مسکراہٹ اور پھیلی بانہوں کے ساتھ مجھے اپنی امان میں لے لیا۔

عمر خان اور ان کے معاونین نے رسمی علیک سلیک کے بعد ہمیں مشورہ دیا کہ ہم پہلے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالیں' باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ سارے دن کے تھکے ہارے اور بھوکے پیاسے مسافروں کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا ترغیب ہو سکتی ہے۔ مجھے کھانے سے زیادہ چائے اور تمباکو کی طلب ہو رہی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر سارے ساتھی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ عمر خان نے اجنبی مہمانوں کے لئے خاصے پُر تکلف کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ایک طرف پورے صحرائے تھر کو بھوک اور پیاس نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے' یہاں میرے سامنے شفاف پانی کی بوتلیں اور انواع و اقسام کے کھانے رکھے ہیں۔ یہ خیال میرے ذہن میں کوندا تو میرے کھانے کا مزہ کرکرا ہو گیا۔ میں نے کھانے سے ہاتھ کھینچا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا ہوا خاور بھائی! آپ نے اتنی جلدی ہار مان لی۔ کچھ تو اور لیتے' آپ نے کھایا ہی کیا ہے؟'' بابو شوکت نے احتجاج کیا۔

''بس یار جی بھر گیا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔

''اگر گرما گرم چائے مل جائے تو مزہ آجائے۔'' میں نے بیسن پر ہاتھ دھوتے ہوئے بابو شوکت کے کان میں کھسر پھسر کی۔

''کیوں نہیں چائے بھی تیار ہے۔ دوست کھانے سے فارغ ہو جائیں تو چائے بھی لگا دیں گے۔'' بابو نے دھیرے سے جواب دیا۔

''نہیں یار! یہ لوگ بہت دیر لگائیں گے' میں چاہ رہا تھا کہ ہم چائے پی کر کچھ دیر کے لئے یہاں سے نکل جائیں' میں اس شہر میں گھومنا اور اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتا ہوں جو اس کے بارے میں مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کر

سکے۔ ہمارے پاس گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہے' میں وہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔''

''آؤ پھر چپکے سے نکل چلیں' چائے آپ کو کہیں راستے میں پلا دوں گا۔ جہاں تک جھڈو کے بارے میں معلومات کا مسئلہ ہے تو وہ میں ہوں نا' اس شہر کے بارے میں مجھ سے زیادہ کس نے پڑھا اور لکھا ہوگا۔ میں آپ کو شہر گھماتا رہوں گا اور اس کے بارے میں بتاتا بھی رہوں گا۔'' بابو شوکت علی قائم خانی کی تجویز بہت معقول تھی اور میں نے اسے ماننے میں ذرا تردد نہیں کیا۔ ہمارے رفقائے سفر ابھی تک پیٹ پوجا میں مصروف تھے اور ہم خاموشی سے کھسک لئے۔

''بابو ذرا جلدی سے دو ڈنڈا سروس چائے بنانا' مزہ آجائے' بھائی کراچی سے آئے ہیں' یاد کریں کہ جھڈو میں تیرے ہاتھ کی چائے پی تھی۔'' بابو شوکت نے بھرے بازار میں چائے کے ایک اسٹال پر رکتے ہوئے کہا۔ چائے والے نے علیک سلیک کی' سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا اور جلدی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ ہم نے اسٹال کے آگے دھرے چوبی تخت پر نشستیں سنبھال لیں۔ لمحے بھر میں اسٹال کا چھوٹو پانی کا جگ اور گلاس تھامے ہمارے سامنے کھڑا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں اُسی چھوٹو نے کپکپاتے ہاتھوں سے چائے کی پیالیاں ہمیں تھما دیں۔

''خاور بھائی! جھڈو صحرائے تھر کا قدیم اور تاریخی شہر ہے جو ۱۷ ویں صدی عیسوی میں کلہوڑوں کے دورِ حکومت میں دریائے پُران کے کنارے قائم ہوا تھا۔'' بابو شوکت نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے جھڈو کی تاریخ میں جھانکنے کی کوشش کی۔ چائے واقعی ''ڈنڈا سروس'' تھی' ایک دم کڑک۔ اس کی ایک' دو چسکیوں ہی نے مجھے تازہ دم کر دیا۔ میں نے جیب سے پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگاتے ہوئے بابو سے پوچھا:

''اس شہر کا نام جھڈو کیسے پڑا' اس کے بارے میں تاریخ میں کچھ ہے کہ نہیں؟''

''جھڈو دراصل جڈو کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جڈو کا مطلب ہے کم عقل' جسے سندھی میں چریا کہتے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں صحرائے تھر کا معروف کاروباری مرکز تھا۔ دریائے پُران کے کنارے آباد ہونے اور دریا پر پل نہ ہونے کی وجہ سے یہاں سارا کاروبار کشتیوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ صحرائے تھر اور نارا کے مابین تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے میں کلہوڑوں' میروں اور ان کے بعد کے ادوار میں اس شہر نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یہاں تجارتی مال ذخیرہ کرنے کے لئے بڑا گودام ہوتا تھا (جو اب بھی موجود ہے۔ یہ گودام' جھڈو گودام کہلاتا ہے)۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ

جب چولستان کے راستے بہہ کر آنے والا تاریخی دریا ہاکڑا روہی اور صحرائے تھر کو سیراب کرتا ہوا ٹیموٹی کے مقام پر پُران کی گود میں پناہ لے لیتا تھا۔ یہاں آ کر پُران کی مستیاں اور بڑھ جاتی تھیں۔ مگر اب یہ سب قصہ پارینہ ہے۔ بہتے پانیوں نے اپنے رخ کیا موڑے سب کچھ ویران ہو گیا' اب تو پران بھی بارشوں میں بھولے بھٹکے سے اس طرف کا رخ کرتا ہے۔''

ہم چائے پی کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے حسب عادت جیب میں ہاتھ ڈال کر چائے والے کو پیسے دینے کی کوشش کی تو بابو شوکت چیخ پڑا کہ ایسا قطعی نہیں ہوسکتا' آپ ہمارے مہمان ہیں ہمیں شرمسار نہ کریں۔ مگر چائے والے نے بابو سے بھی پیسے نہیں لئے۔ اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ سائیں ہمارے شہر میں مہمان ہیں' میں ان کی چائے کے پیسے نہیں لوں گا' یہ ہماری روایات کے خلاف ہے۔ مجھے کراچی کے چائے والے یاد آ گئے۔ وہاں دوستوں میں کبھی بل کی ادائیگی کا مسئلہ ہو تو چائے والا مذاق ہی سے سہی' کہتا ہے کہ جی آپ خوامخواہ آپس میں لڑیں نہ' دونوں ہی دے دیں۔ اندرونِ سندھ کے لوگ میزبانی میں اپنی مثال آپ ہیں' مذاق میں بھی اس طرح کے جملے گوارہ نہیں کرتے۔ میرا کیا ہے' میں تو چائے والے کے ایک ہی جملے میں ڈھیر ہو گیا ہوں۔ ہم ایسوں کو چت کرنے یا رنجیدہ کرنے کے لئے کسی کا ایک ہی جملہ کافی ہوتا ہے۔ ہم نہ دیہاتیوں جیسے سخت جاں رہے ہیں اور نہ شہریوں جیسے زود رنج ہو سکے ہیں۔

ہم چائے والے کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چل دیئے۔ میں نے بابو سے کہا کہ جتنا ممکن ہو' ملنے والوں کی نظروں سے بچ بچا کر یہاں سے نکل چلو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔ نئی جگہوں پر جا کر لوگوں سے ملنا اور تبادلہ خیالات کرنا عام طور پر مجھے اچھا لگتا ہے مگر اس بار مجھے یہ ضروری نہیں لگ رہا۔ میں چاہ رہا ہوں کہ اس تھوڑے سے وقت میں جھڈو کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرلوں' نہ جانے پھر کبھی یہ موقع ملے کہ نہ ملے۔ بابو شناسا لوگوں کے سلاموں کے سرسری جواب دیتا رہا اور ہم ان سے پہلو بچا کر آگے بڑھتے رہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم جھڈو کے تنگ بازاروں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے چہل پہل سے بہت دور نکل آئے۔ بابو نے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا کہ آئیں میں پہلے آپ کو جڈو فقیر کے مزار پر لئے چلتا ہوں جس کے نام پر یہ شہر آباد ہے۔ اور پھر وہ مجھے جڈو فقیر کے بارے میں بتانے لگا۔

''جڈو فقیر ایک خدا ترس اور دُرویش مانجھی تھا جو بے سروساماں مسافروں کو اپنی کشتی سے

دریا پار کراتا تھا۔ وہ بہت کم گو تھا مگر کشتی کھیتے ہوئے ہر لمحہ اس کی زبان پر حق ہُو' اللہ ہُو کا ورد رہتا۔ اس کے ورد کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ پُران دریا کی سرپھری لہریں بھی اس کے عارفانہ نعروں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی تھیں۔ اس دُرویش ملاح کی کشتی میں دریا پار کرنا لوگوں کے لئے سعادت سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کئی متمول تاجر اپنا تجارتی سامان دوسری کشتیوں میں بھیج کر اور خود عام تھریوں کا بھیس بدل کر' اس متوکل مانجھی کی کشتی میں سوار ہو جاتے تھے تاکہ ان کا یہ کاروباری سفر اس فقیر کی ہم راہی کے سبب نیک فال ثابت ہو۔ تاریخ بتاتی ہے' جڈو پہلے بگڑ کر جھنڈو ہوا اور پھر جھڈو ہو گیا۔''

میں نے بابو شوکت قائم خانی کے ہمراہ جڈ فقیر کے آستانے پر حاضری دی اور فاتحہ خوانی کی۔ نہ جانے کیوں اس کی بوسیدہ قبر کے سرہانے حرفِ دعا بلند کرتے ہوئے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ میں نے یہاں آ کر خود کو بہت ہلکا پُھلکا محسوس کیا ہے۔ میں خود کو خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں۔ ایک خدا ترس دُرویش مانجھی کے دربار پر آ کر مجھے بہت سکون ملا ہے۔ وہ جڈو تھا' جھنڈو یا جھڈو' مجھے اس سے سروکار نہیں ہے۔ یہاں ملنے والی طمانیت سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ وہ واقعی برگزیدہ شخص تھا۔ ایک گم نام دُرویش مانجھی کے نام پر وجود پانے والا شہر صدیوں بعد بھی آباد ہے' یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

یہیں کہیں ارد گرد کئی بزرگوں کے مقابر ہیں۔ کئی تو میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ سخی تاج محمد شاہ' پھلن شاہ' سید مراد شاہ' ساون بابا' پاتنی خاکی' پیر معصوم شاہ' محمود شاہ مہدی ابراہیم شاہ اور بابا نورالدین اجمیری' ایک سے بڑھ کر ایک برگزیدہ ہستی۔ ملتان کے حضرت بہاالدین ذکریاؒ نے بارہا اس سرزمین کو رونق بخشی۔ ان کی عقیدت میں جھڈو سے ۱۲ رکلومیٹر دور آمری کے مقام پر قائم یادگار سمن صالحین (جس کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے) آج بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ ان ہستیوں نے پُران کے کنارے اپنی تجلیوں کے جلوے دکھا کر اندھیاروں میں روحانیت کے اجالے پھیلا دیئے۔ اب یہاں ہر طرف نور ہی نور بکھرا ہوا ہے۔

پُران کے قرب و جوار میں واقع یہ سب مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ یہاں ہر سال میلے لگتے رہتے ہیں' عرس منعقد ہوتے ہیں۔ ارد گرد کے ہزاروں زائرین ان مزارات پر حاضریاں دیتے ہیں اور عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہیں۔ سال بھر میں دی ہوئی ایک حاضری

ان غریب اور لاچار عقیدت مندوں کو اگلے سال کی حاضری کی تڑپ میں زندہ رکھتی ہے۔ کوئی ان دیکھی طاقت ہے جو انہیں بار بار یہاں کھینچ لاتی ہے۔ میں بھی ان سب مقابر پر جا کر حاضری بھرنا چاہتا ہوں مگر وقت کا دامن بہت تنگ ہے اور مجھے مزید سفر کرنا ہے۔ مجھے ماروی کے دیس بھی جانا ہے، جو میرے عشق کی اگلی منزل ہے۔ میں ابنِ بطوطہ اور البیرونی کو تفصیل سے پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں کر سکا مگر یہاں آ کر مجھے وہ بھی یاد آئے کہ ابنِ بطوطہ کو دہلی سے براستہ گجرات، ٹھٹھہ جاتے ہوئے کچھ میں پُران عبور کرتے وقت اور معروف عرب مورخ البیرونی کو بھی پُران کی قدم بوسی کا موقع نصیب ہوا تھا۔

بابو شوکت اور میں تاریخ کی بھول بھلیوں کا سفر کرتے کرتے پُران کی باقیات کی طرف نکل آئے ہیں۔ بوڑھا دریا ایک بار پھر میرے سامنے پڑا اونگھ رہا ہے۔ میں نے میر پور خاص سے گزرتے ہوئے پُران کے چرن چھوئے تھے۔ اب وہ دوبارہ میرے سامنے ہے، گو کہ اب اس کے خدوخال مٹتے چلے جا رہے ہیں مگر اس کے قدموں کے نشاں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ آثار فنا ہو جاتے ہیں مگر تاریخ انہیں ان کے اوصاف کی وجہ سے تا دیر زندہ رکھتی ہے۔ تاریخ کا ایک زندہ باب اور ہزاروں لاکھوں شہادتوں کا امین، بزرگ دریا پُران میری نظروں کے روبرو ہے۔ میری نگاہوں میں دوبارہ قافلے جھلک رہے ہیں، مختلف النوع اور رنگوں کے پھریرے لہرا رہے ہیں اور ہر طرف سیاہِ عظیم منڈلا رہی ہیں۔ میری نظریں جس طرف بھٹکتی ہیں، ہر طرف فتح و شکست کے نعرے گونج رہے ہیں اور انتقام کی آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ دُھول اور گرد سے پُران کے اردگرد کے مناظر دھندلانے لگے ہیں۔ بابو شوکت میری کیفیت بھانپ گیا، وہ پھر تاریخ کے اوراق پلٹنے لگا:

''بتایا جاتا ہے کہ سیکڑوں سال قبل دریائے سندھ سکرنڈ کے قریب دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا اور اس کے باغی حصہ نے تھر پارکر کا رخ کر لیا۔ صحرائے تھر کو جانے والے اس حصے کو پُران ندی کہا جاتا تھا۔ دوسری طرف چولستان سے دریائے ہاکڑا ٹیموٹی کے مقام پر پُران سے گلے آملتا۔ دو دریاؤں کے اس ملاپ کے طفیل صحرائے تھر میں زندگی بہت عافیت میں تھی۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال تک جاری رہا۔ پھر یہ ہوا کہ پہلے تو ہاکڑا سے قدرت ناراض ہو گئی اور وہ ۱۷۹۰ء میں اپنا وجود مکمل طور پر کھو بیٹھا۔''

''پھر ایک وقت آیا کہ دریائے سندھ نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تو پُران کو جان کے لالے پڑ گئے۔ ۸۰۰ سال قبل دریائے سندھ کے رخ بدلنے کے بعد اس کی زندگی کا انحصار بارش اور سیلاب تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اب بھی جب کبھی ملک میں غیر معمولی سیلابی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کبھی کبھار سویا ہوا پُران انگڑائیاں لینے لگتا ہے۔ پُران ندی دریائے سندھ سے نکل کر سکرنڈ سے برہمن آباد (شہداد پور) اور ٹنڈو آدم کو جدا کرتی ہوئی' جھنڈو مری' ٹنڈو اللہ یار خان' خان پٹایوں' میر پور خاص' میر واہ' کا چیلو' ٹنڈو جان محمد' جھڈو' محراب جو شہر' کلوئی' ونگو پتن' علی بندر' رحمکی بازار' رن کچھ کے راستے' بھارتی علاقے شکور کھاڑی میں بحیرہ عرب کے قدموں میں جا گرتی۔''

بابو بولتے بولتے ٹھٹک گیا۔ میں گہری سوچ میں غرق تھا۔ وہ سمجھا میری توجہ بٹ گئی ہے' حالانکہ وہ بول رہا تھا اور میں خود اس کے پھیلائے ہوئے تاریخی نقشے کے جال میں الجھا پُران کے سندھو سے شکور کھاڑی تک کے راستے ناپتا پھر رہا تھا۔ میری چشمِ تصور جغرافیائی سرحدوں کی خلاف ورزی جیسے سنگین جرم کی مرتکب ہو بیٹھی تھی۔ ''احساسِ جرم'' میں مبتلا ہونے کے باوجود میں نے خود پر قابو پایا اور بابو شوکت سے کہا:

''میرے کان آپ کی زبان پر رکھے ہیں' آپ بولتے رہو' میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔'' بابو شوکت ایک بار پھر تاریخ کے دھندلکوں میں کھو گیا۔

''یہ دریا کئی تاریخی حوالوں کا امین ہے۔ اس دریا کی دُھول نے ہزاروں سال' کئی نامور فاتحین' مجاہدین' سپاہ اور سپہ سالاروں کے برق رفتار گھوڑوں کے سُموں سے لپٹ کر منظر نامے دھندلائے ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے سکندرِ اعظم کے امیرِ بحر فیریکس نے دریائے پُران کی رہنمائی ہی میں بحیرہ عرب تک رسائی حاصل کی تھی اور یہاں آ کر اپنی افواج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ سمندری راستے سے یونان بھیجا اور خود سکندرِ اعظم پیدل افواج کے ساتھ اپنے وطن یونان روانہ ہوا مگر زندگی نے اس سے بے وفائی کی اور وہ راستے ہی میں دم توڑ گیا اور اس طرح طاقت اور دہشت کا یہ طوفان ہمیشہ کے لئے تھم گیا۔''

''۱۰۲۵ء میں سلطان محمود غزنوی نے سومنات کو فتح کر کے دوارکا سے اپنے وطن غزنی پلٹتے ہوئے پُران کے راستے دریائے سندھ پار کیا اور راستے میں کئی مقامات پر پڑاؤ ڈالے۔ سلطان کے دور میں تھر کو لگے کئی گھاؤ اب بھی تازہ ہیں اور اس کی چھوڑی ہوئی کئی یادگاریں اب بھی

پُران کی راہوں میں پڑی سسک رہی ہیں۔تاریخ کے اوراق اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہندوستان کا اقتدار حاصل کرنے اور تختِ طاؤس پر رونق افروز ہونے کا خواب ایک ایسا خواب ہے جس نے بھائی کو بھائی کا' باپ کو بیٹے کا' بیٹے کو باپ کا جانی دشمن بنا ڈالا۔۱۷ رویں صدی عیسوی میں شاہ جہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ اپنے بھائیوں سے' دہلی کے اقتدار پر قبضے کی جنگ میں پُران کے کنارے سفر کرتا ہوا کچھ سے گزرا تھا۔''

''۱۷۷۲ء میں یہاں ایک اور گھمسان کا رن پڑا تھا' جب کلہوڑوں کے دورِ اقتدار میں نور محمد کلہوڑو اور کچھ کے راجہ' راؤ آف کچھ میں زور کی ٹھن گئی تھی۔جنگی اور معاشی حکمتِ عملی کے تحت نور محمد کلہوڑو نے دریائے پُران کے پانی کو روکنے کے لئے ایک بہت بڑا بند باندھا تھا جسے اللہ والا بند کہا جاتا تھا۔۱۸۲۰ء میں رن کچھ میں خوفناک زلزلہ آیا تھا جس میں ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور یہ بند بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔پُران ہی کے کنارے رن کچھ کے علاقے ویگے کوٹ اور روپا ماڑی کے میدانوں میں ایک ہزار سال قبل دہلی کے بادشاہ علاؤالدین خلجی اور سندھ کے حکمران دودو سومرو کے مابین جنگ ہوئی جس میں دودا کا بھائی چنیسر سومرو دہلی تخت کے ساتھ مل گیا تھا۔اس جنگ میں سلطان علاؤالدین خلجی غالب رہا اور دودو سومرو تخت کے ساتھ جاں بھی ہار گیا۔بھائی کی سازش بھائی کا نہ صرف تخت و تاج لے ڈوبی بلکہ اس قضیئے میں ایک بھائی 'بھائی کی وجہ سے جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔محبت اور اقتدار کی جنگ میں رشتے ثانوی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں۔اللہ رحم کرے!'' بابو شوکت نے ٹھنڈی آہ بھری اور چلتے چلتے رک گیا۔

سورج نے جھڈو شہر کے عقب میں پناہ لے لی تھی اور اندھیرا بتدریج گہرا ہونے لگا۔میں نے بابو سے کہا اب واپس جانا چاہیئے' بہت دیر ہو گئی ہے' دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔آگے رات اور ریگزار کا سفر ہے' ہمیں اپنے میزبانوں کو آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔ہم نے اندھیرے کی چادر اوڑھے ضعیف العمر پُران کو الوداع کہا اور وہاں سے واپس چل دیئے۔ہم ٹہلتے ٹہلتے جھڈو ریلوے اسٹیشن نکل آئے۔بابو نے اپنی بات چیت جاری رکھی:

''یہ جھڈو کا تاریخی ریلوے اسٹیشن ہے۔۱۹۱۱ء میں میر پور خاص سے جھڈو تک میٹر گیج ریلوے لائن بچھائی گئی۔پھر ۱۹۲۲ء میں اس ریلوے لائن کو نوکوٹ' نبی سر' کنری کے راستے میر پور خاص کے درمیان پتھورو سے ملا دیا گیا۔اگر اس لائن کا فضائی جائزہ لیا جائے تو یہ پھانسی کا پھندہ نظر

آتی ہے' اسے لوپ لائن بھی کہا جاتا ہے۔ یہ لوپ لائن جودھ پور کے راجہ امید سنگھ نے جودھ پور اسٹیٹ ریلوے کے نام سے بچھائی تھی جس کی وجہ سے پُرانے زمانے میں یہاں چلنے والی گاڑیوں کو لوگ راجہ کی ریل بھی کہتے تھے۔"

میرا یہاں سے گزر ہوا ہے تو مجھے سندھ کا وہ مرنجاں مرنج شخص بھی یاد آیا ہے کہ جو یہیں سامنے جھڈو ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بیٹھ کر علاقے کے مظلوموں کو انصاف دلانے کے لئے مشورے دیتا تھا اور ان کی عرضیاں لکھتا رہتا تھا۔ تھر کا مردِ قلندر مسکین جہان خان کھوسو' بغل میں کورے کاغذوں سے بھرا تھیلا دبائے ننگر پارکر سے میر پور خاص تک مظلوموں کی دادرسی کے لئے ایوانوں پر دستک دیتا رہتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی مقہور و مفلوج لوگوں کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا معاشرے کے ڈسے اور پسے ہوئے لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر امڈ آتا۔ اپنی عوام پروری کی وجہ سے مسکین جہان خان کھوسو آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

میں نے دیکھا' جھڈو ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے ویرانیاں ٹپک رہی ہیں' ہر طرف اجاڑ منظر ہے۔ یہاں عرصہ ہوا ریلوے سروس بند ہو چکی ہے۔ اسٹیشن کی اراضی پر کئی پختہ ناپختہ عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں۔ ہر جگہ قبضہ گروپ نے تجاوزات قائم کر رکھی ہیں۔ اب یہاں ہر طرف لینڈ مافیا کا راج ہے۔ بابو شوکت بتا رہا تھا کہ کچھ عرصہ قبل ریلوے انتظامیہ نے یہاں تجاوزات کے خاتمے کے لئے بڑا آپریشن کیا تھا مگر وہ صرف غریبوں تک محدود رہا۔ ٹھیلے والوں اور چھابڑی فروشوں کو ہٹا دیا گیا 'غریبوں کے جھونپڑے گرا دیئے گئے مگر بااثر لوگوں کے قبضے ریلوے کی جائیداد پر اب بھی قائم ہیں۔ بابو نے بتایا کہ یہاں جانوروں کی بہت بڑی منڈی بھی لگتی ہے۔

میں نے دیکھا اس وقت بھی اسٹیشن کے اطراف میں' ریل کی پٹریوں پر' ہر طرف بھیڑ' بکریاں' گائیں' بیل اور بھینسیں سیکڑوں کی تعداد میں بندھی ہیں۔ یہاں فضا میں گوبر کی باس بسی ہے اور اسٹیشن کے ہر طرف دیواروں پر اپلوں کے نقش و نگار نمایاں ہیں۔ ہم چلتے چلتے عمر خان کی رہائش گاہ کے قریب آ گئے۔ مجھے راستے میں کئی پختہ اور ڈھنگ سے بنے گھروں کے دروازوں پر چپکی تختیوں نے بتایا کہ یہ گھر قائم خانیوں کے ہیں تو میں نے بابو سے پوچھا:

"میرے خیال میں قائم خانی یہاں اکثریت سے آباد ہیں؟"

"ہاں! قائم خانی بہت ہیں یہاں۔ قیامِ پاکستان سے قبل جھڈو اور گرد و نواح میں مسلمان قبائل

کے علاوہ ہندوؤں اور سکھوں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ ہجرت کی ہوا چلی تو ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں بھارت کوچ کر گئے اور وہاں سے ہجرت کر کے یہاں آنے والے قائم خانیوں نے وسیع پیانے پر جھڈو اور ارد گرد کے علاقوں کو اپنا مسکن بنالیا۔ ان کے علاوہ ہریانہ کے پنجابی' رانگڑ' غوری' پٹھان اور دیگر برادریاں بھی یہاں آ کر بس گئیں۔ یہاں تالپور' ناگوری' میمن' کمہیار' شیخ' مغل' ملک' قریشی' پٹھان' بھٹی' شیدی' کھیر ی' سید' خواجہ' بنئے' کاریئے' میگواڑ' وہاری' بھیل' کولہی' گجراتی اور ہریجن بھی آباد ہیں۔ اب اس شہر کی آبادی ۴۰ ہزار سے کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔ یہ شہر گرد ونواح کے گاؤں گوٹھوں کے غریب لوگوں کے لئے روزگار اور سہولتوں کے حوالے سے بڑی کشش رکھتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی آبادی بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔''

جھڈو شہر سندھ کے اہم طبعی حصوں لاڑ (زیریں سندھ) تھر پارکر اور نارا کے سنگم پر واقع ہے۔ جڈو فقیر کے مزار کے ساتھ ہی سامی جوگیوں کا تاریخی قبرستان ہے جہاں ناتھوسامی کی سمادھی بھی ہے۔ سمادھی کے قریب ہی ایک قدیم درخت ہے' ہندو خواتین اپنے بچوں کے کپڑے اس پر لٹکاتی رہتی ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے ان کے بچے بیماریوں اور ناگہانی آفات سے محفوظ رہتے ہیں۔ سامی جوگیوں کا ذکر شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ''شاہ جو رسالو'' میں بھی کیا ہے۔ زیریں سندھ کے معروف' مجذوب بزرگ سید سمن سرکار کا مزار بھی جھڈو سے ۱۵ رکلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے جہاں ہر سال عرس پر ملک بھر سے زائرین جھڈو ہی کے راستے پنگریو پہنچتے ہیں۔ بھارت کے سابق وزیرِ خارجہ سورن سنگھ کا تعلق بھی جھڈو کی قریبی دیہہ ۲۰۲ سے تھا۔

بزرگوں کے مزارات کی برکتیں' پُر ان کی قدیم یادیں' جڈو فقیر اور مسکین جہان خان کھوسو سے عقیدتوں کے فیض سمیٹے' میں اور بابو شوکت واپس عمر خان کے گھر لوٹ آئے جہاں ہمارا شدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ بولتے بولتے بابو کا گلا خشک ہوگیا مگر جھڈو سے متعلق اس کی معلومات کا ذخیرہ ابھی باقی تھا۔ مجھے آپ تک پہنچانے کے لئے بہت کچھ ہاتھ آ گیا ہے' میں فی الحال اسی پر اکتفا کروں گا۔ ابھی مجھے بہت صحرانوردی کرنا ہے جبکہ رات نے پوری طرح سے جھڈو شہر کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے مگر تیرہویں کے چاند کی تیرگی سے ٹھنی ہوئی ہے۔ ہمیں نوکوٹ اور وجیتو کے راستے مٹھی پہنچنا ہے' اس عالم میں چاند کی ریشم ریشم روشنی میں سفر میرے لئے تو نہیں غالباً میرے رفقائے سفر کے لئے شاید ایک بالکل نیا اور انوکھا تجربہ ہوگا۔

روہی اور تھر میں طلوعِ آفتاب' غروبِ آفتاب اور چودہویں کی ماہتابی رات کے مناظر ایسے ہوتے ہیں کہ آپ اپنے جسم و جان کو ان کے اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ صحرا میں سورج ابھرنے اور پورے چاند کی رات کا منظر بڑا دلفریب ہوتا ہے۔ سپیدہ سحر نمودار ہوتے ہی رات بھر کا مہمان اندھیرا چھٹ جاتا ہے۔ مرجھائے اور مایوس چہروں پر روشنیاں سی پھیل جاتی ہیں اور انسان ایک نئی امنگ کے ساتھ زندگی کے نئے باب پر ایک نئے احساس کے ساتھ چل نکلتا ہے۔ ایسے ہی چودہویں کے چاند کی نرم و نازک روشنی بھی آنکھوں کے راستے تن بدن میں ایک لہر کی مانند پھیل جاتی ہے اور انسان کا پورا وجود شہد میں گھل مل جاتا ہے۔ صبح صادق کو سورج کی امنگ دینے والی روشنی کے برعکس چاندنی جسم سے درد اور افسردگی کی سارے محسوسات چن لیتی ہے لیکن غروبِ آفتاب' صحرا میں ہو یا کہیں اور' انسان کو افسردہ اور ملول کر دیتا ہے۔ میں یہ چسکا بھی کئی بار اپنے وجود پر جھیل چکا ہوں۔ میرا جسم ان متضاد ذائقوں کا عادی ہو چکا ہے۔

ہم چاند کی مدہم روشنی میں نوکوٹ پہنچے تو بلند قامت تاریخی قلعہ بانہیں پھیلائے ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ ۱۷۸۲ء میں میر فتح علی خان نے کلہوڑوں سے سندھ کا اقتدار چھینا تو اپنے دیگر تین بھائیوں میر کرم علی خان' میر غلام علی خان اور میر مراد علی خان کی مدد سے ایک مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی۔ اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھے ان بھائیوں کے طرزِ حکمرانی کو تھر کی تاریخ میں ''چویاری'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عمر کوٹ پر اس وقت جودھ پور کے مہاراجہ کا قبضہ تھا۔ تھر کے دوسرے علاقوں میں سوڈھے راجپوتوں کا راج تھا جو میروں کے اقتدار سے پہلے کلہوڑوں کے باج گزار تھے مگر جب سندھ کا اقتدار تالپوروں کے ہاتھ آیا تو سوڈھوں نے خراج دینے سے انکار کر دیا۔ میر فتح علی خان نے محسوس کیا کہ سوڈھے آسانی سے راہِ راست پر نہیں آئیں گے۔ سوڈھے سرداروں کو قابو میں لانے سے پہلے اس نے حکمت عملی کے تحت اپنے زیر نگیں تھر کے علاقوں میں کئی مقامات پر قلعے تعمیر کئے اور سوڈھوں کے گرد گھیرا تنگ کر کے انہیں طاعت گزاری پر مجبور کر دیا۔ میر فتح علی خان کی ۱۸۰۲ء میں وفات کے بعد میر غلام علی خان ان کے جانشین قرار پائے اور ۱۸۱۲ء میں ان کے دوسرے بھائی میر کرم علی خان گدی نشین ہو گئے' انہیں بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح قلعے اور کوٹ بنانے کا بڑا شوق ہے۔ ۱۸۱۴ء میں تعمیر کیا جانے والا نوکوٹ کا یہ قلعہ بھی انہیں کے تعمیراتی ذوق کا شاہکار ہے۔



تھر کی زندگی اور تاریخ: مختصر مطالعہ

کراچی سے سوا چھ سو کلو میٹر دور سندھ کے جنوب مشرق میں اکیس ہزار مربع کلو میٹر رقبے پر پھیلا صحرائے تھر دنیا کا عظیم صحرا ہے جو مخصوص جغرافیائی خدوخال، منفرد ثقافتی ورثے، ماحولیات' خصوصیات اور تضادات کے باوصف اسے دنیا کے دوسرے تمام صحراؤں سے ممتاز کرتا ہے۔ مقامی آبادی کی مخصوص روایات' عقائد اور رسوم ہیں جنہوں نے اسے خطوں کی تاریخ میں انفرادیت بخش دی ہے اور عام لوگوں کے لئے دلچسپیوں کے در وا کر دیئے ہیں۔ اس خطے میں جنم لینے والے قدرت کے رنگا رنگ مظاہر انسانوں کو حیران' سراسیمہ اور دہشت زدہ کر دیتے ہیں۔ یہ عظیم ریگستانی خطہ سرحد پار رن آف کچھ اور راجستھان سے شروع ہو کر اندرونِ ملک خیر پور کی صحرائی نارا سے ہوتا ہوا پاکستان کے ایک اور عظیم ریگستان' چولستان تک پھیلا ہوا ہے۔ پاکستان کا یہ عظیم ریگستان تھر اپنے وجود میں قدرت کے کئی خوب صورت رنگ سمیٹے ہوئے ہے۔ تھر میں کہیں ریت اڑتی دکھائی دیتی ہے تو کہیں لہلہاتے کھیت نظر آتے ہیں۔ کہیں ٹیلے ہیں تو کہیں بڑے بڑے قلعے ہیں جو اس کی عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کارونجھر پہاڑ کا طویل سلسلہ بھی اسی صحرا میں موجود ہے جو قیمتی پتھر گرینائیٹ کا خزانہ لئے ہوئے ہے۔ قدرت نے اس صحرا کو منفرد طبعی خصوصیات سے نوازا ہے۔ یہ عظیم صحرا جہاں معدنی وسائل سے مالا مال ہے وہاں تھر میں نایاب جانور، نادر پرندے اور اہمیت کے حامل رینگنے والے جانوروں کی کثرت پائی جاتی ہے۔

تھر جغرافیائی طور پر خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی ساڑھے تین سو کلو میٹر پٹی بھارت کے

ساتھ جڑی ہوئی ہے اور یہ حد درجہ حساس علاقہ ہے جو گزشتہ پاک بھارت جنگوں میں ہمارا کمزور ترین محاذ رہا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھارت نے صحرائے تھر کے ۶۵ دیہات پر قبضہ جما لیا اور ۱۹۷۱ء میں تھر پارکر کی چار تحصیلوں مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو اور ننگر پارکر کے سیکڑوں دیہات بھارتی افواج کے قبضے میں چلے گئے۔ ذیل میں تھر کی تاریخ اور زندگی سے متعلق مختصر اور منتخب معلومات پیشِ خدمت ہیں جو میں نے مختلف وسیلوں اور حوالوں سے یکجا کی ہیں:

روایات ہیں کہ تھر ہزاروں سال پہلے سمندر کا حصہ تھا۔ اس خطے میں کئی بندر گاہیں تھیں جن کے ذریعے اس علاقے کے لوگوں کے باہر کی دنیا کے ساتھ تجارتی اور سماجی روابط استوار تھے۔ تغیرات کے نتیجے میں سمندر پیچھے ہٹتا چلا گیا اور اس خطے نے آہستہ آہستہ عظیم صحرا کی چادر اوڑھ لی۔ سمندر پیچھے ہٹنے کے بعد پانی کی کمیابی اور بارشیں نہ ہونے کے سبب یہ وسیع و عریض علاقہ بتدریج ریگستان کی شکل اختیار کرتا چلا گیا اور آج یوں لگتا ہے کہ یہاں سمندر کا ہونا ایک گمان سے زیادہ کچھ نہیں۔ کارونجھر کے بارے میں روایات ہیں کہ یہاں آتش فشاں پھٹنے سے زمین نے اپنی آگ اگلی تو لاوے نے ٹھنڈا ہونے اور جمنے کے بعد گرینائیٹ کی شکل اختیار کر لی۔

تھر پارکر جغرافیائی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کا ایک حصہ تھر یعنی صحرا اور دوسرا حصہ پارکر یعنی پہاڑی علاقہ سے موسوم ہے۔ ضلع تھر پارکر کی چاروں تحصیلوں مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو اور ننگر پارکر کے نام سے تاریخی شہر موجود ہیں جہاں تھر کی آبادی کے صرف چار فیصد لوگ رہائش پذیر ہیں' باقی ساری آبادی دور افتادہ اور دشوار گزار پسماندہ علاقوں میں آباد ہے۔ اس ضلع میں ۱۸/ سرکل' ۴۰/ تپے اور ۱۶۶/ دیہات شامل ہیں۔ انگریزوں کی آمد سے قبل یہ ضلع تالپور میر حکمرانوں کے زیرِ اثر تھا۔ میروں کے اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے اور تھر پر اپنا تسلط جمانے کے لئے انگریزوں نے سازشوں کے جال بچھا دیئے۔ ان سازشی سرگرمیوں کا مرکز اسلام کوٹ کو بنایا گیا۔ میروں کو دیوار سے لگانے کے لئے میر صوبدار خان کی خدمات حاصل کی گئیں اور اسے وسائل فراہم کئے گئے تاکہ وہ تھر پارکر میں اقتدار کے سنگھاسن پر انگریزوں کے بیٹھنے کی راہ ہموار کر سکے۔ یہیں سے یہ سازش پورے صحرا میں پھیلی اور بالآخر ۱۸۴۳ء میں میروں کے اقتدار کے خاتمے پر منتج ہوئی۔ برطانوی تسلط کے بعد مٹھی' ڈیپلو' ننگر پارکر اور ریاست کچھ پر مشتمل علاقوں پر ایک نئے ضلع کی بنیاد رکھی گئی۔ آغاز میں اس ضلع کا سرمائی مرکز ''بھوج'' اور گرمائی مرکز ''مٹھی''

مقرر کیا گیا۔ سندھ میں یہ خطہ وہ ہے جس پر سب سے پہلے انگریزوں نے اپنا قبضہ جمایا۔ ۱۸۵۸ء میں تھر پارکر کو کچھ سے الگ کر کے ضلع حیدر آباد کی سپردگی میں دے دیا گیا۔

۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے مٹھی' ڈیپلو' ننگر پارکر' عمر کوٹ' چھاچھرو' نارا اور سانگھڑ تعلقوں کو الگ کر کے اسے ایسٹرن سندھ فرنٹیئر کا نام دے کر معاملات چلانے کے لئے یہاں پولیٹیکل سپرینٹنڈنٹ مقرر کر دیا اور اس ضلع کا صدر مقام عمر کوٹ بنا دیا۔ ۱۸۸۲ء میں اس ضلع کی سربراہی کے لئے ڈپٹی کمشنر کی تقرری کر دی گئی اور کچھ عرصہ بعد تعلقہ بھٹورو اور سنجھورو کو بھی اس ضلع میں شامل کر دیا گیا۔ بعد میں بھٹورو اور نارا تعلقوں کو توڑ کر سامارو اور کھپرو تعلقے بنا دیئے گئے۔ ۱۸۹۶ء میں شہداد پور اور ڈیرہ محبت کو بھی توڑ کر اس ضلع کے ساتھ ملا دیا گیا۔ ۱۹۰۳ء میں کھپرو اور سانگھڑ کے تعلقے تھر پارکر سے علیحدہ کر کے سانگھڑ کو الگ ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں تعلقہ سنجھورو تھر پارکر سے الگ کر کے نئے ضلع نواب شاہ میں شامل کر دیا گیا اور ڈگری کو تعلقہ کا درجہ دے کر تھر پارکر کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ نیا ضلع انگریزوں نے اپنے پروردہ مقامی جاگیردار سید نواب شاہ سے موسوم کیا اور اس کے لئے سید نواب شاہ نے اپنی کم و بیش چھ سو ایکڑ اراضی بھی مختص کی۔ اب اسے بے نظیر آباد کا نام دے دیا گیا ہے۔

تھر کی ضلعی حد بندی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی اور بالآخر یکم جولائی ۱۹۹۰ء کو اسے مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو اور ننگر پارکر پر مشتمل چار تحصیلوں کے ساتھ ضلع تھر کا نام دے دیا گیا اور اس کا صدر مقام مٹھی مقرر کیا گیا۔ نئی تشکیل میں عمر کوٹ تحصیل کی گیارہ دیہہ کا کم و بیش ۲۲۰۰ مربع کلومیٹر رقبہ بھی تھر کی تحویل میں دے دیا گیا۔

ماضی میں تھر کا علاقہ دریائے ہاکڑا اور مہران سے سیراب ہوتا رہا ہے۔ زرعی پیداوار' قدرتی وسائل اور الگ تہذیبی تشخص کی وجہ سے اسے برِصغیر جانا جاتا تھا۔ اس وسیع علاقہ کے دامن میں موجود کھنڈرات اور آثارِ قدیمہ امرانو' پاری نگر بندر' دگھ کوٹ' کیرٹی' رتو کوٹ' عمر کوٹ' نوکوٹ' راحمکی بازار' بوڈھیسر کی مسجد' جین دھرم اور بدھ مت کے مندروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مختلف ادوار میں مختلف مذاہب کے پیروکار قبائل اور حکمران موثر رہے۔ ان میں راؤ' برہمن' سوڈھے رانے' راجپوت' راٹھوڑ' سمہ' سومرو' ارغون' ترخان' مغل' کلہوڑا' تالپور اور فرنگی قابلِ ذکر ہیں۔

دریائے سندھ کے زیریں حصے میں واقع اس علاقے پر زیادہ تر حکمرانی سومرو خاندان نے

کی جو کم و بیش ساڑھے تین سو سال اس خطے پر بلاشرکتِ غیرے برسرِ اقتدار رہے۔ سومروں سے اقتدار سموں نے ہتھیالیا اور پھر ان کے بعد رانوں نے اپنی راجدھانی قائم کرلی۔ جب ہندوستان کے تخت پر جلال الدین محمد اکبر جلوہ افروز ہوا تو اس وقت تھر پر رانوں کی حکومت تھی اور وہ مغلوں کے باج گزار تھے۔ چونکہ شہنشاہ اکبر کی جائے پیدائش عمر کوٹ ہے، جہاں اس کا والد شہنشاہ ہمایوں ایران جاتے ہوئے ٹھہرا تھے۔ اس لئے اسے اپنی جنم بھومی سے بڑی رغبت تھی۔ وہ جب برسرِ اقتدار آیا تو اس نے مرزا خانِ خانان کو حکم دیا کہ وہ اس کی جائے پیدائش تھرپارکر کو تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دے دے۔ شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی۔

صحرائے تھر، ماروی کا دیس، عثمان ڈیپلائی کی جائے پیدائش اور مسکین جہان خان کھوسو کا مدفن ہی نہیں، ضلع تھر کے کم و بیش ۱۰ر لاکھ افراد کا مسکن بھی ہے۔ گزشتہ عشرے تک تھر، عمر کوٹ اور میر پور خاص پر مشتمل ضلع تھرپارکر تھا۔ پھر سیاسی مصلحتوں اور مفادات کے تابع میر پور خاص کو ڈویژن کا درجہ ملا تو تھر، عمر کوٹ اور میر پور خاص اضلاع وجود میں آئے اور سانگھڑ کو حیدر آباد ڈویژن سے نکال کر اس نئے ڈویژن میں شامل کیا گیا۔ موجودہ ضلع تھر کی آبادی ۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق ۹ر لاکھ ۱۴ ہزار ۲۹۱ ہے۔ شرح آبادی میں سالانہ اضافہ ۱۳ء۳ فیصد ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری میں اس علاقے کی آبادی ۵ر لاکھ ۴۰ ہزار ۹۸۵ ظاہر کی گئی تھی۔

تھر کے لوگ حوصلہ مند، سخت جاں اور محبت و مذہبی رواداری کے امین ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی کئی ذاتیں اور قبیلے ہیں لیکن مختلف عقیدوں سے جڑے ہونے کے باوجود صحرائے تھر کے سب لوگ آپس میں شیر و شکر ہیں اور ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ تھر کے باشندوں کی گزر بسر زیادہ تر مال مویشیوں پر ہے جبکہ گھریلو صنعت بھی روزگار کا اہم وسیلہ ہے۔ مٹھی، ڈیپلو، چھاچھرو، اسلام کوٹ، چیلہار، ننگر پارکر اور دیگر چھوٹے گوٹھوں میں قالین بافی کی لگ بھگ چھ ہزار کھڈیاں قائم ہیں۔

تھر کے غیر مسلموں میں زیادہ تر تعداد ہندوؤں کی ہے۔ ہندوؤں کی معروف برادریوں میں راجپوت (ٹھاکر) برہمن، لوہانہ، شہواری، شوبارہ، مالہی، اوڈ، درزی، میگھواڑ، کولہی، لوہار، ہندو نائی، باوہ، کھتری، درتیہ اور بھیل شامل ہیں۔ ضلع کے ۴۴ء۵۸ فیصد افراد نے شناختی کارڈ بنوائے ہیں جب کہ ۵۶ء۴۱ فیصد ابھی تک محروم ہیں۔ چار تحصیلوں والے اس ضلع کا تعلقہ چھاچھرو آبادی کے

لحاظ سے سب سے بڑا ہے جہاں ۳ رلاکھ ۵۷ ہزار ۷۵۷ افراد رہتے ہیں۔ مٹھی میں ۴۱ ر ہزار ۵۴۸' ڈیپلو میں ایک لاکھ ۶۱ ہزار ۸۸۰ اور ننگر پارکر میں ایک لاکھ ۵۳ ہزار ۱۰۶ باشندے رہتے ہیں۔

تھر کے مسلمان قبیلوں میں خاصخیلی قبیلے کے لوگ بڑی تعداد میں بستے ہیں۔ خاصخیلی قبیلے کے لوگ ننگر پارکر' بھالوا' مٹھی' اسلام کوٹ' ویراواہ' چھاچھرو' ہاڑو' احمد جوتڑ' مبارک جوتڑ' قبول جی ڈھانی' رتنیاری' ڈانو دھاندل اور عمر کوٹ میں سیاسی طور پر کافی موثر ہیں اور ہر انتخاب میں ان کی حمایت مختلف جماعتوں کے امیدواروں کی کامیابی کے لئے راہیں ہموار کرتی ہے۔

خاصخیلی افغانستان سے ساڑھے تین چار سو سال قبل ہجرت کر کے سندھ آئے اور جلد ہی وادی سندھ کے رنگوں میں رنگے گئے۔ ایک زمانے میں ان کا اقتدار دہلی سے پرے حصار پور میں قائم تھا جہاں ان کے جنگجو سرداروں نے ۸۷ رسال تک حکومت کی۔ ان کے نامور حکمرانوں میں ملک بیلون خان' ابراہیم لودھی خاصخیلی' جبش خان خاصخیلی اور شیر نگ خان خاصخیلی قابل ذکر ہیں۔ ان کا آخری حکمران حاجی خان خاصخیلی تھا جس سے مغلوں نے اقتدار چھین کر خاصخیلیوں کو سندھ کی طرف دھکیل دیا۔ ماضی میں یہ قبیلہ غیر منظم تھا لیکن پچھلے کچھ عرصے سے خاصخیلیوں کے موجودہ سردار' غلام مصطفیٰ خان خاصخیلی نے انہیں سندھ میں ہی نہیں پورے پاکستان میں فعال اور متحد کر دیا ہے۔ سردار غلام مصطفیٰ خاصخیلی کا دعویٰ ہے کہ اس وقت تھر میں ڈیڑھ سے دو لاکھ خاصخیلی تھر اور پارکر کے مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔

تھر کا موسم شدید ہے' گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی ہے۔ جون جولائی میں جلا کر راکھ کر دینے والی گرمی پڑتی ہے' جب سورج نصف النہار پر ہوتا ہے تو تپش سے انسان تو انسان جانور بھی ہانپنے لگتے ہیں۔ اس موسم میں تھرواسیوں کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ بسا اوقات ایسی لُو چلتی ہے کہ الاماں' گرم ریت ہاتھ اور پاؤں جھلسا دیتی ہے۔ لُو کے دنوں میں مجبوری کے بغیر کوئی بھی چنوروں سے باہر قدم نہیں رکھتا لیکن جنہیں بہ امر مجبوری گھر سے نکلنا پڑتا ہے وہ سر اور منہ ڈھاٹوں سے مکمل طور پر لپیٹ لیتے ہیں۔ تھر میں دسمبر اور جنوری میں سردی عروج پر ہوتی ہے۔ اتنی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں کہ رات او، دن ٹھٹھرنے لگتے ہیں' اس موسم کی یخ بستہ راتوں میں سفر ممکن نہیں ہوتا۔ عام طور پر مسافر گرمیوں میں رات کو اور سردیوں میں دن کے سفر کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہار کے موسم میں سردی کا زور ٹوٹتا ہے تو بن میں پودوں پر پھول کھلنے سے

فضا میں ہر طرف خوشبو پھیل جاتی ہے۔ یہ صحرائے تھر کا سہانا ترین موسم ہے۔ تھر کا ''چوماسہ'' (جولائی' اگست' ستمبر' اکتوبر) کافی مشہور ہے جب صحرا میں خنک ہوائیں موسم کو خوشگوار کر دیتی ہیں۔ ان مہینوں میں پڑنے والی برسات سے شادابی تھر کو اپنی باہوں میں جکڑ لیتی ہے۔ چوماسے میں برسات پڑنے سے قبل کبھی کبھی گرد کے ایسے طوفان اٹھتے ہیں کہ زندگی تلپٹ ہو جاتی ہے۔ اتنی تند اور تیز ہوا چلتی ہے کہ تناور درختوں کو جڑ سے اکھاڑ کر لے جاتی ہے۔

تھر میں ریت اور مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے ہیں جنہیں مقامی لوگ ''بھٹ'' یا ''لسک'' کہتے ہیں۔ بعض بھٹیں اتنی بلند اور بڑی ہیں کہ ان پر پہاڑوں کا گمان ہوتا ہے۔ درمیانے درجے کے ٹیلوں کو ''دڑے'' کہا جاتا ہے۔ ان دڑوں سے بھی چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہوتے ہیں جنہیں ''دڑیو'' یا ''کھپرو'' کہا جاتا ہے۔ روہی میں بھی چھوٹے ٹیلے کو دڑی اور بڑے ٹیلے کو دڑہ کہا جاتا ہے۔ یہ مقامی زبان اور ثقافت کی فصاحت ہے کہ ہر حجم کے ٹیلے کا نام الگ الگ ہے۔ کئی بھٹ تو ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں اور کچھ میلوں کی مسافت پر۔ یہ بھٹیں قدرتی طور پر جنم لیتی ہیں اس لئے کوئی ٹیڑھی میڑھی' کوئی متوازی اور کوئی سیدھی ہوتی ہے۔ آندھی ہو یا طوفان ہر شدید موسم میں چند بڑے ٹیلوں کو چھوڑ کر کئی ٹیلے ہوا کے دباؤ میں اپنے رخ بدل لیتے ہیں۔ ان چھوٹی بڑی بھٹوں اور ٹیلوں کی فطری بناوٹ قدرت کی دست کاری کا خوب صورت شاہکار دکھائی دیتی ہے۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ ہر بھٹ کسی نہ کسی صفت یا کسی تاریخی پس منظر سے منسوب ہے۔

ان بھٹوں اور ٹیلوں میں سفر کافی دشوار ہوتا ہے کیونکہ بلند قامت ٹیلوں پر بار بار چڑھنا اور اترنا پا پیادہ مسافروں کے لئے ممکن نہیں ہوتا' اس لئے تھری ان ٹیلوں میں ایسے راستے ڈھونڈ نکالتے ہیں جو ایک بھٹ کو دوسری بھٹ سے جدا کرتی جگہ پر قدرتی طور پر بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کا سفر قدرے طویل مگر نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ جس طرح ان بھٹوں کے نام ہوتے ہیں اسی طرح بھٹوں کے درمیان پائی جانے والے راہگزر بھی قریبی گوٹھوں یا قبائل کے نام سے یا کسی اور نسبت سے مشہور ہوتی ہیں۔

میرے اس جسمانی اور روحانی سفر میں مرشد پاک فرید اور سائیں شاہ لطیف بھی میرے ہمراہ ہیں جو صحرائے تھر کے ہر قدم پر اپنے شعروں اور بیتوں سے اس ریگستان کی زندگی کے راز مجھ پر منکشف کرتے جا رہے ہیں۔ میرا مرشد خواجہ غلام فرید کہتا ہے:

اوکھیاں گھاٹیاں گاٹیاں چاٹیاں
لاہیاں چاڑھیاں سبھ اٹھ کاٹھیاں
سجڑوں کھبڑوں سو سو غار

تھر کی چند مشہور بھٹوں میں لونکی بھٹ' ویسروڑی بھٹ' کاری بھٹ' دھنوڑی بھٹ' ڈھو کھانی بھٹ' جھرکلی بھٹ' شاہ میر بھٹ' بانیھاری بھٹ' کھرکھر بھٹ' سونیابھ بھٹ' ہڈاری بھٹ' کسل کوٹ' کھیری نات بھٹ' سانڈھور بھٹ' جھونڈ بھٹ' سامی بھٹ' ماری واری بھٹ' کھانکھر بھٹ' سائینی جی بھٹ' کوہراڑی بھٹ' جتن واری بھٹ' سوڑھاچار اور سماچار' گولا بھٹ' کانکھ بھٹ' ڈوہری بھٹ' پاتا بھٹ اور عالم سر بھٹ سمیت کئی ایک شامل ہیں۔

میں بھی فرید کی طرح ان ٹیلوں اور بھٹوں کا اسیر ہو گیا ہوں:

سوہنیاں ٹھیڑیاں ٹبڑے بھٹڑے
نازو والے کگڑے وٹڑے
باہیں ٹوبھے پاڑے گھٹڑے
ڈھڑیں ڈکھڑا ووں ہے یار

ترجمہ: ریگستان کے یہ خوبصورت کھنڈر' ٹیلے' بھٹ اور ناز آفریں وطنِ محبوب کے زردرنگ کے ڈھیلے' وہاں کے نشیب' ٹوبھے' تالابوں کے ٹوٹے ہوئے کنارے اور گڑھے ہیں' جن کے مناظر دیکھتے ہی سفر کی تمام کلفتیں دور ہو جاتی ہیں اور دل کو سکون مل جاتا ہے۔

بھٹوں کے علاوہ لاتعداد چھوٹے بڑے چٹیل میدان بھی تھر کی پہچان ہیں جو سیکڑوں میلوں تک پھیلے ہوئے ہیں' تھری اور سرائیکی زبان میں انہیں ''ڈہر'' کہا جاتا ہے۔ تھر اور روہی کے جنگلوں اور بیابانوں میں مسافروں کا بھٹکنا کوئی غیر معمولی بات نہیں لیکن یہ ڈہر بھی مسافروں کو بڑے فریب دیتے ہیں۔ ان میدانوں میں زمین پر ریت کے چمکیلے ذرات جم جاتے ہیں جو دھوپ میں چمک اٹھتے ہیں اور پیاسے مسافروں کو دور سے یوں لگتا ہے کہ کچھ ہی فاصلے پر پانی ہی پانی موجود ہے' یوں ان بے آب و گیاہ میدانوں میں ''سراب'' کئی مسافروں کو پانی کے گمان میں پیاسا مار دیتا ہے۔ ان ڈہروں کے بھی نسبتی اور صفاتی نام ہیں جو پورے تھر میں مشہور ہیں:

''دھاکھی ڈہر' چھچھی جو ڈہر' وچھیری جو ڈہر' ہیکل کوری ڈہر' مینڑ چھو ڈہر' دوکھاری ڈہر' لانی

جوڈہر،بی جوڈہر،ڈسارنوڈہر،پوسرکی جوڈہر،وی جوڈہر،پکوئی جوڈہر،چھوڈہر،گگھوڑوڈہر،تالسر جوڈہر، سینھار جوڈہر،سجائی جوڈہر،چوٹھار جوڈہر،گانگان جوڈہر،گاؤچڑ ڈہر،میھوئر جوڈہر،روہلی ڈہر،نمن جو ڈہر،دھاندوڈہر،کیرلی جوڈہر،موڈودڑوڈہر،ماکنیو ڈہر،بسیاؤڈہر،جیسار جوڈہراور روہلی ڈہر کا شمار صحرائے تھر کے چند اہم ڈہروں میں ہوتا ہے۔

صحرائے عظیم تھر میں اپنی نوعیت کے منفرد چھوٹے بڑے بے شمار درخت ہیں جو عام طور پر دوسرے علاقوں میں نہیں پائے جاتے۔ بڑے درختوں میں کنڈا، جال، کھبڑ، نیم، ببر، ولایتی ببر، روہیڑو، کونبھٹ، سرنگھو، پیپل، بڑ، گیدوڑی، آمن بیر، سرنہہ، کانکھ اور سوانجڑ اں جبکہ چھوٹے درختوں میں اک، پھوگ، کرڑ، بیرڑی، تھوہر، موراڑی، باوری، گانگھیٹی، گگران اور ارنی قابلِ ذکر ہیں۔ اسی طرح تھر کے چھوٹے بڑے پودے اور جڑی بوٹیاں بھی انمول ہیں جو کئی موذی امراض میں ادویہ سازی کے کام آتی ہیں۔ تھر کے بڑے پودوں میں جھل، بوہ، کھپ، سن، بھٹ کنوار، مرٹ، گھاموں، اکڑ، لانا اور لانی جبکہ چھوٹے پودوں میں بھنگری، جھرکلی کھیت، گرامنو، کھیرول، اُبھت، کنڈڑی، ویسونی، کرسن، جوگیڑا، دھاماھو، جونی، ساتوڑو، ہرن چیڑی، جانولیو، ہاڈوا کھراڑ، سنھاڑی، سونیل، بھائیجا بھاٹیا، لاملونی، رینگڑیں، مندھیری، ملیرمیندھی، بوبریو اور سرادھیا کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ تھر اور چولستان میں کئی اور مشترک قدروں کے علاوہ خاص بات یہ ہے کہ درج بالا چھوٹے بڑے درختوں اور پودوں کی کئی ایک اقسام سندھ اور سرائیکی علاقے کے دونوں صحراؤں میں ایک ہی نام سے کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

کئی جنگلی پودے ایسے ہیں جنہیں مال مویشی تو کھاتے ہی ہیں لیکن ان کا پھل یا بور تھر کے لوگ سبزی کے طور پر پکا کر کھاتے ہیں، ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو بارشوں کے بعد خود بخود اگتے ہیں۔ ان میں مریڑو، للر، بگڑو، پپوں، ماماموری اور کھمبیاں (مشروم جو اس وقت قیمتی ترین ترکاری ہے) شامل ہیں۔ یہ بارانی سبزیاں پکانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے، انہیں خاص طریقوں سے پکایا جاتا ہے، جس کا سلیقہ صرف ریگستانی عورتوں کو ہی آتا ہے۔ بارشوں کے بعد یہاں بعض علاقوں میں چھانہہ (تربوز) اگ آتے ہیں جو عام تربوز سے قدرے چھوٹے ہوتے ہیں۔ تروہ، بھی اس صحرا میں بہت ہوتا ہے جو باہر سے بالکل خربوزے کی طرح خوبصورت مگر اس کا گودا انتہائی کڑوا ہوتا ہے۔ یہ خودروز مینی پھل کئی قسم کی بیماریوں میں اکسیر ہوتے ہیں۔

میرے مرشد فرید نے ریگستان کے طرزِ زندگی ٹیلوں' بھٹوں' ٹوبھوں' پودوں' خودرو پھلوں سمیت صحرائی زندگی کے ایک ایک رنگ پر دل کھول کر خوب صورت الفاظ کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ کافی روہی اور تھر کے تناظر میں ایک ایسا منظر نامہ ہے جس پر انسان دل و جان سے فدا ہو جاتا ہے اور واہ واہ کر اٹھتا ہے:

اُتھ دردمنداں دے دیرے
جتھ کرڑ کنڈا بوئی ڈھیر اے
اے اچے ٹبڑے عالی
اے سوہنی گکڑی والی
ہن مشتاقاں دے والی
بیا کون قدم اتھ پھیرے

ترجمہ: یہ ریگستان جہاں کرڑ' کنڈا اور بوئی (صحرائی پودے) جا بجا موجود ہیں' یہ دردمند لوگوں کا مسکن ہے۔ یہ اونچے ٹیلے اور یہ خوب صورت بھوری بھوری ریت عاشقوں کی دل بستگی کا باعث ہے۔ یہاں عاشقوں کے سوا کون قدم رکھ سکتا ہے؟

کھپ کھاراں تے لئی لانے
سنڑھ پھوگ بہوں من بھانے
تھل ٹبے ڈہر ٹکانے
ہر بھٹ بھٹ نال بسیرے

ترجمہ: کھپ ' کھار' لئی' لانے' سنڑھ' پھوگ (یہ بھی چھوٹے بڑے ریگستانی پودے اور بوٹے ہیں) دل کو بہت بھاتے ہیں۔ عاشقوں کے تھل (تھر) میں' ٹیلوں میں ' چٹیل میدانوں میں اور ہر ایک ریگستان کی نشیبی گھاٹیوں میں رین بسیرے ہوتے ہیں۔

مُڈ جھوکاں تے ترٹ تاڈے
رس چھڑے کھیلاں کھاڈے
واہ تکیہ گاہ اساڈے
ہن ہووے کون نکھیڑے

ترجمہ: تپتے صحرا میں مسکن اور آبادیاں' گھاٹ اور بود و باش' صحرائی وسائل آب پاشی چھوٹے چھوٹے جوہڑ اور تالاب' یہ ہیں ہماری محبوب قیام گاہیں (یہ ہمارا مقدر ہیں) اور ان سے ہمیں کون ہے جو جدا کر سکے۔

ٹب ٹوبھے بانہیں سوہندے
وچ چٹکے دل نوں موہندے
جی ہر ویلے پیا لوہندے
ہے ہر دم ہوون نیڑے

ترجمہ: روہی ریگستان میں ٹیلے' تالاب اور ارد گرد کے سارے منظر دھوپ میں دل کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔ ایسے مناظر کے لئے عاشقوں کا دل مضطرب رہتا ہے۔ خدا کرے یہ سارے منظر ہمیشہ عاشقوں کا مقدر رہیں۔

جھڑ گاجاں بجلیاں بادل
کیا چٹڑے گورے سانول
سک سانول کرے اباہل
لڈ ہوت وسم آ ویڑھے

ترجمہ: گھنگور گھٹائیں' چمکتی بجلیاں' اڈتے گورے' کالے اور سانولے بادل عاشقوں کے من میں وصال یار کی تپش تیز کر دیتے ہیں۔ ایسے میں آرزو جوبن پر ہوتی ہے کہ محبوب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے سنگ رہے۔

ولھ ککڑیاں رتبھڑ کچریاں
کئی سبز متیرے ککھڑیاں
کئی گدریاں پیلیاں ککڑیاں
سر روہی سوہندے سہرے

ترجمہ: ریگستان کے دن کیا پھرے ہیں۔ ہر طرف تربوز اور خربوزوں کی بیلیں پھوٹ پڑی ہیں۔ ہر طرف ان کا رنگ اور بو پھیلی ہے۔ یہ تمام خوب صورت رنگ (پھل) روہی (ریگستان) کے سر پر سہرے کی مانند ہیں۔

خش کترن عطروں بھنڑی
گز لائی ساوی سنڑی
کھا ساگ پُسی دی پھنڑی
نبھ ویندے وقت سکھیرے

ترجمہ: (ریگستان کی) فضا کترن کی خوشبو میں مہک رہی ہے۔ (بارش کے بعد) ہر طرف سبزے کی چادر بچھی ہے۔ ایسے میں صحرائی سبزیوں کی سوغاتیں اور ساگ کھا کر وقت سکھی اور موج میں گزر جاتا ہے۔

دل ہر ویلے پئی تانگھے
ونج ڈیکھاں مال دے لانگھے
گئیں بکریاں بھیڈاں چھانگے
لگھ پوندم قدم اگیرے

ترجمہ: دل چاہتا ہے کہ (ٹیلوں اور بھٹوں میں) جا کر مویشیوں کی آمد و رفت کے راستے دیکھے جائیں اور دیکھا جائے کہ کیسے گائیوں' بکریوں اور بھیڑوں کے ریوڑ کے ریوڑ (صحرائی چراگاہوں میں) گھوم رہے ہیں۔ یہ (دل فریب) منظر دیکھنے کے لئے قدم خود بخود از راہِ شوق (صحرا کی طرف) اٹھتے ہی چلے جاتے ہیں۔

سنج واہ اساڈیاں جھوکاں
سن کملے کملے کردے ٹوکاں
کجھ خبر نہیں انہاں لوکاں
دل پٹھڑے سخت اویڑے

ترجمہ: ہمارے مسکن اجاڑ جگہوں اور ویرانوں (روہی) میں ہیں جن کے بارے میں سن جان کر نادان لوگ بھی ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کم عقل لوگوں کو دل کے معاملات اور عشق کی آزمائشوں کی خبر ہی نہیں ہے۔

بٹھ شہر بزار عمارت
بے واہی برہوں بشارت

پر بے شک عشق اشارت
چھڈ جھگڑے کوڑے جھیڑے

ترجمہ: ہمارے لئے شہر' بازار اور عمارتیں (رونقیں) بے معنی ہیں۔ ہم عشق کے ماروں کا ہجر (ویرانے) مقدر ہے۔ اور ہمارے عشق کا نصاب یہ ہے کہ عشق کے سوا دنیا میں سب کچھ بے سود اور بے کار ہے۔

تھیاں روہی مینگھ ملہاراں
کل گل گلزار بہاراں
وچ سوہندیاں گھنڈ تواراں
ہر ٹوبھے چھانگاں چھیڑے

ترجمہ: (خدا نے پیاسی روہی کی فریاد سن لی ہے) ریگستان بارشوں سے جل تھل ہو گیا ہے۔ ہر سُو پھول کھل اٹھے ہیں۔ ہر جانب بہار ہی بہار ہے۔ بہار کے اس موسم میں تالابوں کے گرد پھیلے مویشیوں کے ریوڑ بھلے معلوم ہو رہے ہیں اور جانوروں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں کانوں میں رس گھول رہی ہیں۔

سوکرے کنڈڑے کاٹھیاں
لکھ ڈنگر اوکھیاں گھاٹیاں
سبھ ڈنگڑے وٹڑے چاٹیاں
جتھ تھیم فرید وہیرے

ترجمہ: ریگستان کی راہوں میں پڑے کنکر' کانٹے اور لکڑیاں.... تکلیف دہ اور دشوار گزار راستے اور مشکل گھاٹیاں' یہ وہ سب ہیں جنہوں نے فرید کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے۔

شاہ لطیف ''سر مارئی'' میں رقم طراز ہیں:

حال اہل وطن کا کیا ہو گا
میں ادھر قید وہ اُدھر ناشاد
میری آنکھوں میں ہیں وہ سبزہ زار
کتنے گنجان کس قدر آباد

آہ وہ پھرہ ' لانی اور ساڑھوئی
چٹکیاں لے رہی ہے جن کی یاد
اف یہ زنداں یہ آہنی زنجیر
ہائے یہ ظلم اور یہ بیداد
آرزوئیں ہیں سہمی سہمی سی
اور تمنا ہے مائلِ فریاد
پاس ہے اپنے عہد وپیاں کا
چھوڑ دے مجھ کو اے ستم ایجاد

تھر کی مرکزی شاہ راہوں کو چھوڑ کر پورے تھر کا سفر خشکی کے راستوں کا ہے جو زیادہ تر پیدل یا اونٹوں کے ذریعے طے کیا جاتا ہے۔ اہم شہروں اور پختہ سڑکوں سے مختلف دور دراز علاقوں کے لئے ''کیکڑا'' (کیکڑا تھر کی فور ویل ڈرائیو منفرد سواری ہے جس کا تعارف آنے والے صفحات میں آئے گا) دستیاب ہے لیکن جدید یا قدیم سفری سہولتوں سے تھرپارکر کی صرف دس فیصد آبادی ہی مستفید ہو پاتی ہے۔ جہاں ''کیکڑا'' دستیاب نہیں وہاں لوگ پیدل' گدھے' گھوڑے اور اونٹ کی سواری کرتے ہیں۔ فاصلے طویل اور دشوار گزار ہونے کی وجہ سے مسافر اپنا سفر رک رک کر کرتے ہیں۔ مسافروں کے قیام و آرام کے لئے مقامی ساہوکاروں نے تھر کے بڑے شہروں چھاچھرو' مٹھی اور اسلام کوٹ میں دھرم شالے قائم کر رکھے ہیں۔ حکومت نے بھی تھر کے مختلف علاقوں میں اہم گزرگاہوں پر واقع گوٹھوں میں مسافر خانے تعمیر کر رکھے ہیں جہاں مسافر رک کر آرام کرتے ہیں۔ اب یہ مسافر خانے ضلع کونسل کی نگرانی میں ہیں۔ تحصیل مٹھی میں ایسے ۹' تحصیل چھاچھرو میں ۱۰' تحصیل ڈیپلو میں ۱۰ اور تحصیل نگرپارکر میں ۹ مسافر خانے موجود ہیں۔

تھر میں آبادیاں طویل فاصلوں پر قائم ہیں' بعض علاقوں میں تو ایک گوٹھ دوسرے گوٹھ سے سیکڑوں میل کی مسافت پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ صدیوں سے وہاں آباد ہیں۔ تھر کے باشندے صحرا کی کٹھن زندگی کے باوجود بھی اپنے آبائی علاقوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ صحرا میں زیادہ تر گوٹھ بھٹوں پر' کہیں بھٹوں کے دامن میں' کہیں صحرائی درختوں کے جھرمٹ میں اور کہیں سپاٹ زمین پر ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹا گوٹھ ۱۰ / سے ۱۲ / اور بڑا گوٹھ ۴۰۰ / گھروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

ایک گوٹھ میں آباد عام طور پر زیادہ لوگ ایک ہی خاندان یا ایک ہی قبیلے کے ہوتے ہیں۔ اگر ایک گوٹھ میں ایک سے زیادہ برادریوں اور قبیلوں کے لوگ رہائش پذیر ہوں گے تو پھر ہر ذات برادری کا الگ پاڑا (محلّہ) ہوتا ہے جو اُن کے سرداروں یا ذاتوں سے منسوب ہوتا ہے۔ ایسا زیادہ تر بڑے گوٹھوں میں ہوتا ہے۔ تھر کے گوٹھوں میں زیادہ تر غریب مارو چنوروں اور منہوں میں رہائش رکھتے ہیں۔ تھر کے شہروں میں کھاتے پیتے لوگ اور ساہوکار نسبتاً اچھے اور پختہ گھروں میں رہتے ہیں جو اینٹوں اور سیمنٹ سریئے سے تعمیر کئے جاتے ہیں۔

تھر کے چنورے دیکھنے میں خوبصورت اور قابلِ دید ہوتے ہیں۔ چنورا کے لئے کم از کم دس سے بارہ فٹ کے دائرے میں کچی دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور اس پر صحرائی گھاس پھونس کی چھتری نما چھت بنادی جاتی ہے۔ اس گول دائرے میں آنگن کی جانب ڈھائی فٹ چوڑا ایک خلا رکھا جاتا ہے جو دروازے کا کام دیتا ہے۔ چنورے کی چھت ماروؤں کو گرمیوں میں دھوپ' سردیوں میں ٹھنڈی ہوا اور ساون میں بارش کے پانی سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہر چنورے کے آگے مٹی کی چوکی بنی ہوتی ہے جہاں صحرائی عورتیں بیٹھ کر دودھ بلونے 'سلائی' کڑھائی اور گھریلو کام کرتی ہیں۔ ہر گھر کی بڑے خوبصورت انداز میں باڑھ کے ذریعے حد قائم ہوتی ہے۔

پاڑوں میں بڑی ترتیب کے ساتھ چنورے بنائے جاتے ہیں اور گھروں کے درمیان آنے جانے کے لئے راستے رکھے جاتے ہیں۔ ہر گوٹھ کے قریب بکریوں' بھیڑوں اور مویشیوں کے باڑے بنائے جاتے ہیں۔ اب تھر کے گوٹھوں میں بھی کافی سدھار آیا ہے اور وہاں بھی کچے پکے گھر بننے لگے ہیں۔ تھر کا قدیم رواج ہے کہ جب بھی کوئی چنورا تعمیر کرنا ہوتا ہے تو اس کے لئے عاملوں سے رجوع کیا جاتا ہے جو اس کے لئے مہورت نکالتے ہیں' اس کام کے لئے سعد دن اور وقت کا تعین کیا جاتا ہے' جس کے بعد ''گھر'' کی تعمیر کا آغاز کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کی سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب ہوتی ہے جس میں گاؤں کی اکثریت شریک ہوتی ہے اور کچھ نہ کچھ پکا کر تبرکاً سب کو کھلایا جاتا ہے۔ اس رسم کو مقامی زبان میں ''رانگ ڈاہن'' کہتے ہیں۔ تھر میں یہ رواج کم و بیش مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ملتا جلتا ہے۔

تھری عورتیں محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں۔ مسلمان آبادیوں میں ''مُلاں بانگ'' (مولوی کی فجر کی اذان) اور غیر مسلم گوٹھوں میں ''ککڑ بانگ'' (مرغِ سحر کی اذان) پر بیدار ہوتی ہیں اور سردی

ہو یا گرمی' رات گئے تک امورِ خانہ داری کے علاوہ اپنے مردوں کے شانہ بہ شانہ مشقت کرتی ہیں۔ ان کے دن کا آغاز چکی پیسنے سے ہوتا ہے۔ گھر کی کچھ عورتیں بکریوں' بھیڑوں کا دودھ دوہنے اور کنوئیں سے پانی بھرنے کے لئے نکل کھڑی ہوتی ہیں اور گھر میں موجود دیگر عورتیں گھر کی جھاڑ پونچھ کر کے دودھ بلونے بیٹھ جاتی ہیں جسے مقامی زبان میں ''ولوڑا'' کہتے ہیں۔ اگر رات کا بچا کھانا ہو تو مردوں اور بچوں کو کھلا دیا' نہیں تو تازہ روٹی پکا کر بچوں اور مردوں کو کھلائی' خود بھی کھائی اور باڑوں کا رخ کیا اور جانوروں اور مویشیوں کو چرنے کے لئے جنگل روانہ کرا کے گھر لوٹیں تو پھر گھر کے کاموں میں جت گئیں۔ گھر گرہستی سے فارغ ہوتے ہی تھری عورتیں سلائی کڑھائی کے کاموں میں لگ جاتی ہیں جو گلہ بانی کے علاوہ ان کا ایک اور ذریعہ معاش بھی ہے۔

تھری عورتیں غربت اور ناداری کے باوجود اپنے مردوں کو ٹوٹ کر چاہتی ہیں۔ تھری عورت کی اپنے مرد اور دھرتی سے وفاداری کسی شک وشبے سے بالاتر ہوتی ہے۔ اپنی گھریلو ذمہ داریوں سے جونہی فراغت پاتی ہیں اپنے مردوں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔ کام کوئی ہو' گلہ بانی یا کھیتی باڑی' تھری ماروِیاں اپنے ماروؤں کے سنگ خون پسینہ ایک کر دیتی ہیں۔ تھری عورت مرتی مر جائے گی مگر جب تک اس کا مرد کھانا نہیں کھائے گا وہ اپنے لئے ایک نوالہ بھی حرام سمجھتی ہے۔ اگر مردوں کو کام سے آنے میں دیر ہو جاتی ہے تو وہ بچوں کو کھانا کھلا کر سلا دیتی ہیں اور خود اپنے ماروؤں کا گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر وسوسوں کے ساتھ انتظار کرتی ہیں اور انہیں پہلے کھانا کھلا کر پھر کہیں کسی کونے میں دبک کر خود بھی تھوڑا بہت کھا لیتی ہیں۔ تھری عورتیں کبھی اپنے مردوں سے آنکھیں چار نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتی ہیں' ایسا کرنا تھری سماج میں انتہائی معیوب اور مردوں کی شان کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

تھری عورت جی جان سے اپنے مرد کی وفادار ہوتی ہے۔ تھری سماج میں زندگی کا ہر فیصلہ مرد کرتا ہے' عورتیں بلا اکراہ و اجبار ہر فیصلہ قبول کر لیتی ہیں۔ یہاں دوسری شادی کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف موت کی صورت میں ایسا ممکن ہوتا ہے کہ مرد یا عورت کو عقدِ ثانی کی اجازت مل جاتی ہے۔ اگر کوئی عورت زندگی کی بازی ہار بیٹھتی ہے تو پنچائیت یا برادری کے بزرگ مرد کی شادی اس کی خواہرِ نسبتی سے کر دیتے ہیں۔ ان کا ماننا یہ ہوتا ہے کہ مرحومہ کی اولاد کو جتنا پیار ان کی خالہ دے سکتی ہے کوئی اور نہیں دے سکتا۔ مسلمانوں میں مرد کے انتقال کی صورت میں عورت کو

دوسری شادی کی اجازت ہے لیکن اس کا دوسرا خاوند بھی وفات پا جائے تو عورت کو ایک اور شادی کی اجازت نہیں ہے۔ تھر میں طلاق کا رواج صرف مسلمانوں میں ہے۔ مرد اور عورتیں دونوں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ طلاق کے بغیر مرد دوسری شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ تھری عورت سخت جان، حوصلہ مند اور وفا کی دیوی ہے، اس کی تمثیل کے لئے ایک ماروی ہی کا استعارہ کیا کم ہے۔ تھر کا ہر مارو کھیت ہے اور تھر کی ہر عورت ماروی۔ سندھی میں یہ اصل لفظ مارئی ہے جبکہ اردو میں ماروی مستعمل ہے جو مروج ہو گیا ہے۔

جس طرح سندھ کے دوسرے علاقوں میں شہروں اور گوٹھوں کے ناموں کے آگے یا پیچھے ''ٹنڈو''، ''کوٹ'' یا ''آباد'' جیسے الفاظ جڑے ہوتے ہیں اسی طرح تھرپارکر میں بھی گوٹھوں کے ناموں کے ساتھ بھی اس طرح کے الفاظ منتھی ہوتے ہیں، جیسے ہار، یار، ڑی، بھ، لس، ئی، ئیو، یو، سر، لو اور تڑ۔ ان گوٹھوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ہار: چیلہار، سینہار، کاریہار، مالیہار، ڈھیڈ ہار، ویڑہار، کانکھنہار، کلنہار، روڈ ہار، قمڑ ہار، اڑبلہار، لونڈ ہار، پھلڑ ہار اور رامر ہار۔

یار: صوبھیار، مالیہار، موکھڑیار، واوڑیار، گوڑ ہیار، سارنگھیار، نیئیار، چاڑ ہیار، وتجھیار، گوڈیار اور راڑ ہیار وغیرہ۔

ڑی: بلیہاڑی، جاگہاڑی، وتجھیاڑی، سینگھاڑی، پتنگیاڑی، میہاڑی، کیتلاڑی اور کیتاڑی وغیرہ۔

بھ: گجنابھ، ھمڑ ابھ، ویریابھ، سونل بھ، گلڑ ابھ اور پھلڑ ابھ وغیرہ۔

لس: گنگالس، ہندنالس، چھوٹالس اور وار یالس وغیرہ۔

ئی: دونہائی، ہتھڑ ائی، بھونگڑائی اور وادھڑائی وغیرہ۔

ؤ: گالہائیو، دیہائیو اور دھائیو وغیرہ۔

یو: سینگھاڑیو، بگھاڑیو، ٹانکاریو، ہیلاریو، پھٹاریو، دھینگاریو، دیندار یو، رنپاریو، دھانبھاریو، پھانگاریو اور باٹاریو وغیرہ۔

سر: سر سندھی اور سرائیکی زبانوں میں تالاب کو کہتے ہیں۔ میرے مرشد فرید اور لطیف نے اپنی شاعری میں جابجا ان ٹوبھوں (تالاب) کا ذکر کیا ہے۔ رام سر، راوت سر، کینی سر، عالم سر، کڑ کا

سر، لکڑاسر، تگوسر، سومروسر، راناسر، بوڑھیسر، گوگاسر، کپوسر اور پیاسر وغیرہ۔

لو: بھوریلو، جاریلو، رنگیلو، شولو، باورلو، لپلو، دھاکلو اور باپنلو وغیرہ۔

تھر میں بعض گوٹھوں کے نام تڑ (کنوئیں)، پاڑوں (محلے) اور گوٹھوں تک جانے والے راستوں پر رکھے گئے ہیں۔ اگر کنواں سب نے مل کر کھدوایا ہوگا تو پھر گوٹھ کا نام قبیلے یا ذات سے موسوم کر دیا جاتا ہے، جیسے کھینجھین جوتڑ، دلن جوتڑ۔ یہ کنوئیں مسلمان قبیلوں کھینجھی اور دل ذات کے لوگوں نے کھدوائے، اس لئے ان گوٹھوں کے نام ان ذاتوں پر رکھے گئے ہیں۔ کوئی صاحبِ ثروت اور بااثر شخص اپنے وسائل سے اپنے گوٹھ میں کنواں کھدواتا ہے تو اس گوٹھ کا نام اس کے نام پر پڑ جاتا ہے، جیسے صالح جوتڑ (صالح کا کھدوایا ہوا کنواں)، احمد جوتڑ (احمد کا کھدوایا ہوا کنواں)، میگھے جوتڑ (میگھے کا کھدوایا ہوا کنواں)، پیلو جوتڑ (پیلو کا کھدوایا ہوا کنواں)، آدم جوتڑ (آدم کا کھدوایا ہوا کنواں)، ڈاتر ڈنے جوتڑ (ڈاتر ڈنے کا کھدوایا ہوا کنواں)، طالب جوتڑ (طالب کا کھدوایا ہوا کنواں)۔ تھر میں بعض کنوئیں ایسے ہیں جو بعض تاریخی ناموں اور کرداروں سے منسوب اور مشہور ہیں جیسے ماری جوتڑ (ماروی کا کنواں)، یہ کنواں تھر کی عظیم دختر ماروی کے نام سے مشہور ہے لیکن گوٹھ ماروی کا گوٹھ تو ضرور کہلاتا ہے مگر اس کا نام ہے بھالوا۔

سندھ کے تینوں زمینی حصوں بالائی سندھ، وسطی سندھ اور زیریں سندھ (لاڑ) میں وڈیروں، قبائلی سرداروں اور قبیلوں کے نام پر اکثر شہر اور گوٹھ آباد ہیں۔ تھر میں بھی بیشتر گوٹھوں کے نام گوٹھ میں آباد ذات برادری کے سربراہ یا قبیلے کے سردار کے نام پر رکھے گئے ہیں، جیسے بنگل رند، سموں رند، بھانبھنو بھیل وغیرہ، یہ انفرادی ناموں سے موسوم گوٹھ ہیں جو وہاں مقیم برادریوں اور قبیلوں کے جدامجد یا سربراہوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ضلع تھر کی اہم فصلوں میں کپاس، مرچ، گنا، گندم، جوار، تل اور باجرہ کا شمار ہوتا ہے جبکہ سبزیاں اور دیگر فصلیں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ تھر میں صرف ۲ لاکھ ۳۰ ہزار ۳۲۴ ایکڑ رقبہ قابلِ کاشت ہے۔ بہت تھوڑا رقبہ جمڑاؤ کینال کے ذریعے کاشت ہوتا ہے ورنہ یہاں فصلوں کی پیداوار کا زیادہ تر انحصار بارانِ رحمت پر ہے۔ ایک فصل کے لئے کم از کم تین بارشیں ضروری ہیں۔ جب بارشیں نہیں ہوتیں تو نہ فصلیں ہوتی ہیں اور نہ چارہ، ان حالات میں نہ انسان کی زندگی محفوظ رہتی ہے نہ جانوروں کی۔ ایسے میں نقل مکانی تھریوں کی مجبوری بن جاتی ہے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اس وقت جب کہ دنیا طلسماتی ترقی کے ذریعے عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے' اس علاقے میں فضائی یا ریلوے کی سہولت میسر نہیں ہے حالانکہ اس ڈویژن کی ایک شخصیت دو مرتبہ وزیر ریلوے اور ایک مرتبہ وزیر اعظم منتخب ہوئی۔ تھر پارکر اور میر پور خاص کے صحرا پر مشتمل اس خطے کے سیاستدانوں میں محمد خان جونیجو' مظفر حسین شاہ' رانا چندر سنگھ' ارباب حاجی تاج محمد' ارباب امیر حسن' ڈاکٹر ارباب غلام رحیم' ارباب ذکا اللہ' حاجی غلام محمد لاٹ' گل محمد لاٹ' کھٹومل جیون' فقیر شیر محمد بلالانی' خان بہادر غلام محمد وسان' ارباب نیاز وسان' جگدیش کمار ملانی' موتی رام ملانی' ڈاکٹر مہیش کمار ملانی سمیت کئی اہم نام سامنے آئے ہیں۔

اس صحرا میں ہرن' تیتر' مور' تلور' عقاب اور کئی دیگر نایاب پرندے اور جانور پائے جاتے ہیں۔ دنیا کے سانپوں کی خطرناک ترین اقسام بھی یہاں پائی جاتی ہیں' جنہیں مقامی لوگ کھپرا اور کاریہر کہتے ہیں۔ سانپ کے کاٹے کا تریاق جس سانپ کے زہر سے تیار کیا جاتا ہے وہ بھی یہاں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور خطرناک قسم ''پیئن بلا'' کی ہے جو تھر کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہ لگ بھگ چھ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس کا منہ پتلا اور دم بھی پتلی اور یہ درمیان سے موٹا ہوتا ہے۔ یہ عجیب وغریب سانپ ہے جو ڈستا نہیں بلکہ سوئے ہوئے آدمی کے منہ میں پھونک مارتا ہے اور آدمی بارہ گھنٹے میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔ اس کا علاج ابھی تک دریافت نہیں ہو سکا۔ ان سب آزمائشوں کے باوجود ریگستان میں پائے جانے والے یہ پرندے' جانور اور حشرات الارض ان جنگلوں کا حسن ہیں:

کوئل کوکے مور چنگھاڑے
اگن پپیہے کرن ٹلارے
ہر ہر وحشی کر للکارے
گیت خوشی دے گاندا ہے

کارونجھر نامی پہاڑ بھی اسی ضلع میں واقع ہے' جو کم وبیش تین سو مربع کلومیٹر رقبے میں پھیلا ہوا ہے اس کی اونچائی ۳۰۵ میٹر ہے۔ تھر کے پڑوسی ضلع میر پور خاص کی آبادی ۹ رلاکھ ۵ ہزار ۹۳۵ ہے جس میں سے ٦٦ رفیصد مسلمان' ۲۵ رفیصد ہندو اور باقی ۷ رفیصد قادیانی' عیسائی و دیگر مذاہب کے لوگ شامل ہیں۔ دوسرے ضلع عمر کوٹ کی آبادی ٦ رلاکھ ٦۳ ہزار ۹۵ ہے۔ ضلع کی

۵۱ رفیصد آبادی مسلمان' ۳۹ رفیصد ہندو اور بقیہ دیگر مذاہب کی پیروکار ہے۔ اسی ڈویژن کے چوتھے ضلع سانگھڑ کا کچھ حصہ بھی ریگستانی ہے' گویا تھر کا صحرا نہ صرف ضلع تھر بلکہ سانگھڑ عمر کوٹ اور میر پور خاص اضلاع تک بھی پھیلا ہوا ہے۔

تھر میں مختلف ادوار میں مختلف خاندانوں کے نمائندہ حکمرانوں نے اپنا اقتدار بچانے اور اسے طول دینے کے لئے مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال کیا۔ ان کی تمام تر توجہ سلطنت پر قبضہ برقرار رکھنے اور اسے توسیع دینے پر مرکوز رہی' عوام کی ترقی اور بہتری ان کی ترجیحات میں شامل ہی نہیں رہی۔ انگریز اس سرزمین میں سازش کے ذریعے داخل ہوئے اور ایک دن سیاہ وسفید کے مالک بن گئے لیکن یہ کریڈٹ بھی انگریزوں ہی کو جاتا ہے کہ طلسمات کی اس سرزمین پر عوامی مفادِ عامہ کے کاموں کا آغاز سب سے پہلے انہوں نے ہی کیا۔ تھر پارکر میں ریونیو اور انتظامی نظام پہلی مرتبہ انگریز دورِ حکومت میں متعارف کرایا گیا۔ کیپٹن راتک' کرنل ٹراوٹ' کرنل کروفوٹرم' واٹسن اور پولن نے اپنے اپنے ادوار میں اس خطے میں انسانی ترقی کے لئے کئی اہم خدمات انجام دیں۔ ان شخصیات نے پیاسے تھر میں کنوئیں کھدوائے' اسکول قائم کئے' اسپتال تعمیر کئے' تھانے اور بارکس بنائے۔ یوں تو تھر سندھ کے دیگر علاقوں کی نسبت بہت زیادہ پرامن اور پرسکون ہے' اس کے باوجود ان انگریزوں نے قیامِ امن اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لئے اہم اقدامات کئے جن کی وجہ سے وہ آج بھی اچھے لفظوں سے یاد کئے جاتے ہیں۔

نوکوٹ' مٹھی' اسلام کوٹ' ننگر پارکر شاہراہ سے ہٹ کر دور دراز علاقوں تک رسائی کے لئے یہاں کی مروج اور مقبول ترین سواری ''کیکڑا'' ہے۔ ریتلے رستوں پر عام گاڑی نہیں چل سکتی اس لئے پرانے فور ویل ڈرائیو فوجی ٹرکوں کو مقامی ضرورتوں کے مطابق ڈھال لیا جاتا ہے۔ مقامی ہنرمند ان فوجی ٹرکوں میں چوبی تختے جوڑ کر اور اس کی باڈی بنا کر اس کا حلیہ ہی بدل دیتے ہیں اور اسے ''کیکڑا کوچ'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اب ان کیکڑوں کو خوب صورت قالب میں ڈھالا جاتا ہے۔ صحرائے تھر میں انسانوں اور جانوروں کو ایک سے دوسرے علاقے تک پہنچانے کا یہ واحد وسیلہ ہے۔ عام طور پر اس کا رات کا سفر بہت خطرناک ہوتا ہے کیونکہ ڈرائیور کی ذرا سی غلطی بھٹکا دیتی ہے تو گھنٹوں کا سفر دنوں میں ڈھل جاتا ہے۔ صحرائی علاقوں میں کچے راستوں پر گاڑیوں کی آمد ورفت کے موہوم سے نشان منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے رہنمائی اور سڑکوں کا کام دیتے

ہیں۔ چولستان میں ان نشانات کو ''لینبہ'' اور تھر میں ''چیلا'' کہتے ہیں۔ صحرا کے مسافر کو ہمیشہ ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی بھی صورت میں اس نشان سے نہیں ہٹنا ہے ورنہ ''پندھ کھوٹا'' ہو جاتا ہے یعنی آپ بھٹک کر منزل سے دور ہو سکتے ہیں۔ تھر کی کیکڑا کوچوں کے ڈرائیور عام طور پر سفر کے دوران راستے میں آنے والے درختوں' ٹیلوں اور بھٹوں کو نشانیوں کے طور پر یاد رکھتے ہیں اس طرح ویرانوں میں بھٹکنے کا احتمال کم رہ جاتا ہے۔

صحرائے تھر کے دور افتادہ علاقوں کے لوگ عہدِ جدید میں بھی غاروں اور پتھروں کے زمانے کی زندگی جھیلنے پر مجبور ہیں۔ سڑکوں سے جڑے شہروں اور قصبوں میں کسی حد تک بجلی' پانی' تعلیم اور صحت کی سہولتیں موجود ہیں لیکن دور دراز گوٹھوں میں رہنے والے ان نعمتوں سے ابھی تک محروم ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ٹیلی فون کی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں آبادیاں ایک دوسرے سے اس قدر دور ہیں کہ مشکل کی گھڑی ہو یا کوئی ہنگامی صورتِ حال' ایک دوسرے تک اطلاع پہنچانا اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔ یہاں پیغام رسانی اور اطلاع بہم پہنچانے کے لئے روایتی طریقے استعمال میں لائے جاتے ہیں جو صدیوں سے یہاں مروج ہیں۔

تھر کی ذرائع آمد و رفت سے کٹی دنیا میں بھونکتے کتے آبادیوں کی اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ جونہی کوئی اجنبی کسی بستی کے قریب پھٹکے' بھونکتے ہوئے کتوں کا ایک غول باسیوں کو اس کی آمد کی اطلاع دیتا ہے' بستی والے سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی خبر آئی ہے یا کوئی خبر لایا ہے۔ اطلاع کا یہ وسیلہ صحرائے تھر کی قدیم ترین روایت ہے۔ انگریز جب سندھ میں آئے تو اپنے ساتھ ٹرانسسٹر کی صورت میں اطلاع عام کا ایک اہم وسیلہ لے کر آئے جس نے اطلاع رسانی کی دنیا میں دھوم مچا دی۔ اب بھی تھر کے لوگ خبر گیری کے لئے زیادہ تر ٹرانسسٹر ریڈیو پر اکتفا کرتے ہیں۔ پورے تھر پارکر میں ذرائع مواصلات انتہائی محدود ہیں۔ گو کہ عہد حاضر میں سیل فون نے مواصلاتی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا ہے مگر صحرا کا عام آدمی خاص طور پر دور دراز علاقوں میں رہنے والے تھری اب بھی اس سہولت سے محروم ہیں۔

تھر میں ڈاک کا نظام چلانا تقریباً ناممکن ہے کیونکہ فاصلے بہت زیادہ ہیں اور دور دراز علاقوں میں ڈاکخانے قائم کرنا از بس محال ہے۔ ایک گوٹھ سے دوسرا گوٹھ سیکڑوں کلومیٹر پر واقع ہے' اس لئے عام طور پر پیغام رسانی کے لئے روایتی طریقوں پر انحصار کیا جاتا ہے۔ اس وقت تھر میں

اطلاع بہم پہنچانے کے جو ذرائع استعمال ہوتے ہیں ان میں زیادہ تر روایتی ہیں جو صدیوں سے استعمال ہو رہے ہیں۔ صحرا میں ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پیغام رسانی کے لئے اونٹ یا گدھے سواروں' مسافروں اور ڈرائیوروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور انہیں اگلی منزل کے لئے اپنا پیغام یا اطلاع سونپ دی جاتی ہے۔

''لکڑ تاڑ'' تھر کا ایک اور قدیم ترین پیغام رسانی کا طریقہ ہے جو پورے تھر میں آج بھی رائج ہے۔ اگر کبھی کسی تھری کو کہیں کوئی اطلاع یا پیغام پہنچانا ہو تو لوگ ''کیکڑا اسٹاپ'' جا کر جہاں پیغام پہنچانا ہو وہاں کے مسافر کو وہ پیغام امانت کے طور پر حوالے کر دیتے ہیں جو وہ منزلِ مقصود تک بہر صورت پہنچاتا ہے۔ تھر کے لوگ پیغام رسانی کے معاملے میں بڑی ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں اس طرح کی ہنگامی صورتِ حال سے ان کا خاندان بھی دوچار ہو سکتا ہے' اس لئے وہ منزلِ مقصود پر پہنچ کر سب سے پہلے اسی فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں اور پھر اپنے گھروں کو جاتے ہیں۔ ہزاروں سال بیت گئے ہے' دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے' وقت اور حالات نے کئی چیزوں کے رنگ ڈھنگ بدل دیئے ہیں لیکن تھر میں پیغام رسانی کی یہ روایتیں آج بھی قابلِ اعتبار اور مستحکم ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے لیکن روایتوں کے چنگل میں جکڑا تھر' آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں صدیوں پہلے موجود تھا۔ تھر میں وقت ٹھہر سا گیا ہے۔

تھر کی ماروی نے اپنے ملک ملیر بھالوا کی ریت اور چنوروں کی سخت اور پر آزمائش زندگی کو عمر سومرو کے محلات کی آسائشوں پر ترجیح دے کر دھرتی اور لوئی کی لاج رکھ لی تھی لیکن خشک سالی کے باعث جنم لینے والی بھوک' پیاس اور بیماری نے اس علاقے کے باشندوں کو جنہیں پیار سے مارو کہا جاتا ہے' اجاڑ کر رکھ دیا ہے اور انہیں اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ وہ بڑے پیمانے پر زرعی اور پر رونق علاقوں کی طرف نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ عارضی نقل مکانی ہے' پھر جب دن پھریں گے' پیاسے تھر میں بارش ہوگی اور یہ خانہ خراب مارو اپنے گھروں کو لوٹیں گے:

کتنے خوش ہوں گے اے عمر وہ لوگ
رت ہے برکھا کی آج کل تھر میں
کوئی کاٹے گا کوئی کاتے گی
اون ہی اون ہوگا ہر گھر میں

کتنے خوش ہو کے بُن رہے ہوں گے
نت نئی کملیاں وہ ''کھائز'' میں
گوسفندوں کی وہ توانائی
وہ طرارے نشیب ''بھائز'' میں
وہ حسیں بیلیں اور برگ وبار
اب کہاں ہیں مزے مقدر میں
کہتی ہوں گی ملیر کی سکھیاں
کاش آجائے ماروی تھر میں
اے عمر جھونپڑوں کا وہ سکھ چین
کیا ملے گا محل کے بستر میں



تھرپارکر کے تاریخی مقامات: ایک جھلک

صحرائے تھر اپنے وجود میں ہفت اقلیموں کے مساوی تہذیبی رنگ اور خزانے سموئے ہوئے ہے۔ اس کی قدیم تہذیب وادی مہران کا عظیم سرمایہ ہے جس پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے۔ نوکوٹ سے بھارت سے ملحقہ تھر کے سرحدی شہر ننگر پارکر تک' طوں وعرض میں بکھرے کوٹ' قلعے' گئوشالے' مسجدیں' مندر' تاریخی مقامات اور بندرگاہوں کے آثار حرماں نصیب تھر کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ تاریخی آثار ماضی میں صحرائے تھر کا رخ کرنے والے مختلف المذاہب قبیلوں' حملہ آوروں اور ہزاروں برسوں سے یہاں آباد لوگوں کی ذہنی وابستگیوں' دلچسپیوں اور ان کے مخصوص فن تعمیر کے عظیم مظاہر اور یادگاریں ہیں۔

ہندوستان میں ہندو مذہب کے ردعمل میں کئی مذہبی تحریکیں وجود میں آئیں جن میں بدھ مت اور جین مت تحریکیں قابلِ ذکر ہیں جو آگے جا کر دو الگ مذاہب کی شکل اختیار کر گئیں۔ گو کہ جین مذہب' بدھ مذہب کا ہم عصر ہے لیکن بدھ مذہب ہندوستان سے باہر نکل کر کئی ملکوں چین' جاپان' تھائی لینڈ' برما اور دیگر کئی ممالک تک پھیل گیا۔ اس کے برعکس جین دھرم محض ہند اور سندھ تک محدود رہا۔ اسی طرح بدھ مذہب سندھ کے کونے کونے تک پھیلا لیکن جین مذہب سندھ میں بھی صرف تھر تک محدود رہا۔ روایات میں ہے کہ اس دھرم کے بانی مہاویر تھے۔ تھر میں خاص طور پر پارکر میں جین مذہب کی باقیات آج بھی جا بہ جا موجود ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاتھوں ہونے والی تعمیرات بھی تھر کے طول وعرض میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مجھے خوشی ہوگی کہ میں اس طویل سفر میں ان تاریخی مقامات کا مختصر تعارف ان صفحات کی زینت بناؤں جو مختلف علاقوں میں میری نگاہوں میں آئے ہیں۔ اس عظیم صحرا کی سب سے بڑی اور طویل یادگار تو بزرگ دریا ''پُران'' کے سیکڑوں میلوں پر محیط آثار ہیں جو سکرنڈ اور میرپور خاص سے لے کر رن آف کچھ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شدید بارشوں کے دنوں میں آج بھی یہ آثار اس کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ لیکن وسیع تھرپارکر میں ایسے کئی تاریخی مقامات ہیں جن کا تذکرہ کئے بغیر تھر کا طائرانہ جائزہ ادھورا رہے گا۔ تھر کے موجودہ شہروں میں پاری نگر' امرکوٹ' بوڈھیسر' ویراواہ' کیرتھی اور کاسبو بہت قدیم شہر ہیں جبکہ ان کی نسبت ڈیپلو' چیلہار' مٹھی' اسلام کوٹ اور نوکوٹ تازہ شہر ہیں جن کی بنیاد سیکڑوں برس پہلے پڑی۔ ایک روایت کے مطابق اٹھارویں صدی عیسوی میں پورے سندھ میں تقریباً ۲۳ر قلعے یا کوٹ تھے جو خالصتاً عسکری ضرورت کے تحت وجود میں آئے۔

تھر کے ان علاقوں پر آغاز میں مسلسل راجپوتوں کا قبضہ رہا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں پورے تھر پر سومرہ راجپوتوں کا راج رہا جن سے سوڈھوں نے لڑ کر دوبارہ تھر کا اقتدار چھین لیا۔ ٹھٹھہ میں بھی سومروں کی حاکمیت قائم نہ رہ سکی تو سومروں نے اپنی بکھری قوت مجتمع کر کے سوڈھوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد عمرکوٹ پر قبضہ کرلیا۔ سومرے زیادہ دیر تک عمرکوٹ کا اقتدار اپنے پاس نہ رکھ سکے۔ رانی ہمیر سوڈھی نے ہمیر سومرے سے عمرکوٹ کا قبضہ لیا اور ایک بار پھر سوڈھوں کی راجدھانی قائم کرلی۔ سندھ میں سومروں کے بعد جب سموں' ارغوانوں' ترخانوں اور مغلوں کی حکومت تھی تو اس وقت پورے تھر پر سوڈھوں کا راج تھا۔ بالآخر ۱۷۵۰ء میں میاں نور محمد کلہوڑو نے عمرکوٹ سمیت پورے تھر پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ ۱۷۸۲ء میں کلہوڑوں سے سندھ کا اقتدار ہتھیانے کے بعد میر فتح علی خان تالپور نے اپنے دیگر تین بھائیوں میر کرم علی خان' میر غلام علی خان اور میر مراد علی خان کے ساتھ مل کر حکومت مستحکم کرنے اور علاقوں کو تادیر اپنے ہاتھ رکھنے کے لئے مضبوط حکمت عملی تیار کی۔ اس زمانے میں عمرکوٹ پر جودھ پور کے مہاراجہ کا قبضہ تھا جبکہ تھر کے باقی علاقوں پر ابھی تک سوڈھے سرداروں کی حکومت تھی جو کلہوڑوں کے باج گزار تھے۔ میروں کے سندھ پر برسراقتدار آنے کے بعد سوڈھوں نے سرکشی کی اور تالپور میروں کی باج گزاری سے انکار کردیا۔ میر فتح علی خان نے چڑھائی کر کے تھر کا براہِ راست قبضہ حاصل کیا اور وہاں میروں کا

اقتدار مستحکم کرنے کے لئے مختلف مقامات قلعے تعمیر کرنے کا آغاز کر کے سوڈھوں کو باج گزاری پر رضامند کیا۔ اس کی زیادہ تر توجہ تھر تک محدود رہی' پارکر میں وہ قلعے اور کوٹ نہیں بنا سکا تو سوڈھے پارکر کے علاقے میں خودمختار رہے۔

میر فتح علی خان تالپور کی ۱۸۱۲ء میں وفات کے بعد ان کے جانشین بھائی میر کرم علی خان نے جودھ پور کے مہاراجہ سے نہ صرف ایک سال میں عمر کوٹ کا قبضہ لیا بلکہ تھر اور سندھ میں کئی مقامات پر نئے قلعے تعمیر کئے۔ سرکار عظمت مدار کے لقب سے سندھ کے اقتدار پر براجمان ہونے والا میر فتح علی خان تالپور سخن فہم' ادب شناس' عالموں اور شاعروں کا قدردان ہی نہیں تعمیرات کا بھی شوقین تھا۔ عمر کوٹ کے سوا تھر کے زیادہ تر قلعے مثلاً جھڑوک' فتح گڑھ' گڈو' سینگاریو' نوکوٹ' چیلہار اور ڈیپلو کے کوٹ میروں کے دور اقتدار سے منسوب ہیں۔

تھر اور پارکر کے یہ قدیم آثار' کچھ زمین بوس ہو چکے ہیں اور کچھ رفتہ رفتہ مٹ رہے ہیں۔ ان آثار اور تاریخی مقامات کو بچانے کے لئے جس شائستگی' سنجیدگی اور ذمہ داری کی ضرورت تھی' ہمارے ادارے اور آثار قدیمہ کے ماہرین اسے برتنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ آثار صفحہ ہستی سے مٹ جائیں' آیئے ہم انہیں اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

نوکوٹ: جھڈو سے ۱۵ رکلومیٹر دور واقع نوکوٹ (نیا کوٹ) کو تھر کا داخلی دروازہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ قلعہ ۱۸۱۴ء میں میر کرم علی خان تالپور نے تعمیر کرایا۔ آب وگل' کچی اور پکی اینٹوں سے بنا یہ قلعہ ۶۶۰ رفٹ لمبا اور ۶۰۰ رفٹ چوڑا تھا جس کے کچھ آثار آج بھی اصلی حالت میں باقی ہیں۔ اسی زمانے میں میروں نے سینگاریو اور مٹھی میں جو قدرے چھوٹے کوٹ تعمیر کرائے وہ اپنا وجود کھو چکے ہیں' اب ان کے معمولی سے آثار باقی ہیں۔

مٹھی: یہ تاریخی شہر صدیوں سے تھر پارکر کا صدر مقام رہا ہے۔ میروں نے اپنے دور اقتدار میں یہاں دو قلعے بلند و بالا بھٹوں پر تعمیر کرائے تھے جن کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ آپ گڑھی بھٹ پر کھڑے ہو کر مٹھی اور گردونواح کے دل موہ لینے والے مناظر کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مٹھی کی تاریخ سے متعلق میری گزارشات آنے والے صفحات میں یقیناً آپ کی نظروں سے گزریں گی۔ یہ بھی ایک خوب صورت داستان ہے۔

بھالوا: یہ تھری لوئی کی آن پر مر مٹنے والی دخترِ تھر ماروی کا آبائی گاؤں ہے۔ ماروی اس

دھرتی کا وہ عظیم کردار ہے جس نے حکمران عمر سومرو کی طرف سے شادی اور رانی کے اعزاز کی پیشکش ٹھکرادی اور تھر کی مشقت بھری زندگی بسر کرنے کو ترجیح دے کر اپنا نام تاریخ کے اوراق میں سنہری حروف سے لکھوالیا۔ اس علاقے کو شعری لغت میں ''ملہیر'' بھی کہا جاتا ہے۔ لفظ ملہیر ملہار سے نکلا ہے جس کا مطلب ہوتا ہے بارش کا موسم۔ ہزاروں سال بعد ماروی کا کنواں آج بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز ہے۔ لوگ ماروی کے کنوئیں میں سکے پھینک کر منتیں مانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ اس کنوئیں میں سکے ڈالنے سے ان کی دلی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔ بھالوا سے صرف پانچ چھ کلومیٹر کے فاصلے پر گوڑی کا تاریخی جین مندر ہے جس کا ذکر اگلے صفحات میں آئے گا۔

اسلام کوٹ: سندھی اور سرائیکی سماج میں کوٹ قلعے کو کہتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ کچی اینٹوں اور گارے مٹی سے بنائے جاتے تھے۔ طرز تعمیر کو نمایاں کرنے اور آرائشی حصوں کے لئے پختہ اینٹیں استعمال میں لائی جاتی تھیں۔ اسلام کوٹ کا قلعہ میروں ہی کے ابتدائی دور میں ۱۷۹۵ء میں تعمیر کیا گیا تھا جس کا مقصد تھر پر اپنا کنٹرول مضبوط رکھنا تھا۔ یہ قلعہ ۳۸۶ مربع فٹ چوڑا تھا' یہاں میروں کی مسلح سپاہ کسی بھی مقامی بغاوت کو کچلنے کے لئے ہمہ وقت چوکس رہتی تھیں۔ اب اس تاریخی قلعے کے آثار زمین بوس ہو چکے ہیں۔

وروئی: یہ ایک چھوٹا سا تاریخی گاؤں ہے جو اسلام کوٹ سے بارہ کلومیٹر دور مٹھی ننگر پارکر شاہ راہ پر ہی واقع ہے۔ یہاں کم وبیش ایک ہزار لوگ آباد ہیں۔ یہاں جین دھرم کے دور کی کئی نشانیاں بشمول مندر موجود ہیں جو ناقدری کی وجہ سے مٹتی چلی جا رہی ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یہاں کوئلے کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ وروئی تھر کے ان ۱۳ مقامات میں سے ایک ہے جہاں سے بڑی مقدار میں ''کالا سونا'' دریافت ہوا ہے۔

ویراواہ: ننگر پارکر سے ۲۴ کلومیٹر فاصلے پر واقع ویراواہ بھی ننگر پارکر کی طرح جین دھرم کی باقیات میں سے ہے۔ یہ علاقہ قدیم شہر اور تاریخی بندرگاہ پاری نگر سے متصل ہے۔ یہاں جین مندر کے آثار موجود ہیں جو ہماری زندہ تہذیب کے چند برسوں کے مہمان ہیں۔ کل ان کا نام لیوا شاید کوئی ہو۔ پاری نگر کے بارے میں روایات ہیں کہ زمانہ قدیم میں یہ ایک مہذب اور جیتا جاگتا ساحلی شہر تھا جہاں زندگی اپنے جوبن پر تھی لیکن بارہویں صدی میں یہ شہر صفحہ ہستی سے مٹ گیا اور اب اینٹوں کے ڈھیر کی شکل میں موجود ہے۔ اس شہر کے آثار پانچویں اور چھٹی صدی میں دریافت

ہوئے۔اب یہاں بس ایک جین مندر استقامت سے کھڑا پاری نگر کی داستانِ الم سنا رہا ہے۔

گوڑی: یہ علاقہ ننگر پارکر سے ۴۲رکلومیٹر دور ویراواہ سے ۲۳رکلومیٹر شمال مغرب کی جانب واقع ہے جہاں ۳۸رمیٹر لمبا اور ۱۵ میٹر چوڑا سنگِ مرمر سے بنا تاریخی جین مندر اپنی دو ہزار سالہ قدامت کی کہانیاں سناتا دکھائی دیتا ہے۔اس مندر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ ۱۳۷۶ء میں اوسواڑ قبیلے کے ساہوکار منگھی نے تعمیر کرایا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب سوڈھوں نے انگریزوں کے خلاف ۱۸۰۹ء میں بغاوت کی تھی تو انگریز سپاہ نے یہاں پناہ لئے ہوئے سوڈھوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اس مندر کا ایک حصہ بارود سے اڑا دیا تھا۔۱۸۲۲ء تک یہاں میلے لگتے رہے لیکن اس کے بعد یہ مندر اب محض زیارت گاہ بن کر رہ گیا ہے۔ یہ تھر کے دیگر جین مندروں سے زیادہ وسیع اور کشادہ ہے جبکہ اس کا فنِ تعمیر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ہے۔ یہ تاریخی جین مندر بھی عدم توجہی کے باعث دن بہ دن ابتری کا شکار ہے۔

پاری نگر: ننگر پارکر سے تقریباً ۲۲ راور ویراواہ سے صرف چار کلومیٹر دور ایک قدیم اور تاریخی شہر پاری نگر کے موہوم سے آثار آج بھی موجود ہیں۔ روایات ہیں کہ یہ شہر جین دھرم کے عروج میں اس کے ماننے والوں کی اکثریت سے آباد تھا۔ یہاں کئی خوبصورت جین مندر ہوا کرتے تھے جو موسمی تغیرات کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔کیپٹن ریکس کی تحقیقات کے مطابق زمانہ قدیم میں اس شہر میں جین دھرم کے ماننے والوں کے تقریباً ۵,۲۰۰ گھر تھے۔اس کے علاوہ یہاں آباد لوہاروں کے ۹۰۰' محنت کشوں کے ۲۰۰' لوہانوں کے ۱,۳۰۰ راور راجپوتوں کے ۷۰۰ گھر تھے۔ اس زمانے میں کچھ کا دلدلی علاقہ سمندر کے پیٹ میں تھا اس لئے پاری نگر ایک اہم بندرگاہ تھا جہاں آئے دن تجارتی جہاز لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔

بوڈھیسر :ننگر پارکر سے تین کلومیٹر شمال مغرب میں پارکر کے مشہور پہاڑی سلسلے کارونجھر کے دامن میں واقع بوڈھیسر اپنے زمانے میں تھر پارکر کے کامیاب اور مہذب شہروں میں سے ایک تھا۔ یہاں ملنے والے قدیم آثار اس علاقے کی عظمتِ رفتہ کی یادیں تازہ کرتے ہیں۔اسے عام طور پر بوڈھیسر نگری بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں واقع وسیع تالاب مقامی آبادیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے صدیوں سے شہرت رکھتا ہے۔تھر میں عام طور پر آبادیاں پانی کے دستیاب وسائل کے پیشِ نظر بسائی جاتی ہیں۔ بوڈھیسر چونکہ کارونجھر کے دامن میں واقع ہے اور بارشوں

کے دنوں میں یہاں کافی پانی ذخیرہ ہو جاتا ہے جو سارا سال بوڑھیسر اور ارد گرد کی آبادیوں اور مال مویشیوں کے کام آتا رہتا ہے۔

روایات میں ہے کہ جب ۱۰۲۶ء میں سلطان محمود غزنوی سومنات فتح کر کے پلٹا تو اس نے تھر کا راستہ اختیار کیا اور یہاں اس کی افواج بھٹک گئیں۔ غزنوی سپاہ پانی کی تلاش میں بوڑھیسر آنکلیں اور یہاں کچھ عرصے تک قیام کیا۔ سلطان محمود غزنوی نے یہاں ایک یادگار بھی تعمیر کی جسے ۱۵۰۵ء میں دہلی تخت پر براجمان تغلق شہنشاہ سلطان محمود بیگڑا نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ روایات ہیں کہ اس کے زمانے میں مقامی کھوسوں اور سوڈھوں نے تھر پارکر کے پارکر حصے میں لوٹ مار کی انتہا کی ہوئی تھی۔ وہ دہلی تخت کے انتباہات کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ سلطان محمود بیگڑا نے دوبار اس علاقے پر چڑھائی کی۔ وہ پہلی بار ۱۵۰۴ء میں پارکر آیا اور ان لٹیروں کے خلاف کارروائی کی لیکن کھوسے اور سوڈھے باز نہیں آئے اور ایک ایسے قافلے کو لوٹ لیا جس میں سلطان محمود بیگڑا کی والدہ بھی شریکِ سفر تھی۔ بالآخر ۱۵۰۵ء میں سلطان دوبارہ یہاں آیا اور بوڑھیسر کے مقام پر سرکش کھوسوں اور سوڈھوں کو ایک خونریز جنگ میں خوب سبق سکھایا اور واپس پلٹ گیا۔ ۱۵۰۵ء میں سلطان محمود بیگڑا نے بوڑھیسر قیام کے دوران سلطان محمود غزنوی کی یادگار کو ایک چھوٹی سی سنگِ مرمر سے تعمیر کی گئی خوبصورت مسجد سے بدل دیا جس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ یہیں قرب و جوار میں تین اور جین مندروں کے آثار بھی باقی ہیں جن کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ ۱۳۷۵ء اور ۱۴۴۹ء کے درمیان تعمیر کئے گئے تھے۔ ان قدیم جین مندروں کے آثار بھی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے تیزی سے تباہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

ننگر پارکر: نگر یا ننگر پارکر یہ قدیم شہر تھر پارکر کے پارکر حصے اور اپنے نام سے منسوب تعلقہ کا بھی صدر مقام ہے۔ چودہویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں یہ شہر ہندو جین مذہب کا اہم مرکز تھا۔ یہاں سردھارا کے نام سے مشہور مقام پر مہادیو کا مندر ہونے کے باعث ہندسندھ سے اس مذہب کے ہزاروں پیروکار اور زائرین سارا سال حاضری بھرتے تھے۔ مندر کے شمال میں ایک وسیع تالاب واقع تھا جہاں جین مذہب کے پیروکار اپنے مردوں کی آخری رسومات ادا کرتے تھے۔ تالاب کے قریب ہی ایک قلعہ تھا جس کے بارے میں روایات ہیں کہ گوبند رائے کے بیٹے چندن نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ قلعہ ۱۸۵۷ء کے غدر تک موجود تھا لیکن برطانوی افواج نے اسے

باغیوں کا مرکز ہونے کی وجہ سے ۱۸۵۹ء میں مسمار کر دیا۔ سردھارا سے ایک کلومیٹر دور کئی سنگی جین نشانیاں موجود تھیں جو گردشِ دوراں کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں۔ نگر پارکر کے شمال میں چھاچھرو' مغرب میں مٹھی' مشرق میں جودھ پور بھارت اور جنوب میں رن آف کچھ واقع ہیں' یوں تھر پارکر کا یہ سرحدی شہر چاروں جانب سے تاریخی علاقوں سے گھرا ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ ہزاروں سال پہلے سمندر کا حصہ تھا۔ ننگر پارکر کا کم و بیش ۶۲ رکلومیٹر رقبہ پارکر یعنی پہاڑی اور چٹانوں پر مشتمل ہے' باقی سارا علاقہ ریتلا ہے۔ ننگر پارکر کا موسم سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں سخت گرم ہوتا ہے۔ اس شہر میں اب بھی ہندوؤں کی اکثریت آباد ہے جبکہ مسلمان قبائل میں کھوسہ اور خاصخیلی قبائل کے لوگ بڑی تعداد میں آباد ہیں جو انگریزوں کی سندھ پر چڑھائی کے زمانے میں کرائے کے فوجیوں کے طور پر اس خطے میں آئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔

کاسبو: ننگر پارکر سے ۱۴ رکلومیٹر جنوب میں واقع اس قصبے کی وجہ شہرت میٹھے پانی کا کنواں اور ایک بڑا جین مندر ہے۔ بھارت کے صوبے گجرات کی سرحد پر موجود یہ قصبہ تھر کے دوسرے علاقوں کی نسبت بہت زیادہ سرسبز اور شاداب ہے۔ یہاں سارا سال زیرِ زمین صرف پچیس تیس فٹ کی گہرائی میں میٹھا پانی دستیاب رہتا ہے۔ مقامی ہندو کاشتکار بڑے پیمانے پر سبزیاں اور فصلیں کاشت کرتے ہیں۔ یہ ایک زمانے میں سوڈھے ٹھاکروں کے زیرِ تسلط تھا۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں اس علاقے پر بھارتی افواج نے قبضہ کر لیا تھا۔ کاسبو میں موجود مندر سالخوردہ ہونے کے باوجود مقامی ہندوؤں کے لئے روحانی تسکین کا باعث ہے۔

تھر وسیع بھی ہے اور قدیم بھی' یہاں ہزاروں تاریخی مقامات ہیں جن کے بڑے پیمانے پر کھوج اور ان پر تحقیقات کر کے انہیں منظرِ عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ کئی ایسے تاریخی مقامات ہیں جو وقتاً فوقتاً آنے والے طوفانوں اور زلزلوں کی تاب نہ لا کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ میں نے ان چند مقامات اور آثار کا سرسری تذکرہ کیا ہے جو پیاس اور افلاس کے اس سفر میں میری راہوں میں آئے ہیں۔ ان سے متعلق جو معلومات میں نے یہاں رقم کی ہیں وہ مختلف حوالوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ تھر پر مستند تحقیقات نایاب ہیں' زیادہ تر مواد سینہ بہ سینہ عہدِ حاضر تک پہنچنے والی معلومات' روایات اور قیاس آرائیوں پر ہے۔ مجھے بھی ان ہی ماخذات کا سہارا لینا پڑا ہے۔



تھر پارکر اور معدنی وسائل

قدرت نے صحرائے تھر کو جہاں محیر العقول زندگی سے نوازا ہے وہاں اسے معدنی دولت سے بھی مالا مال کیا ہے۔ تھر پارکر کا وسیع و عریض علاقہ اپنے وجود میں بے پناہ قیمتی وسائل اور خزانے سمیٹے ہوئے ہے جو اس سرزمین اور اس کے باشندوں کے لئے عطیہ خداوندی ہیں مگر ملکی نظام کی ناتوانی نے معصوم تھریوں کو اس خزانے سے مستفید ہونے کے مواقع بہم نہیں پہنچائے۔ تھر میں معدنی وسائل کو بروئے کار لا کر اہلیانِ تھر کی تقدیر بدلی جا سکتی ہے اور سولی پر لٹکی ملکی معیشت کو بھی زندگی دی جا سکتی ہے۔ لیکن پچھلے باون برسوں میں کسی حکومت نے اس جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ خدا نہ کرے کہ ہمیں یہ قدرتی خزانہ کسی روز پڑوسیوں کے حوالے کرنا پڑے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگوں میں بھارتی افواج صحرائے تھر میں بہت اندر تک گھس آئی تھیں اور ہمارے پاس کیا ضمانت ہے کہ مستقبل میں ہم ان کے بڑھتے ہوئے قدم روک سکیں۔ تھر میں چھور کے قریب نیو چھور کے مقام پر فوجی چھاؤنی قائم کی گئی ہے جس کا مقصد مستقبل میں بھارتی افواج کے عزائم اور سرگرمیوں پر نظر رکھنا ہے۔ اس کے باوجود تھر کے قدرتی وسائل سے فوائد نہ سمیٹنا ہماری کوتاہیوں میں شمار ہوگا۔ قدرت نے اس ملک کو بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ بہت بڑی افرادی قوت، ہر طرح کی اراضی، چاروں موسم، ساری فصلیں اور معدنی ذخائر ہمارا مقدر ٹھہری ہیں مگر ہم اپنے اندر وہ جذبہ، وابستگی اور دیانت پیدا نہیں کر سکے جو قوموں کو کام پر اکسا کر بلندیاں چھونے کا حوصلہ دیتی ہے۔ ہم اپنی خود غرضی اور بددیانتی کی وجہ سے

ناکامیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گر گئے ہیں۔ میں ان سطروں میں آپ کو اس خزانے کی ایک جھلک دکھاتا ہوں جو ہماری معمولی کوششوں سے نہ صرف تھر اور اہلیانِ تھر بلکہ پاکستان کو خوشحالی کی راہ پر گامزن کرسکتا ہے مگر ہم اس مقصد میں بوجوہ کامیابی حاصل نہیں کرسکے۔

تھر پارکر کے سرحدی علاقے ننگر پارکر کی گود میں کارونجھر کا پہاڑی سلسلہ تقریباً ۲۷ رمربع کلومیٹر رقبے تک پھیلا ہوا ہے اور اس کی اونچائی تین سو میٹر سے بھی زیادہ ہے۔ یہ پہاڑیاں دنیا کے قیمتی اور مضبوط ترین پتھر گرینائیٹ کی ہیں جہاں گرینائیٹ کی سات اقسام دستیاب ہیں۔ اس پتھر کی مضبوطی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پتھر یا کسی چیز کی سختی اور مضبوطی ماپنے کا زیادہ سے زیادہ عالمی پیمانہ 10MOHCS ہے جبکہ کارونجھر میں پائے جانے والے پتھر گرینائیٹ کی مضبوطی 8MOHCS ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ پتھر بے حد مضبوط اور صدیوں تک نہ گھسنے یا نہ ٹوٹنے والا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ دنیا کا قیمتی ترین گرینائیٹ سویڈن میں پایا جاتا ہے' اس کے بعد تھر پارکر میں کارونجھر کی پہاڑیوں میں پائے جانے والے گرینائیٹ کو درجہ دیا جاتا ہے لیکن ہم قدرت کی طرف سے عطا ہونے والے اس خزانے کی قدر کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ کارونجھر سے زرمبادلہ کمانے کا آج تک کسی نے کوئی منصوبہ نہیں دیا۔

تھر پارکر میں اس قیمتی خزانے کو ملکی اور مقامی معیشت کو استحکام دینے کے لئے کسی سطح کی منصوبہ بندی نہیں کی گئی جس کی وجہ سے یہ قومی خزانہ بڑی بے دردی سے ضائع کیا جارہا ہے۔ کارونجھر کی یہ پہاڑیاں ۳۲ رافراد کو لیز پر دی گئی ہیں' جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سب کے سب منظورِ نظر ہیں۔ اس کے باوجود صرف تین چار پارٹیاں ہیں جو عملاً یہاں کام کر رہی ہیں اور وہ دیسی طریقے سے گرینائیٹ کی پیداوار حاصل کر رہی ہیں جس سے بہت زیادہ گرینائیٹ ضائع ہو رہا ہے۔ یہ لوگ پہاڑیوں میں سوراخ کر کے اس میں بارود بھر دیتے ہیں، اور پھر اس بارود کو فلیتہ دکھا دیا جاتا ہے جس سے پہاڑ پھٹتا ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حاصل کر کے ٹرکوں کے ذریعے کارخانوں میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس پتھر کو ٹائلوں کی شکل دی جاتی ہے۔ گرینائیٹ کی پیداوار حاصل کرنے کا یہ طریقہ انتہائی فرسودہ ہے جو اس قیمتی اثاثے کے ضیاع کا سبب بن رہا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس گرینائیٹ کو کارآمد بنانے کے لئے جدید ترین مشینری اور بہت بڑی سرمایہ کاری کی ضرورت کی ہے۔ جب تک یہاں تک شاہراہیں قائم نہیں کی جائیں گی اور ریلوے ٹریک

نہیں بچھایا جائے گا اس پہاڑی سلسلے سے کامل فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا۔

جدید ترین تحقیق کے مطابق کوئلے کی قومی پیداوار کا کم وبیش ۹۰ ر فیصد سندھ میں پایا جاتا ہے اور صحرائے تھر کا علاقہ اس لحاظ سے سب سے زیادہ مالا مال ہے کہ اس میں سے ۸۰ ر فیصد ذخائر تھر میں ہیں۔ مگر بدقسمتی سے یا تو اسے مکمل طور پر دریافت نہیں کیا جا سکا یا پھر دریافت کے باوجود کام میں نہیں لایا جا سکا۔ تھر میں کوئلے کے ۳۱۵ نمونوں کا تجزیہ کرنے کے بعد منکشف ہوا کہ یہاں کوئلے میں نمی کا تناسب تقریباً ۴۸ء۵۷ فیصد ہے جبکہ راکھ ہو جانے والے عنصر کا تناسب صرف ۸۳ء۸ فیصد ہے۔ اس میں گندھک کا تناسب صرف ۵۷ء۱ فیصد اور حرارت پیدا کرنے کی استعداد ۵۷۷۴ بی ٹی یو ہے جو بجلی پیدا کرنے کے لئے انتہائی مناسب ہے۔ یہ سارے اعداد و شمار عالمی پیمانے پر اس کوئلے کے معیاری ہونے کا ثبوت ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں جیولوجیکل سروے آف پاکستان نے یو ایس جیولوجیکل سروے کے تعاون سے تھر پارکر میں ملک کی سب سے بڑی کول فیلڈ میں تحقیق، دریافت اور ذخائر کا اندازہ لگانے کا کام شروع کیا۔ اب تک ۱۴۰ ر سے زائد ہول کئے جا چکے ہیں جن کی گہرائی ۴۵۰ ر سے ۵۵۰ ر فٹ تک ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق یہ ذخائر لاکھڑا اور سونڈا سمیت ملک بھر کے کوئلہ کے ذخائر کے مجموعے سے کہیں زیادہ ہیں اور اس کا معیار بھی ان سے کئی درجے بلند ہے۔

تھر سے دریافت ہونے والے کوئلہ کا ذخیرہ ۸۵۰ ٹریلین کیوبک فٹ ہے جو کہ پیٹرول کے ۴۰۰ ر بلین بیرل کے برابر ہے اور پیٹرول کی مذکورہ پیداوار سعودی عرب اور ایران کے تیل کے کل ذخائر کے برابر بنتی ہے۔ تھر کے کوئلہ کے ذخائر کا صرف دو فیصد حصہ استعمال میں لاکر ۲۰ ر ہزار میگاواٹ بجلی بآسانی پیدا کی جاسکتی ہے جو کہ ملک کی چالیس ۴۰ سال کی بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہوگی۔ مذکورہ بجلی کی اس پیداوار پر ۴ ر بلین ڈالر خرچ ہوں گے۔ پہلی مرتبہ کوئلہ کے ان ذخائر کو اہمیت پاکستان پیپلز پارٹی کے گزشتہ دور میں دی گئی تھی لیکن حکومت کے جاتے ہی سارے منصوبے ہوا ہو گئے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو شہید نے تھر میں دریافت ہونے والے کوئلہ کو ''بلیک گولڈ'' قرار دیا تھا۔ ان کے ہی دور میں سندھ کول اتھارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا اور ۱۹۹۶ء میں ضلع ٹھٹھہ کے ساحلی علاقے کیٹی بندر کے مقام پر نئی بندرگاہ کی تعمیر کے علاوہ تھر کے کوئلے سے بجلی پیدا کرنے کے لئے

تین پاور پلانٹس لگانے کا منصوبہ بنایا گیا۔اس سلسلے میں ایک عالمی کمپنی سیپا سے معاہدہ کیا گیا تھا۔ معاہدے کے تحت پاور اور بندرگاہ کے منصوبوں پر تقریباً ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری ہونی تھی۔ ۱۹۹۶ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمہ کے بعد آنے والی نئی حکومت نے کیٹی بندر منصوبے کو مسترد کردیا جس سے تھر کے کوئلہ کے ذریعے ملکی ترقی اور توانائی بحران پر قابو پانے کے لئے شروع ہونے والا یہ عمل رک گیا۔

کوئلے کے یہ ذخائر کیسے دریافت ہوئے' یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ پسماندہ صحرائی (بارانی) علاقوں کی ترقی کے لئے قائم کئے جانے والے ادارے سازدا (سندھ ایرڈ زون ڈویلپمنٹ اتھارٹی) کے اہلکار ایک برطانوی کمپنی برٹش اوورسیز ڈویلپمنٹ ایڈمنسٹریشن کے تعاون سے پیاسے تھریوں کے لئے زیرِ زمین پانی کے وسائل تلاش کررہے تھے کہ صحرا کی بنجر زمین نے اپنے وجود میں پوشیدہ اس خزانے کی نوید دی جسے اس کے معیار کی وجہ سے ''بلیک گولڈ'' کا خطاب بخشا گیا۔ابتدا میں مٹھی کے گاؤں کھاریو غلام شاہ سے سیال مادہ ملا۔تحقیقاتی اداروں نے مغز کھپایا تو اس خطے میں کوئلے کے وسیع ذخائر کی موجودگی کی تصدیق ہوگئی اور بعد میں اسلام کوٹ کے جنوب مشرق میں ۱۷۵ ربلین ٹن سے زائد اعلیٰ معیار کے کوئلے کی دریافت کے بعد پاکستان کوئلہ رکھنے والے نمایاں ملکوں کی فہرست میں شامل ہوگیا۔

پاکستان میں ۱۹۸۰ء میں کوئلے کے کل ذخائر ۸۰ رملین ٹن تھے جو ۹۰ کی دہائی میں اس دریافت کے بعد لگ بھگ ۲۰۰ ربلین ٹن ہوگئے ہیں اور خوشی کی خبر یہ ہے کہ اس وقت پاکستان کے پاس دنیا کا گیارہواں بڑا اور بعض اطلاعات کے مطابق ساتواں بڑا ذخیرہ ہے۔کوئلے کی دریافت کی موجودہ پوزیشن کے مطابق رقبے کے اعتبار سے اس کول فیلڈ کو چار بڑے بلاکوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔اندازہ ہے کہ ہر بلاک میں پانچ سو ملین ٹن کوئلہ موجود ہے اور ایک بلاک سے ۳۰ سے ۵۰ سال تک ایک ہزار میگاواٹ کے چھ تھرمل پاور جنریشن یونٹ چلائے جاسکتے ہیں۔اگر تھر کے کوئلے کے تمام ذخائر بروئے کار لائے جائیں تو ان سے سالانہ ۲۵ رہزار میگاواٹ بجلی اگلی نصف صدی تک حاصل کی جاسکتی ہے اور اس سے طویل مدت کے لئے پورے ملک کی بجلی کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔

صحرائے تھر میں اب تک سروے کئے جانے والے چار بلاکس اس طرح ہیں:

بلاک ا: سنھارو کیا' ورواہی۔ اسلام کوٹ سے ۱۵ رکلومیٹر دور یہ بلاک ۱۲۲ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس بلاک میں ۱۳۷ ر میٹر کی گہرائی میں موجود کوئلے کی مقدار ۶۲۰ ر ملین ٹن اور کوئلے کی تہہ ۲۳ ر میٹر دبیز ہے۔

بلاک ۲: سینگاریو۔ اسلام کوٹ کے شمال میں واقع یہ بلاک ۵۵ ر مربع کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں کوئلے کی مقدار ۶۴۰ ر ملین ٹن اور تہہ کی دبیز ۳۰ ر میٹر ہے۔

بلاک ۳: صالح جوتڑ۔ یہ بلاک کم وبیش ۱۰۰ ر مربع کلومیٹر پر محیط ہے جہاں ۴۱۳ ر ملین ٹن کوئلے کے ذخائر موجود ہیں اور تہہ ۲۴ ر میٹر تک دبیز ہے۔

بلاک ۴: سونل بھ۔ ۸۲ ر مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلے اس بلاک میں تقریباً ۶۵۰ ر ملین ٹن کوئلے کے ذخائر موجود ہے اور تہہ کی دبیز ۳۰ ر میٹر کے قریب ہے۔

حیران کن صورتِ حال یہ ہے کہ تھر پارکر کے ساتھ ملنے والی بھارتی سرحد کے اس پار تھر میں موجود کوئلے کے ذخائر کا صرف تقریباً پچیس فیصد ذخیرہ موجود ہے جسے بھارتی حکومت نے تیس سال قبل دریافت کر کے غالباً ایک ہزار میگا واٹ کے تین یا چار تھرمل پاور اسٹیشن قائم کئے تھے جو اس وقت بھی کام کر رہے ہیں اور ان سے پورے راجستھان کی برقی ضروریات پوری ہو رہی ہیں۔ بھارت نے ان بجلی گھروں سے سرحدی پٹی کی نگرانی کے لئے ایک طویل سرحدی لکیر کو بھی چکا چوند کر دیا ہے۔ تھر پارکر کے سرحدی علاقوں کے پاکستانی بچے اسی روشنی میں بیٹھ کر اپنی نصابی کتب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تھر کے ان غریب طالب علموں کے لئے پڑوسی ملک سے فراہم کی گئی روشنی کی یہ سہولت نعمت سے کم نہیں۔

تھر میں دریافت ہونے والا یہ کوئلہ بہترین کوالٹی کا ہے اور بعض جگہوں پر اس کی موٹائی اور کثافت ۲۰ ر تا ۳۰ ر میٹر تک ہے۔ ماہرین کا دعویٰ ہے کہ یہ ذخائر پاکستان کی صدیوں کی ضروریات کیلئے کافی ہیں۔ اب تک تین چار افراد کو کوئلہ نکالنے کی لیز دی گئی ہے مگر بعض قانونی سقم ہونے کے سبب کسی حوصلہ افزا نتیجے کی امید نہیں۔ اس ضمن میں واپڈا کا کردار نا قابلِ فہم اور خاصا پر اسرار ہے۔ دنیا بھر میں چالیس فیصد بجلی کوئلے سے پیدا کی جاتی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کوئلے کے وسیع ذخائر موجود ہونے کے باوجود اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا اور ملک کی صرف ۴۰ ر فیصد آبادی کو بجلی کی سہولت حاصل ہے۔ بجلی کی طلب اور کھپت روز افزوں ہے جبکہ بجلی حاصل کرنے

کے ذرائع بڑھانے پر قطعی توجہ نہیں دی جا رہی جس کی وجہ سے لوڈ شیڈنگ کا مسئلہ روز بروز شدت پکڑتا جا رہا ہے مگر حکومت اور متعلقہ ادارے خوابِ غفلت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اس سے بڑی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ اتنی قیمتی چیز کو نکالنے کیلئے متعلقہ محکمہ ابھی تک ''پراجیکٹ فزیبلٹی'' بھی نہیں بنا سکا ہے جبکہ بھارت راجستھان سے دریافت ہونے والے کوئلے سے تین عشروں سے بجلی بنا رہا ہے۔ تھر میں کوئلہ نو ہزار سے زائد کلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کے مجموعی ذخائر ۲ سو بلین ٹن سے بھی زائد ہیں لیکن حکمرانوں اور اداروں کی مجرمانہ غفلت کی وجہ سے یہ خزانہ ملک اور قوم کے لئے بے سود ثابت ہو رہا ہے۔

سندھ میں کوئلے کے ذخائر کی دریافت' جانچ' معیار کے تعین اور ترقی کے لئے حکومت نے ''سندھ کول اتھارٹی'' قائم کی ہے۔ یہ ادارہ کلفٹن کے مہنگے علاقے کے ایک قیمتی بنگلے میں قائم ہے اس پر سالانہ ۴۰ ملین روپے سے زائد اخراجات ہوتے ہیں مگر عملاً اس ادارے کی کارکردگی کیا ہے' وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ ادارہ ملکی معیشت پر بوجھ سے کم نہیں۔ کوئلے کے علاوہ دیگر معدنیات کی تلاش اور ترقی کا کام ''ڈائریکٹریٹ آف منرل ڈیویلپمنٹ'' کرتا ہے' اس ادارے کا بجٹ ۷ ملین روپے سالانہ ہے لیکن پورے سندھ میں دیگر معدنیات کی صورتحال اس ادارے کے کردار اور معیار کا آئینہ ہے۔

سردار فاروق احمد خان لغاری نے اپنے دورِ صدارت میں بھی ۱۹ جنوری ۱۹۹۴ء کو تھاریو ہالیپوتہ کا دورہ کر کے قوم کو نوید سنائی تھی کہ ہاتھ آنے والا ''کالا سونا'' تھر اور پاکستان کی تقدیر بدل دے گا مگر افتتاحی تختی کے بعد اس منصوبے پر کام کا خواب ادھورا رہ گیا۔ صدرِ مملکت کی وہ تقریر مجھے اب تک یاد ہے جس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ پلانٹ سوا لاکھ افراد کو براہِ راست روزگار فراہم کرے گا اور بالواسطہ طور پر کم و بیش پانچ لاکھ سے زائد افراد مستفید ہو سکیں گے۔ اس روز تھری جھوم اٹھے تھے' صدر صاحب کے اعلان پر پورے تھر میں شادیانے بجائے گئے۔ یہی وہ موقع ہے جب انہوں نے اپنے ذاتی دوست اور سیاسی رفیق جاوید جبار کی تھر میں سرگرمِ عمل این جی او ''بانہہ بیلی'' کے لئے دو کروڑ کا عطیہ عطا فرمایا تھا۔

یہ دو کروڑ روپے تھر اور تھریوں کی کس مشکل میں کام آئے' اس وقت نہ تو یہ میرا موضوع ہے اور نہ میں اس وقت اس بحث میں پڑنا چاہتا ہوں' اس وقت تو میرا موضوع تھر کا کالا سونا ہے

جس کی دریافت پر ملک کے صدر نے اہل تھر اور پوری قوم کو خوش خبری سنائی تھی کہ اب تھر کے برے دن ٹلنے میں صرف ایک جست باقی ہے' اب تھر کی ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ اس وعدے کو بیتے چھ سال ہو گئے ہیں' کالا سونا آج بھی محفوظ ہے مگر نہ تو تھر کی قسمت بدلی ہے اور نہ ملک کی۔ ایک وڈیرے صدر کا تھر اور ملک کے مظلوم عوام کو سنایا جانے والا مژدہ سیاسی راگ پاٹ ثابت ہوا۔ حکمرانوں کی بدنیتی نے قوم کو اندھی کھائیوں میں گرا دیا ہے۔

ویراواہ کے قرب وجوار میں ہزاروں ایکڑ رقبے پر چینی مٹی کا ذخیرہ زمین میں دفن ہے جسے چائنا کلے کہا جاتا ہے۔ یہ خزانہ پہلی بار امریکہ سے تعلیم مکمل کر کے وطن لوٹنے والے مٹھی کے ایک ہندو جیالوجسٹ نے ۱۹۶۵ء میں دریافت کیا تھا۔ یہ زمین سے صرف چھ سات فٹ نیچے موجود ہے اور اس کی تہہ کی موٹائی ۲۰ر تا ۲۵ر فٹ ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تھر میں ۱۰ ملین ٹن سے زائد کے چائنا کلے کے ذخائر موجود ہیں۔ یہ چینی مٹی سرامکس' ادویات' سیمنٹ' ڈسٹمپر' رنگ' صابن اور برتن وغیرہ بنانے کے کام آتی ہے۔ اس طرح کا چائنا کلے سوات میں بھی پایا جاتا ہے اور سستے نرخوں دستیاب ہے۔ تھر میں بھی منصوبہ بندی کر کے اس خزانے کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے لیکن اس قیمتی معدنی وسیلے کو بروئے کار لانے کے لئے درپیش مشکلات کا فوری خاتمہ ضروری ہے۔ حکومت نے ویراواہ میں اب تک ۵ر ہزار ایکڑ اراضی لیز پر دی ہے جس پر دو درجن کے قریب پارٹیوں نے کھدائی کا آغاز کر دیا ہے لیکن اس کام کو بھی جدید خطوط پر انجام دینے کی ضرورت ہے تاکہ ان ذخائر سے سرامکس اور رنگ سازی سے متعلق صنعت کو صحیح طور پر پروان چڑھایا جا سکے۔

صحرائے تھر میں یوں تو بارش ہے ہی نوید زندگی' لیکن یہ بسا اوقات معدنی وسیلے بھی فراہم کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ جن دنوں تھر میں بارشیں ہوتی ہیں تو رن کچھ کے نشیبی علاقے میں پانی جمع ہونے سے نمک کی تقریباً ۱۰۰ جھیلیں وجود میں آ جاتی ہیں۔ ان نمکین جھیلوں سے نمک برآمد کرنے کے لئے ۲۷ر افراد کو لیزیں دی گئی ہیں مگر ہنوز اس کام کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے منصوبہ بندی کی بہت گنجائش موجود ہے۔

پیاسے تھری پانی کے لئے یا تو آسمان کی جانب دیکھتے ہیں یا پھر پاتال کی طرف' حال ہی میں تھر میں پانی کے زیرِ زمین وسیع ذخائر کا انکشاف ہوا ہے جن کے بارے بتایا گیا ہے کہ یہ ذخائر

تھر پارکر کی سوسالہ ضروریات کے لئے کافی ہیں۔ زیرِ زمین یہ آبی خزانہ کب بروئے کار لایا جائے گا اور کب تھر کی پیاس بجھائے گا؟ اس سوال کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔

صحرائے تھر سے متصل کم وبیش پندرہ ہزار مربع کلومیٹر رقبے پر پھیلا رن کچھ کا علاقہ بھی قدرتی گیس اور دیگر معدنیات سے مالا مال ہے۔ یہ صحرائے تھر اور بھارت کی ریاست گجرات کے درمیان متنازعہ دلدلی علاقہ ہے۔ ''رن'' ہندی اور سندھی زبان میں دلدل کو کہتے ہیں اور کچھ وہ تاریخی ضلع ہے جہاں یہ علاقہ واقع ہے۔ اس کے ایک جانب خلیج کچھ اور دوسری جانب دریائے سندھ کا ڈیلٹائی علاقہ ہے۔ بھارتی ریاست راجستھان کا دریائے لونی رن کے شمال مشرقی علاقے میں گرتا ہے۔ مون سون کے دنوں میں طوفانی بارشوں کا پانی رن کچھ کے بیابانوں اور دلدلی علاقوں میں جمع ہو جاتا ہے اور ان دنوں میں سرد علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے آبی پرندے لاکھوں کی تعداد میں یہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ رن کچھ پاکستان اور بھارت کے مابین سرکریک جیسے سرحدی تنازعات کا بھی سبب ہے۔ اطلاعات ہیں کہ بھارت اپنی سمندری حدود میں اضافہ کے لئے اقوامِ متحدہ سے رجوع کرنے کی تیاری کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنا مطالبہ منوانے میں کامیاب ہو گیا تو رن کچھ میں ۲۵۰ مربع کلومیٹر علاقہ اسے مل جائے گا اور معدنیات کا ایک بڑا حصہ اس کے ہاتھ آ جائے گا۔ پاکستان یا بھارت؟ یہ تنازعہ حل ہو گا تو پتہ چلے گا کہ یہاں پائی جانے والی معدنیات اور قدرتی گیس کا مالک کون بنتا ہے۔

میں نے ان مختصر سطور میں صحرائے تھر میں قدرت کی طرف سے عطیہ کئے جانے والے بے پناہ معدنی' قیمتی خزانے کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ یہاں کرنے کو بہت کام پڑا ہے' شرط ہے کوئی کرنے والا ہو۔ ادارے موجود ہیں' لوگ موجود ہیں' اس کے باوجود نہ جانے کیا مصلحتیں ہیں اور کیا غفلتیں ہیں کہ مہینوں میں کرنے والے یہ کام برسوں میں نہیں ہو سکے۔ وعدے اور دعوے ہیں کہ ہر دور میں اور ہر حکومت میں نئی شکلوں اور نئے روپ میں کئے جاتے ہیں۔ کوئی وعدہ پورا نہیں ہوتا' کوئی دعویٰ حقیقت نہیں بنتا۔ ہم اپنے آپ سے دھوکا کر رہے ہیں۔ یہ روش ہمیں کہاں لے جائے گی؟ اس کا سوچ کر مجھے ہول اٹھ رہا ہے۔



پیاس اور افلاس کا صحرا

زندگی برقرار رکھنے کے لئے پانی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ زمین کے کل رقبے کا تین چوتھائی حصہ پانی ہے جو سمندروں' دریاؤں' ندی نالوں تالابوں' جھیلوں' گلیشیئر اور ہوا میں آبی بخارات کی صورت میں موجود ہے۔ پانی کے اس ذخیرے کا بڑا حصہ سمندر کی صورت میں دستیاب ہے جو پینے کے قابل نہیں ہے' اس لئے انسان کو پینے کے پانی کے لئے بہت مشکلات کا سامنا ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا میں موجود کل پانی کا صرف ۳/فیصد برف کی صورت میں منجمد ہے' لگ بھگ ۲۴/فیصد زمینی ذخیرہ ہے جبکہ صرف ایک فیصد بارش کا پانی ہوتا ہے۔ تھر میں چونکہ زندگی کا انحصار محض بارشوں پر ہے' جب بارشیں نہیں ہوتیں تو زندگی تلپٹ ہو جاتی ہے۔

بارشیں نہیں ہوئیں تو تھر کے مکین اس وقت بھوک' پیاس اور بیماریوں کے دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اور پورے صحرا پر ہر طرف موت کے سائے لہرا رہے ہیں۔ ہم جس طرف سے گزرے ہیں اور جہاں جہاں گئے ہیں ان گنت کہی ان کہی کہانیوں سے پالا پڑا ہے۔ بھوک' پیاس اور بیماری نے پورے سماج کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ جس سے بات کرو ہر ایک کی الگ بپتا ہے۔ اس آفت میں کسی کا سہاگ اجڑ گیا ہے تو کوئی ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا۔ کسی کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے تو کوئی جواں سال بیٹے کی فرقت میں آنسو بہا رہا ہے۔ ماروؤں کے کندھے اپنے جگر گوشوں اور پیاروں کی لاشیں اٹھاتے اٹھاتے جھک گئے ہیں۔ اس موسم اور ایسی خشک سالی میں تھر اور روہی میں صورت حال یکساں ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں غمزدہ مرشد فرید کہتا ہے:

ڈکھڑے ڈکھڑے آیم پکھڑے
تاڈے ڈھٹڑے ٹوبھے سکڑے
دلڑی دردیں ماری بھلو
ککڑے کنڈڑے راہ جبل دے
اوکھے پینڈے مارو تھل دے
سولیں ساڑی ہاری بھلو

ترجمہ: میری قسمت میں دکھ اور الم ہیں۔ (موسم کیا بدلا) میرے جھونپڑے زمین بوس ہو گئے ہیں اور میرے تالاب خشک ہو گئے ہیں۔ درد والم نے میرے دل میں گھر کر لیا ہے۔ میری راہوں میں کنکر اور کانٹے ہیں۔ تھل (روہی ' ریگستان' تھر) کا سفر اور زندگی بڑی پر آشوب ہے۔ اس قیامت خیز زندگی سے میں ہار گئی ہوں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پچھلے ۵۰/دنوں میں ۱۰۰۰/افراد بھوک اور پیاس سے شکست کھا کر موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں اور مرنے والے مویشیوں کی تعداد ۵۰/ہزار سے کہیں زیادہ ہے۔ زندگی نے ان سے ہاتھ کیا ہے' کوئی چیز ان کے قابو میں نہیں رہی اور وہ اپنی قسمت پر نوحہ کناں ہیں۔ تھر کا ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے۔ وہ اپنی تقدیر کا رونا کس سے روئیں؟ آئے دن آفات پر تقدیر کو دوش دیں کہ مشکل گھڑی میں خبر گیری نہ کرنے پر حکومت کو موردِ الزام ٹھہرائیں۔ المیوں اور محرومیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو مسلسل ان کے تعاقب میں ہے۔ امداد اور موت کے انتظار میں تھر کے مارو گھڑیاں گن گن کر بتا رہے ہیں۔ ہم جہاں سے گزرتے ہیں بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بلکتے بچے ہماری جانب لپکتے ہیں اور ان کے خشک لبوں پر ایک ہی فریاد ہے:

''پانی' پانی' پانی۔''

ایسی آفت آن پڑی ہے کہ پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے تھری وطن چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہیں۔ بے گھری' ہجر اور فراق ان کا مقدر بن گیا ہے۔ ایسے میں مرشد خواجہ غلام فرید ریگستان کا نقشہ کچھ اس طرح پیش کرتا ہے:

گئے ویلے بھاگ سولڑے دے
آئے دورے درد کللڑے دے

ڈتے پیش فراق پنلڑے دے
ڈکھے پینڈے مارو تھلڑے دے

ہماری تشنگی مٹانے کی ذمہ داری ہمارے میز بانوں پر ہے۔ ہمارے پاس پانی کا جس قدر وافر ذخیرہ ہے وہ ہم ان لپکتے لڑھکتے معصوم جسموں کی جانب اچھال دیتے ہیں۔ ہماری طرف سے گاڑی سے اچھالی جانے والی دو چار پانی کی بوتلوں پر دسترس کے لئے ان بچوں میں غدر مچ جاتی ہے۔ شہروں میں پتنگ اور ڈور لوٹنے پر ایسے منظر عام ملتے ہیں مگر یہ منظر نہیں ہمارے سماج کا المیہ ہے۔ میرے کچھ منچلے ساتھیوں کے لئے یہ ایک اچھا تماشا ہے مگر میرا دل اس صورت گری پر شرمندہ اور دل گرفتہ ہے' میرا جی چاہتا ہے کہ میں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دوں۔

خشک سالی اور قحط سے متاثر عظیم صحرائے تھر میں زیادہ تر لوگوں کی گزر اوقات کسی حد تک کھیتی باڑی اور عام طور پر گلہ بانی پر ہے۔ قدرت نے انہیں وسیع قدرتی چراگاہیں عطا کی ہیں مگر کھیتی باڑی اور گلہ بانی کا انحصار بارشوں پر ہے۔ جب بارشیں نہیں ہوتیں تو زندگی یہاں اجیرن ہو جاتی ہے' نہ سبزہ ہوتا ہے اور نہ فصلیں۔ لوگ آب و دانے کو ترس جاتے ہیں۔ گزشتہ تین برسوں سے تھر میں بارشیں نہیں ہوئیں تو سرسبز علاقہ لق و دق صحرا میں بدل گیا ہے۔ بھوک پیاس اور بیماری سے ہزاروں مویشی ہلاک ہو گئے ہیں۔ زندگی نے ماروؤں سے اس قدر بے رخی اختیار کر لی ہے کہ لوگوں کو پینے کا پانی تک میسر نہیں ہے۔ جہاں کہیں تالاب اور جوہڑ ہیں' وہ خشک ہو چکے ہیں۔ اگر کہیں کسی تالاب میں گندا اور گدلا پانی موجود بھی ہے تو انسان اور جانور ایک ہی گھاٹ سے پیاس بجھاتے دکھائی دیتے ہیں۔

تھر کی چار تحصیلوں مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو اور چھور میں ۸۰ فیصد کنوئیں خشک ہو گئے ہیں اور جو ۲۰ رفیصد کنوئیں بچ گئے ہیں ان کا پانی اس قابل نہیں ہے کہ پیا جا سکے۔ حالیہ خشک سالی میں زیر زمین پانی کی سطح نہ صرف خطرناک حد تک گر گئی ہے بلکہ پانی انتہائی کھارا ہو گیا ہے۔ مجبور و بے کس تھری مضرِ صحت پانی پینے پر مجبور ہیں۔ سانس کی ڈوریاں قابو میں رکھنے کے لئے مردوں' عورتوں اور بچوں کو زہر جیسا پانی حلق میں انڈیلنا پڑتا ہے۔ دور دور تک پانی کی شنید نہیں ہے۔ ہمیں سرِ راہ ایسے کئی قافلے ملے ہیں جو پانی کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جہاں کہیں سے پانی کی دستیابی کی خبریں ملتی ہیں' سب لوگ برتن اور مشکیزے لے کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ گاؤں کے

گاؤں سارا سارا دن پانی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ تھر میں کنوؤں سے پانی بڑی گہرائی سے حاصل ہوتا ہے اس لئے پانی کھینچنے کے لئے جانور استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ عام طور پر یہ کام اونٹوں' گدھوں اور کہیں کہیں گھوڑوں اور بیلوں سے لیا جاتا ہے۔ اس بار یہ افتاد پڑی ہے تو کثرت سے جانوروں کی ہلاکت ہو چکی ہے' کنوؤں سے پانی کھینچنے والے جانور پیاسے مر گئے ہیں۔ اب جانوروں کا کام انسانوں کے ذمے آن پڑا ہے۔ یہ چلتے پھرتے ڈھانچے رسیوں کے ذریعے پانی کھینچنے پر مامور ہیں' اس میں نہ جنس کی تخصیص ہے نہ عمر کی' سب کے سب جتے ہوئے ہیں۔ اب یہاں انسان اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

پیاسا تھر پانی کی ایک ایک بوند کو ترس گیا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے انسان کو کیا کچھ جھیلنا پڑتا ہے' یہ کوئی ان تھریوں سے جا کر پوچھے۔ ہمیں کئی جگہوں پر ایسے مناظر دیکھنے کو ملے ہیں کہ آگ برساتے آسمان تلے' سلگتی ریت پر چیتھڑوں میں لپٹے' ننگے پاؤں مرد' عورتیں اور معصوم بچے ذرا سے پانی کے لئے جگہ جگہ بھٹک رہے ہیں۔ نوکوٹ اور مٹھی کے درمیانی قصبے وجیتو میں سات کنوئیں ہیں جن سے اردگرد کے کم وبیش چار ساڑھے چار ہزار افراد اپنی آبی ضروریات پوری کرتے ہیں' ان میں سے چھ کنوئیں مکمل طور پر خشک ہو چکے ہیں۔ اب اتنی بڑی آبادی کا انحصار صرف ایک کنوئیں پر ہے جو اتنی بڑی ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں رہا۔ خشک سالی میں اس کی سطح کافی گر گئی ہے۔ وجیتو میں سازدا کے زیرِ انتظام شمسی توانائی سے چلنے والا کھارے پانی کو میٹھا کرنے والا پلانٹ ایک مدت سے خراب پڑا ہوا ہے۔ ہمیں مٹھی آتے ہوئے وجیتو میں کچھ دیر قیام کرنے اور اس پلانٹ کو بھی دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہمارے استفسار پر مقامی لوگوں نے بتایا کہ پلانٹ کا پمپ عرصہ ہوا خراب ہے' کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ اسے کارآمد بنانے کے لئے اپنا کردار ادا کرے۔ سازدا اس پلانٹ کو چلانے میں ناکام رہا ہے۔

ایک سماجی کارکن اودے رام نے مجھے بتایا ہے ۱۹۸۷ء میں تھر کے گاؤں بائی جوتڑ اور ۱۹۹۰ء میں گاؤں وجیتو میں کھارے پانی کو میٹھے پانی میں تبدیل کرنے کیلئے شمسی توانائی سے چلنے والے پلانٹ لگائے گئے تھے۔ یہ دونوں پلانٹ کچھ عرصہ تک چلتے رہے جس سے علاقہ کے لوگوں کو پینے کیلئے میٹھے پانی کی سہولت حاصل رہی بعد میں کسی خرابی کے باعث یہ دونوں پلانٹ بند ہو گئے' متعلقہ حکام نے ان خراب پلانٹوں کو چلانے پر توجہ دی نہ ہی ان پلانٹس کی دیکھ بھال کی گئی

جس کے سبب یہ دونوں پلانٹ ناکارہ ہو گئے ہیں۔ حکام کی مجرمانہ غفلت اور لاپروائی کے سبب وجیتو سیلولر واٹر پلانٹ کی چار دیواری گر کر ختم ہو چکی ہے اور مائی جوتڑ کے پلانٹ کی ساری مشینری غائب کر دی گئی ہے۔ یہ کس نے غائب کی، اس کی کسی کو خبر نہیں۔

وجیتو میں ہمارے استقبال کے لئے موجود اودے رام اور سماجی و سیاسی تنظیموں کے مقامی نمائندوں نے متعلقہ اہلکاروں کی عدم توجہی اور غفلت کے باعث شمسی توانائی سے چلنے والے دونوں پلانٹ تباہ ہونے پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور بتایا کہ انہوں نے ہر دروازے پر دستک دے کر اس مجرمانہ غفلت کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اب اگر خدانخواستہ آنے والے مون سون میں بھی بارشیں نہ ہوئیں تو تھر کے سو فیصد کنوئیں خشک ہو جائیں گے اور تھر کی ایک بہت بڑی آبادی محفوظ علاقوں کی جانب نقل مکانی پر مجبور ہو گی۔

یہ تھری اپنے وطن تھر سے بڑی محبت کرتے ہیں لیکن جب پینے کو پانی نہیں ہو گا تو پھر وطن چھوڑنا مجبوری بن جاتا ہے۔ پہلی بار تو ہوا نہیں کہ تھر میں خشک سالی آئی ہو اور قحط پڑا ہو، یہ صدیوں کی کہانی ہے مگر ہم اپنے تجربات سے ذرا بھی سبق سیکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ احساسِ ذمہ داری نام کی چیز ہمارے پاس ہے ہی نہیں۔ ہم اس گیدڑ کی طرح ہیں جو سردی کی رات میں ٹھٹھرتا ہے تو اپنے آپ سے عہد کرتا ہے کہ کسی طرح یہ رات ٹل جائے تو صبح ضرور ٹھنڈ سے بچنے کے لئے غار کھودوں گا مگر رات گئی تو بات گئی۔ وہ روزانہ رات کو یہ عہد کرتا ہے اور روزانہ دن کے اجالے میں یہ عہد بھول جاتا ہے۔ ہمارے رویوں میں بھی جانوروں جیسا عاجلانہ پن آ گیا ہے۔ ہم پر بھی جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہم بھی خود سے بڑے بڑے عہد کرتے ہیں مگر جونہی مصیبت ٹلتی ہے تو سارے عہد و پیماں بھول جاتے ہیں۔ رات گئی تو بات گئی۔ باون برسوں سے یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے حکمران، حکومتیں، ادارے، سب گیدڑ چال چل رہے ہیں اور کیا عوام بھی؟ اس سوال کا جواب آپ پر میری امانت ہے۔

تھر پارکر کے ضلعی صدر مقام مٹھی میں زیر زمین پانی انتہائی کھارا ہے اور یہاں تقریباً تمام کنوئیں لوگوں کی نجی ملکیت ہیں۔ سرکاری طور پر فراہمی آب کی سہولتیں انتہائی محدود ہیں اور سرکاری سطح پر جتنی بھی سہولتیں میسر ہیں وہ سرکاری عملداروں کے لئے مخصوص ہیں۔ سرکاری

اہلکاروں کے لئے میٹھا پانی ٹینکروں کے ذریعے نوکوٹ اور دوسرے علاقوں سے منگوایا جاتا ہے۔ اس ملک میں فوجی اور سرکاری افسر جہاں بھی ہیں موج میں ہیں' ان کے لئے صحرائے تھر بھی جنت سے کم نہیں ہے۔ انہیں اس جنگل بیاباں میں بھی زندگی کی ہر آسائش میسر ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں آسائشیں اور سہولتیں ان کی دسترس میں رہتی ہیں۔

صحرائی علاقوں میں زیرزمین پانی میٹھا رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ بارشیں ہوتی رہیں' جب عرصے تک بارش نہیں ہوتی تو زیرِ زمین پانی مزید کھارا' کڑوا یا حددرجہ نمکین ہو جاتا ہے۔ اس بار بھی یہی ہوا ہے' خشک سالی میں تھر کے سیکڑوں کنوئیں خشک ہو گئے ہیں اور جو بچ گئے ہیں ان کا پانی کم بھی ہوا ہے اور کھارا بھی ہو گیا ہے۔ مٹھی اور تھر کے بعض دوسرے بڑے شہروں میں پانی فروخت ہوتا ہے۔ لوگوں نے اپنے ملکیتی کنوئیں کھدوا رکھے ہیں اور کئی جانور پال رکھے ہیں جو پانی کھینچنے اور پانی کی سپلائی میں کام آتے ہیں۔ عام طور پر ایک مشکیزہ دس سے پندرہ روپوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ کام ایک باقاعدہ کاروبار کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ خشک سالی کے دنوں میں زیرزمین پانی کی سطح نہ صرف کم ہو جاتی ہے بلکہ پانی بھی خاصا ترش ہو جاتا ہے تو ان کنوئیں والوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ عام طور پر ان کنوؤں سے روزانہ اوسطاً ایک ہزار سے پندرہ سو لیٹر پانی حاصل کیا جاتا ہے لیکن خشک سالی کے دنوں یہ مقدار تین سو سے پانچ سو لیٹر سے بھی کم رہ جاتی ہے۔

ترائی میں درجن سے زائد کنوئیں ہیں مگر نصف سے زائد کنوؤں کا پانی کھارا ہے اور جن کنوؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ میٹھے پانی کے کنوئیں ہیں' وہ بھی نام کے میٹھے ہیں۔ بارشیں نہ ہونے سے ان کنوؤں کا پانی بھی نیچے چلا گیا ہے بلکہ اور زیادہ کسیلا ہو گیا ہے۔ پیاسے تھری مجبوری میں یہ زہر بھی بخوشی پی رہے ہیں۔ یہ کنوئیں بھی مختلف لوگوں کی ذاتی ملکیت اور ان کا مستقل ذریعہ معاش ہیں۔ ہمیں تحصیل ڈیپلو کی گوٹھ سو بھیار' مالیہار اور سکھر وڑ سمیت کئی گوٹھوں میں جانے اور وہاں لوگوں سے ان کے غم بانٹنے کا موقع ملا ہے۔ یہاں بھی تمام کنوئیں خشک ہو گئے ہیں اور مقامی آبادی پانی کے حصول کے لئے میلوں بھٹکتی رہتی ہے۔ ان دیہات میں بارشوں کے دنوں کا ذخیرہ کیا ہوا پانی بھی ختم ہو چکا ہے۔ اب یہاں ہر زبان پر ''العطش العطش'' کے نالے ہیں' کوئی ہے جو ان فریادوں پر کان دھرے۔ ان کی کہانیاں سنتے سنتے میرے کان سائیں سائیں کرنے

لگے ہیں۔ گوٹھ کار یہار میں چند سال قبل ساز دا نے تیس لاکھ روپے کی لاگت سے پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے ایک اسکیم قائم کی تھی جو ناکارہ ہوگئی ہے۔ اس سے ارد گرد کی آبادیاں مستفید ہوتی تھیں مگر اب وہ اس سہولت سے محروم ہیں۔ یہ اسکیم کیوں ناکام ہوئی، اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ میرے اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔

مٹھی سے ڈیپلو جاتے ہوئے جواں سال لڑکیاں برہنہ پا اور برہنہ سر بغلوں میں پانی کے مٹکے دبائے اور کچھ لکڑیوں کے گٹھڑ سروں پر اٹھائے آتی جاتی دکھائی دیں۔ معصوم بچے اور بچیاں بھی ننگے پاؤں ان کے ساتھ ساتھ لپک رہی ہیں۔ مرشد فرید نے ان ریگستانی پریوں کے حضور کئی خوب صورت کافیاں نذر کی ہیں لیکن فرید کی یہ نازک ناز جٹیاں اس خشک سالی میں درد کی تصویر بنی ہوئی ہیں۔ ان کی ایک مشہور کافی ہے جس میں انہوں نے ان صحرائی پریوں کی وفاداری سے متاثر ہو کر ان کی دلداری کی ہے:

وچ روہی دے راہندیاں
نازک نازو جٹیاں
راتیں کرن شکار دلیں دے
ڈینہاں ولوڑن مٹیاں
گجھڑے تیر چلاون کاری
سے سے دلڑیاں پھٹیاں
کرکر دردمنداں کوں زخمی
ہے ہے بدھن ناں پٹیاں
چھیڑن بھیڈاں بکریاں گائیں
لیلے گابے کٹیاں
کئی مسکین مسافر پھاتے
چوڑ کتونیں تڑٹیاں
دھوئیں دار فقیر تھیوسے
فخر وڈائیاں سٹیاں

ہیوں دلبر دے کتڑے دردے
برہوں پیاں گل گٹیاں
مونجھ فرید مزید ہمیشاں
اج کل خوشیاں گھٹیاں

راستے میں ہمیں جا بجا مرے ہوئے جانوروں کی باقیات دکھائی دیں جن سے تعفن اٹھ رہا ہے۔فضا میں مردار کی بو بسی ہے جس سے ہم سب کا دم گھٹنے لگا ہے۔ ہر طرف پانی کے متلاشی تھری مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ڈیپلو کی طرف آئے ہیں تو یہاں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ ڈیپلو شہر میں ایک بھی سرکاری کنواں نہیں ہے اور لوگوں کی ملکیت میں جو کنوئیں ہیں ان کا پانی بھی میٹھا نہیں ہے۔ یہاں بھی پانی کی نجی سطح پر فراہمی کاروباری انداز میں ہوتی ہے۔ یہاں چالیس لیٹر کا مشکیزہ دس روپے میں اور بیس لیٹر کا مشکیزہ پانچ روپوں میں فروخت ہوتا ہے۔لوگوں کے پاس جو جمع پونجی تھی وہ خوراک اور دیگر ضروریات پوری کرنے میں اٹھ چکی ہے۔اب وہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سودخوروں کے آگے ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہیں۔

ڈیپلو کے تمام دیہات میں بھی زیادہ تر کنوؤں کا پانی خشک ہو گیا ہے یا پھر ان کی سطح بہت حد گر گئی ہے۔ اسلام کوٹ بھی صحرائے تھر کا اہم شہر ہے جو ماضی میں سیاسی اٹھا پٹخ کے حوالے سے کافی مشہور رہا۔ یہاں سرکاری طور پر فراہمی آب کا انتظام محدود پیمانے پر موجود ہے اس کی استعداد اتنی نہیں کہ شہر کی ضروریات پوری کر سکے جبکہ فراہم کیا جانے والا پانی کھارا ہے۔ اسلام کوٹ کے پانچ سرکاری کنوؤں میں سے تین کنوئیں بند ہو گئے ہیں ۔یہاں نجی ملکیت میں غالباً چالیس کنوئیں ہیں جو پندرہ بیس ہزار کی آبادی کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔شہریوں کو ۲۰۰/ سے ۲۵۰/روپے فی گھر ماہانہ پانی کیلئے کنوئیں کے مالکان کو دینا پڑتے ہیں۔

مٹھی میں ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر تھرپارکر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ پورے تھرپارکر میں صرف ۶/ سے ۷/فیصد آبادی کو پینے کے پانی کی سہولت حاصل ہے ۹۳ سے ۹۴ فیصد آبادی اس بنیادی سہولت کے لئے ترس رہی ہے۔انہوں نے خوش خبری سنائی کہ حال ہی میں صحرائے تھر کے مختلف علاقوں میں زیرِ زمین پانی کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ یہ پانی کب اہلیانِ تھر کا نصیب بنتا ہے اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا۔ محکمہ صحت نے تھر کے مختلف

علاقوں سے پانی کے جو نمونے تجزیئے کیلئے بھیجے تھے ان میں ڈائریا اور پیٹ کی دوسری بیماریوں کے جراثیم پائے گئے ہیں۔اس کے باوجود وہ یہ لوگ آلودہ پانی پینے پر مجبور ہیں۔اس کے سواان کے پاس کوئی اور راستہ نہیں۔انہیں زندہ رہنے کے لئے زہر پینا پڑ رہا ہے۔

چیلہار میں حکومت نے حال ہی میں واٹر سپلائی اسکیم کیلئے ٹیوب ویل لگا کر دیا ہے۔یہاں پانی کے پانچ سرکاری کنوئیں ہیں لیکن ان کا پانی انتہائی کھارا ہے۔چھاچھرو جاتے ہوئے ''کڑبی جی ترائی'' کے مقام پر رکنے کا موقع ملا تو یہاں بھی انسانیت سوز مناظر دیکھنے کو ملے۔بارش کی بوندا باندی سے ایک جوہڑ میں تھوڑا سا پانی جمع ہے' یہ گدلا اور بدبودار پانی انسان اور جانور ایک ساتھ پیتے ہوئے دکھائی دیئے تو بلوچستان اور چولستان کے منظر' میری آنکھوں میں گھوم گئے ہیں۔ چھاچھرو کے گاؤں بھوریلو کی آبادی چھ ہزار ہے لیکن پورا گاؤں پینے کے میٹھے پانی کی سہولت سے محروم ہے۔گاؤں بھوریلو کے اکثر کنوؤں کا پانی خشک ہو گیا ہے اور باقی کنوؤں میں پانی کی سطح گر گئی ہے اور پانی بھی کڑوا ہو گیا ہے۔

مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو کے درجنوں دیہات اور بھارت سے متصل تحصیل ننگر پارکر اور چھور کے سرحدی دیہات میں پانی کی صورتِ حال اس بار بہت زیادہ خراب ہوئی ہے۔تھر کے ان علاقوں میں بیشتر تالاب' جوہڑ اور کنوئیں خشک ہو گئے ہیں۔ان دنوں پورا صحرا کربلا کا منظر پیش کر رہا ہے۔جب پانی کے وسائل باقی نہیں رہے تو اب یہاں رہنا ان کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔جو جانور اس آفت میں کام آنے سے بچ گئے ہیں' تھری ان پر گھروں کا ضروری ساز و سامان لاد کر اپنے آبائی علاقوں سے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ہر آفت میں عارضی نقل مکانی ان کا مقدر بن گئی ہے۔بارشیں ہوں گی تو صحرا کے نصیب پھر جاگ اٹھیں گے اور یہ دوبارہ اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔مرشد فرید اس کی منظر کشی یوں کرتا ہے:

تھیاں سرسبز فرید دیاں جھوکاں
سبھوں خنکی چائی سوکاں
نند ناں مانون کھیر
مولا ماڑ وسایا

ترجمہ: بارش کیا ہوئی' فرید کے مسکن سرسبز و شاداب ہو گئے۔ہر خشک پودے پر تازگی چھا

گئی ہے۔(اس موسم میں) مال مویشیوں کے تھنوں میں دودھ ہے کہ سماتا ہی نہیں۔شکر ہے' خدا تعالیٰ نے' (ریگستان) ماڑ کا ملک آباد کیا۔

روہی اور تھر کے دکھ سانجھے ہیں' خشک سالی میں زندگی بس میں نہیں رہتی اور جب بادل اُمڈ اُمڈ کر برستے ہیں تو ریگستان کا روپ ہی الگ ہو جاتا ہے۔اسی حوالے سے مرشد فرید کہتا ہے:

سو سو چھانگاں لکھ لکھ چھیڑو
ڈھڑے دی دوہ ڈیون پندھڑو
روہی تھئی آباد جدید

ترجمہ: جب مسافر ریگستان میں بارش کی خبر دیتے ہیں تو ہر طرف خوشیاں پھیل جاتی ہیں۔ روہی (ریگستان) میں سیکڑوں ہزاروں ریوڑ اور لاکھوں چرواہے موج میں آجاتے ہیں۔ایسے میں ریگستان ایک نئے انداز سے آباد ہو جاتا ہے۔

صحرائے تھر میں ۱۹۹۵ء سے ۱۹۹۹ء کے دوران بارشوں کا تناسب انتہائی کم رہا۔ادھر بدین کی سرحدوں کے ساتھ واقع علاقوں میں طوفان کے ساتھ آنے والے سمندری ریلے نے جانوروں کے چارے کے طور پر اُگنے والی قدرتی گھاس کو تلف کر دیا۔معمول سے کم بارشوں کی وجہ سے پورے صحرا میں مویشیوں کا چارا نایاب ہو گیا ہے جبکہ کاشتکاری بھی کم ہوئی' نتیجتاً انسان اور جانور دونوں کو ہی خوراک کی شدید قلت کا سامنا ہے۔خوراک کی کمی کی وجہ سے بیماریاں بھی زیادہ پھیل گئی ہیں۔ناموافق حالات میں انس و جاں میں بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت سرخ لکیر تک کم ہو گئی ہے,جس سے انسانوں اور جانوروں میں اموات کی شرح حد سے زیادہ بڑھ گئی۔

۱۹۹۵۔۹۶ء میں محکمہ لائیو اسٹاک تھرپارکر کی جانب سے جاری کئے جانے والے اعداد و شمار کے مطابق پورے صحرا میں ۳۶ لاکھ سے زائد جانور اور مال مویشی پالے جاتے ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں جو نئے اعداد و شمار سامنے آئے ان کے مطابق تھرپارکر میں ہر ایک کلومیٹر میں ۲۱۰ر مویشی ہیں اور پورے تھرپارکر میں ۴۰ر لاکھ ۷۰ ہزار مویشی ہیں۔صحرائے تھر کی ۵۵ر فیصد آبادی کی معیشت کا انحصار انہی جانوروں اور مال مویشیوں پر ہے لیکن جب یہ جانور چارے اور پانی کی قلت کے باعث نہیں رہتے تو انسانی زندگی کی سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں اور پورا صحرا بھوک اور پیاس کی تصویر بن جاتا ہے۔

اس دورے میں ہماری ہر علاقے میں ہر سطح کے لوگوں سے گفت وشنید ہوئی ہے۔ اعداد وشمار کے ہیر پھیر اور کمی بیشی چھوڑ کر سب کا دکھ ایک جیسا ہے۔ بھوک اور بیماری نے تھریوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ بھوک اور پیاس تو ایک مسئلہ تھی ہی' بیماری نے اور زیادہ ہولناکیاں پھیلا دی ہیں۔ اس سال پڑنے والی خشک سالی کے باعث تھر کے طول وعرض میں جو ہلاکتیں ہوئی ہیں ان کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہیں کیونکہ اس سلسلے میں سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر جاری یا بیان کئے جانے والے اعداد وشمار میں کافی فرق ہے۔ سرکاری ذرائع ہلاکتیں کم سے کم بتاتے ہیں جبکہ آزاد ذرائع کچھ اور تصویر پیش کرتے ہیں جو بہت بھیانک ہے۔ انتظامیہ رپورٹ ہونے والے اعداد وشمار پر اکتفا کرتی ہے اور دیگر ذرائع سینہ بہ سینہ ملنے والے اعداد وشمار ہماری نذر کرتے ہیں۔

کون صحیح ہے اور کون غلط' اسے چھوڑیئے' حقیقت یہ ہے کہ اس بار مویشیوں کی بڑے پیمانے پر ہلاکتوں نے تھر کے باسیوں کو وحشت زدہ کر دیا ہے۔ اس بار تھر میں خشک سالی نے نئی بحث کو جنم دیا ہے' انسان زیادہ مرے ہیں یا جانور؟ بہ حیثیت صحافی غیر جانبداری میرا بنیادی وصف ہے' میں اس سے منہ نہیں موڑوں گا۔ میں سمجھتا ہوں تھری ان دنوں حالتِ جنگ میں ہیں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ حالیہ خشک سالی نے ہر سطح پر' ہر شعبے میں بے پایاں نقصان پہنچایا ہے۔ انسان مرے ہیں تو شمار نہیں اور جانور ہلاک ہوئے ہیں تو بھی ان کی اصل تعداد حاصل کرنا ممکن نہیں۔ پھر یہ جو وبائی امراض پھیلے ہیں ان سے انسانوں اور مویشیوں کو کس قدر خطرات لاحق ہیں' ان کا اندازہ لگانا محال ہے۔ اس وبال میں جو بچ گئے ہیں انہیں بھی جان کے لالے پڑے ہیں۔ تھری باشندوں کے نزدیک مویشیوں کا تحفظ ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا ہے۔

تھر کے دور افتادہ علاقوں میں ہم نے کئی متاثرہ دیہات کے دورے کئے۔ وہاں کے باسیوں نے ہلاکتوں کا سبب بھوک سے زیادہ مختلف بیماریوں کو ٹھہرایا لیکن بعض نے برملا کہا کہ زیادہ ہلاکتیں اشیائے خوردنی کی عدم دستیابی سے ہو رہی ہیں لیکن عزتِ نفس کے مارے لوگ بیماریوں کو وجہ ہلاکت قرار دے رہے ہیں۔ تھری بھی عام سندھی سماج کی طرح جاگیردارانہ نفسیات کے حامل لوگ ہیں' مرتے مر جاتے ہیں اپنی شان پر حرف نہیں آنے دیتے۔ ان علاقوں میں یہی صورتِ حال کارفرما ہے' بھوک اور پیاس نے ان کی زندگیاں داؤ پر لگا دی ہیں مگر یہ ہیں کہ اپنی ''واہ'' نہیں جانے دے رہے۔

میں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ خشک سالی کی صورتحال کا جائزہ لینے کیلئے ڈیپلو' اسلام کوٹ' مٹھی اور چھاچھرو کے آس پاس کئی دیہات کا دورہ کیا' اس دوران لوگوں کے خیالات سننے کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ حکومت کی جانب سے امدادی کارروائیوں پر کسی حد تک مطمئن ہیں لیکن ان کارروائیوں کو مسئلے کا مستقل حل نہیں گردانتے۔ فصل کی کٹائی کے موسم میں بڑی تعداد میں تھری باشندے نقل مکانی کر کے بیراج والے علاقوں کی طرف نکل آتے ہیں یہ ان کا ہر سال کا معمول ہے مگر اس مرتبہ خشک سالی کے باعث نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد کچھ زیادہ رہی۔ جیسے ہی حکومت نے تھر میں امدادی کاروائیوں کا آغاز کیا' ان کی واپسی شروع ہو گئی ہے۔

خشک سالی میں وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے کئے جانے والے اقدامات سے نہ تو تھری خوش ہیں اور نہ ہمیں ان اقدامات سے کوئی اطمنیان ملا ہے۔ تھری قحط کے عالم میں ہیں اور ریاست کا کردار' سب کچھ نعرے بازی اور دکھاوے تک محدود ہے۔ پانی' غذا اور ادویات کی فراہمی کے لئے ہنگامی بنیادوں پر کئے گئے حکومتی انتظامات اس قدر کارآمد نہیں ہیں کہ ان سے تھریوں کی بے شمار مصیبتوں کو ٹالا جا سکے یا ان کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکے لیکن اس بار نوید سنائی گئی ہے کہ صحرائے تھر میں مسلسل خشک سالی سے نمٹنے کے لئے حکومت اگلے ایک سال کے دوران متاثرہ علاقوں میں مصنوعی بارش کا تجربہ کرے گی۔ اگر یہ تجربہ کامیاب رہا تو خشک سالی میں بھی تھری بارانِ رحمت کے مزے لوٹ سکیں گے۔

ایک حکومتی اہلکار نے ہمیں بتایا کہ برسات کے لئے پانی بھرے بادلوں پر ہوائی جہاز کے ذریعے ایک خاص قسم کا محلول اسپرے کیا جائے گا جس سے بارش ہونے کا عمل شروع ہو جائے گا۔ اس اہلکار نے بتایا ہے کہ مصنوعی بارش برسانا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ بادل پانی سے بھرے ہوں تو اس صورت میں ان بادلوں پر محلول چھڑک کر اس کی کثافت کو انگیخت کیا جاتا ہے جس کے بعد عام طور پر پانچ چھ گھنٹوں میں بارش کا امکان ہوتا ہے۔ موسمیات کے شعبے سے وابستہ اس اہلکار نے بتایا کہ اس قسم کے تجربات روس' افریقہ اور مغربی ممالک میں ہوتے رہتے ہیں' پاکستان میں مصنوعی بارش کا یہ تجربہ ملکی تاریخ کا پہلا واقعہ ہوگا۔ اس اہلکار نے مزید بتایا کہ پاکستان میں ان تجربات کی کامیابی کے امکانات ستر سے اسی فیصد ہیں اور مصنوعی بارش سے کسی قسم کے منفی اثرات بھی پیدا نہیں ہوتے اور ماحول بالکل فطری انداز میں

خوشگوار اور انسان دوست ہو جاتا ہے۔

بہرحال خشک سالی سے متاثر صحرائے تھر کے لوگ اس بار بھی اس آفت کو جھیل لیں گے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کیا ہر بار حکومت اور ذمہ دار ادارے قدرتی آفات کا رونا رو کر اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑاتے رہیں گے؟ تھر پارکر میں خشک سالی اور قحط کوئی اچنبھے کی بات نہیں' یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے اور ہر بار اداروں کے پاس موسم کی متوقع بے رحمیوں کی پیشگی اطلاعات بھی موجود ہوتی ہیں لیکن یہ ادارے اپنے فرائض پورے کرنے میں ذمہ داری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اداروں کی اس مجرمانہ غفلت کا خمیازہ بہرصورت لاچار اور معصوم تھریوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

خشک سالی سے نمٹنے کے پیشگی انتظامات' احتیاطی تدابیر اور بروقت امدادی کارروائیاں کر کے ان علاقوں کے لوگوں کے دکھ کم کئے جا سکتے ہیں۔ آزادی کی نصف صدی میں تھر کو درجنوں بار خشک سالی کا سامنا رہا ہے جس میں مقامی آبادی اپنے بے شمار پیاروں کے علاوہ لاکھوں کروڑوں کی املاک' مویشیوں اور فصلوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے مگر ہر بار حکومتی اہلکار قدرتی آفات کا نام دے کر اس علاقے کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ اربابِ حل وعقد ماضی سے سبق حاصل کر کے اپنے معاملات درست کریں تا کہ آنے والے دنوں میں قدرتی آفات سے ہونے والے نقصانات کی شدت کو کم کیا جا سکے۔ بہرحال مداوے کی کوئی صورت ہونی چاہئے۔

خشک سالی اور قحط سے ہونے والی ہلاکتوں سے تھر کے ماحول میں سڑاند محسوس ہو رہی ہے۔ گِدھوں کے غول کے غول فضا میں منڈلا رہے ہیں۔ یہ موت کے سندیسے پھیلانے والا پرندہ ہے' ہم اس سے کراہت محسوس کرتے ہیں لیکن صحرائی سماج میں اس کا وجود غنیمت سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پرندہ قدرتی طور پر ماحول دوست ہے کہ جو جانوروں کی نعشوں کو کھا کر ماحول کو بہتر بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اگر یہ مرے ہوئے جانوروں کو نہ کھائے تو جانوروں کی نعشیں کھلے عام سڑنے سے ماحول میں آلودگی پھیلنے کا خدشہ ہوتا ہے جس سے موذی اور وبائی امراض جنم لیتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ تباہی پھیلتی ہے۔

تھر کے مقامی بزرگوں سے گِدھوں کا یہ وصف سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے حالانکہ مجھے کچھ عرصہ پہلے بھارت ہو کر پلٹنے والے ایک صحافی دوست نے بتایا تھا کہ پڑوسی ملک بھارت میں

ماحولیات کے تحفظ کے لئے باقاعدہ گِدھوں کی حفاظت اور افزائش کے لئے کثیر سرمایہ سے خصوصی مہم چلائی جارہی ہے تو میں نے اس کی یہ بات مذاق میں اڑا دی تھی لیکن اس سفر میں نوے سالہ بزرگ ماتے جی نے گدھ کے اس قدرتی وصف سے آگاہ کر کے میری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ سنا ہے کہ اب پاکستان میں بھی گدھ کی پرداخت کے لئے منصوبہ بندی پر غور کیا جارہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں تو انسان کی زندگی بچانے کے لئے کوئی اپنی ذمہ داری پوری کرنے کو تیار نہیں ان گِدھوں کو کون پوچھے گا۔



سورج سوا نیزے پر

مٹھی تک آتے آتے گرمی کے مارے ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ موسم کے رنگ بدلتے ہی یہاں صحرائے تھر میں نوکوٹ سے ننگر پارکر تک خشک سالی نے ہر طرف اپنے منحوس سائے پھیلا دیئے ہیں۔ برکھا دیوی ماروؤں سے ایسی روٹھی ہے کہ اب تو کوئی بادل بھولے بھٹکے سے بھی اس طرف کا رخ نہیں کر رہا۔ سورج سوا نیزے پر آ گیا ہے اور آگ برسا رہا ہے، زمین بھی تپش اگل رہی ہے۔ یہ نومبر ہے، ان دنوں میں بھی درجہ حرارت ۴۰ر سے ۴۵ر سینٹی گریڈ روز کا معمول بن گیا ہے۔ ندی نالے اور تالاب یوں خشک ہو گئے ہیں کہ جیسے کبھی ان کا وجود ہی نہیں تھا۔ آسمان سے برسنے والی آگ نے زمین کا ماحول جلا کر خاکستر کر دیا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز سرزمین لق ودق صحرا میں بدل گئی ہے۔ مصورِ صحرا، میرا مرشد فرید ایسی ویرانیوں میں جدائی اور وصال کے نقشے انسان کی روح میں اتر کر کھینچتا ہے:

پر وحشت سنجڑی روہی
اے دل دیوانی موہی
ونج آکھیں قاصد بھلڑا
ہے سانون سخت اولڑا
مل یار رتھلاں وچ کلہڑا
ہئی قسم خدا دی دروہی

اسے کہتے ہیں تقدیر' پلک جھپکنے میں تھر کے ریگزاروں میں زندگی نے موت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ بوڑھے ''پُران'' کے کنارے آباد ٹھنگو سے لے کر راجستھان سے جڑے ننگر پار کر تک ہم جہاں جہاں سے گزرے ہیں' گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہیں۔ وہاں کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد' چاروں جانب موت اور سناٹوں کا راج ہے' ہر طرف گدھ منڈلا رہے ہیں۔ پیاس اور افلاس کے مارے ماروؤں نے اچھے دنوں کی آس میں' بھوکے اور پیاسے مرنے پر نقل مکانی کو ترجیح دی ہے۔ اس طویل سفر میں ہمیں ہزاروں لوگ ایسے ملے کہ جو اپنے اہلِ خانہ اور مال مویشیوں کے ہمراہ بیراجی علاقوں کا رخ کر رہے تھے۔ یہ ایک عارضی ہجرت ہے' موسم بدلتے ہی مسافر پنچھیوں کی طرح یہ سب اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے۔ گھروں کو چھوڑنا ان کے لئے سوہانِ روح ہے' مگر انہیں یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑ رہا ہے۔ بر ہم موسم کے مارے' مارو وسیع پیمانے پر ترکِ وطن پر مجبور ہیں۔ نقل مکانی کرنے والے ان خاندانوں نے اپنے بیمار عزیزوں کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کے لئے اپنے سالخوردہ چنوروں میں چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ کسی مجبوری کے سبب اپنی وراثتیں ابھی تک سنبھالے بیٹھے ہیں ان کی زندگیاں بھی داؤ پر لگی ہیں:

چیتر بہار خزاں ڈسیجے
جھوک سبھو ویران ڈسیجے
ناں کوئی علم ناں بان ڈسیجے
روہی ڈین ڈریندی ہے

تھر کے باشندے بوند بوند پانی کے لئے ترس رہے ہیں۔ تھری مرد اور خواتین دونوں اپنے بھوک اور پیاس سے بلکتے بچوں کو گھروں میں بے یارومددگار چھوڑ کر سلگتے صحراؤں میں سارا سارا دن خوراک اور پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ غذا اور پانی کی آس میں اب تک سیکڑوں مرد' عورتیں اور بچے زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ چارے اور پانی کے بغیر جانوروں کی ہلاکتیں بھی ہزاروں تک پہنچ چکی ہیں۔ نقل مکانی کرنے والے خاندان' دودھ دینے والے جانور اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں جبکہ دوسرے جانوروں کو نشان لگا کر بے رحم موسموں کے سپرد کر کے لق و دق صحرا میں ہانک دیا ہے' جہاں موت انہیں گلے لگانے کے لئے بیتاب ہے۔

مجھے مٹھی کے جوشول نے دل دہلا دینے والا واقعہ سنایا ہے۔اس نے بتایا ہے کہ چھا چھرو سے کوسوں دور ایک گاؤں کے جواں سال لڑکے سے اپنے گھر والوں کی پیاس دیکھی نہیں گئی' وہ خود بھوکا پیاسا' اپنا گدھا لے کر پانی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا' وہ دو روز تک واپس نہیں آیا تو گاؤں والوں کو تشویش ہوئی اور وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔وہ نوجوان اپنے گاؤں سے کوسوں دور کہیں پانی تلاش کرنے میں کامیاب رہا تھا مگر زندہ گھر نہ لوٹ سکا۔وہ جس راستے سے پانی تک پہنچا تھا' ریت پر اس کے قدموں کے نشان تیز ہوا نے مٹا دیئے اور وہ بھٹک گیا۔تین دن کے بعد اس کے عزیز و اقارب اس کا کھوج لگانے میں کامیاب رہے مگر وہ مردہ حالت میں ملا۔ اس کی لاش کے قریب اس کا گدھا بھی کھڑا تھا جس پر دو مشکیزے پانی سے بھرے ہوئے ملے۔ گاؤں والوں نے اسی پانی سے اسے غسل دے کر اس کی نعش کو ریت میں دبایا اور بچا کھچا پانی لے کر گاؤں واپس چلے آئے۔ یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے جوشول افسردہ تھا اور میری آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔اس بے رحم موسم میں بدنصیب تھر میں' ہر طرف ایسی ہزاروں داستانیں بکھری پڑی ہیں جو نام نہاد مہذب معاشرے کے منہ پر طمانچہ ہیں:

سجن سدھائے ول ناں آئے
واہ قادر دا رنگ وے
کول ناں نیتم ڈھول دلیندے
روہی رُلیم کرنگ وے

صحرائے تھر میں زندگی بارانِ رحمت کی محتاج ہے۔بادل امڈتے اور برستے رہیں گے تو تھر سرسبز اور تھری خوشحال رہیں گے۔یہاں جب بھی بارشیں کم ہوتی ہیں' خشک سالی کا عفریت سر اٹھانے لگتا ہے اور خدانخواستہ بارشیں نہ ہونے کا یہ عرصہ طول پکڑ جائے تو اس خطے کو قحط اپنے چنگل میں لے لیتا ہے اور پھر اس کے اثرات سے نکلنے میں مدتیں لگ جاتی ہیں۔تھر میں بارشوں کا سالانہ تناسب ۲۰۰ر سے ۳۰۰ رملی لیٹر سالانہ ہے۔۱۹۸۷ء سے اب ۱۹۹۹ء تک کوئی سال ایسا نہیں ہے کہ یہاں معمول کی بارشیں ہوئی ہوں۔ان تیرہ برسوں میں بارشوں کی سالانہ اوسط ۹۰ رملی لیٹر سے بھی کم رہی ہے۔ ماروؤں کو ہر سال اس علاقے کو آفت زدہ قرار دلانے کے لئے چیخنا چلانا پڑتا ہے۔ بارشیں تو اس سال بھی ہوئی ہیں مگر طوفانِ بادو باراں کی وجہ سے پورے صحرا میں تباہی پھیل گئی۔

امسال مئی کا مہینہ ان طوفانوں کی وجہ سے تھر کے کچھ علاقوں کے لوگوں پر بہت بھاری رہا۔

تھر میں موسمی جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خشک سالی اور قحط کوئی تازہ کہانی نہیں، یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ یہاں ۱۸۲۰ء میں آنے والے قیامت خیز زلزلے نے زندگی مکمل طور پر تلپٹ کردی تھی۔ تھر کی معصوم نسلیں قدرت کے اس گھاؤ سے ابھی سنبھل بھی نہ پائی تھیں کہ ۷۹ رسال بعد ۱۸۹۹ء میں تاریخ کی بدترین خشک سالی نے پورے صحرا کو بھوک اور پیاس کی دلدل میں دھکیل دیا تھا۔ تاریخ کی اس بدترین خشک سالی نے صحرا میں ہر طرف اپنی نحوست کے سائے پھیلا دیئے۔ اس کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تھری اس زخم میں ٹیسیں آج سو سال بعد بھی محسوس کرتے ہیں۔ میں جس دور کی بات آپ کی نذر کررہا ہوں، اس وقت تھر پار کر میں عمر کوٹ اور موجودہ بیراج ایریا کے علاقے بھی شامل تھے۔ غیر مقامی حکمرانوں کے دور میں اس قسم کی آفات میں رعایا کو صبر شکر اور پامردی سے حالات کا مقابلہ کرنے کی تلقین کی جاتی تھی مگر اپنوں کے برعکس ان غیروں کے دل میں ماروؤں کا درد تھا اور وہ قبضہ گیر ہونے کے باوجود انسانوں کے دکھ کو محسوس کرتے تھے۔

انگریز حکمرانوں نے دکھ کی اس گھڑی میں ماروؤں کو تنہا نہیں چھوڑا اور بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیاں شروع کیں تاکہ ماروؤں کے زخم پر فوری مرہم رکھا جاسکے۔ ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے علاوہ انگریز انتظامیہ نے مستقبل میں اس طرح کی ناگہانی آفات سے بچنے کے لئے صحرائے تھر میں پانی کی مستقل بنیادوں پر فراہمی کے لئے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی کی اور کثیر رقم خرچ کرکے جمڑاؤ کینال تعمیر کی جو آج ایک صدی بعد بھی تھر کو فراہمی آب کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ جمڑاؤ کینال کی وجہ سے بعد میں آنے والی قدرتی آفات میں حالات پر قابو پانے میں بڑی حد تک مدد ملی۔ خاص طور پر ۱۹۳۸ء میں ایک بار پھر صحرائے تھر کو موسمی جبر نے اپنی لپیٹ میں لیا تو جمڑاؤ کینال نے اس بار تھریوں اور ان کے مویشیوں کو بچانے میں اہم کردار کیا۔ مویشیوں سے ماروؤں کی زندگی جڑی ہے۔ جب مویشی نہیں رہتے تو تھریوں کی زندگی خطرات میں گھر جاتی ہے۔

تھر میں زندگی معمول پر رکھنے کے لئے مون سون کی کم وبیش تین بارشیں ضروری ہوتی ہیں۔ جس سال یہ بارشیں نہ ہوں تو نہ فصل اگتی ہے نہ چارہ۔ زندگی تھر سے روٹھ جاتی ہے۔ اس بار خشک سالی کے باعث تھر میں بڑی تعداد میں مویشی ہلاک ہوئے، اس ضمن میں سرکاری اور غیر

سرکاری سطح پر ہمیں مختلف اعداد وشمار ہاتھ آئے ہیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ جانوروں اور مویشیوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکتوں نے تھر کے باشندوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔اس سفر میں مجھے ایسے کئی لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جنہیں اپنے عزیز واقارب کی موت کا اتنا غم نہیں جتنا انہیں اپنے مویشیوں کی ہلاکت کا دکھ ہے۔

قحط کا سبب انسانی سرگرمیاں اور افعال ہیں یا یہ ایک قدرتی عمل ہے؟ سال بہ سال درجہ حرارت بڑھ رہا ہے' ایسا صرف پاکستان میں ہے یا یہ ایک عالمی مسئلہ ہے؟ یہ سوال اہم بھی ہیں اور غور طلب بھی۔حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا درجہ حرارت ہر سال بتدریج بڑھ رہا ہے۔دنیا میں بیسویں صدی کی آخری دہائی میں سو برسوں میں سب سے زیادہ گرمی ریکارڈ کی گئی۔اکیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بھی درجہ حرارت خطرناک حد تک بڑھتا چلا جائے گا۔اگر درجہ حرارت اسی تناسب سے بڑھتا رہا تو آنے والے چند برسوں میں گرمی کے پچھلے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔عالمی درجہ حرارت کی تیزی سے تبدیلی کے نتیجے میں انسانی صحت متاثر ہو رہی ہے جبکہ پانی' ہوا اور غذا پر بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔اس تغیر سے عالمی سطح پر آبی' فضائی اور حرارتی امراض جنم لے رہے ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق درجہ حرارت کی اس تبدیلی سے سالانہ ۶۰ ر ہزار افراد موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔اس حوالے سے سائنس دانوں کا اصرار ہے کہ پالیسی سازوں اور فیصلے کا اختیار رکھنے والوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر درجہ حرارت پر قابو پانے کے لئے ٹھوس اقدامات اور فیصلے کرنا ہوں گے۔

امریکی سائنس دانوں نے حیرت انگیز دعویٰ کیا ہے کہ درجہ حرارت میں نت نیا اضافہ انسانی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے۔ان کا خیال ہے کہ ان سرگرمیوں کو ابھی نہ روکا گیا تو انسانوں کی اس دنیا میں تباہیوں کے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔انہوں نے پیش گوئی کی ہے کہ آنے والے برسوں میں پوری دنیا میں تند و تیز طوفانی آندھیاں چلیں گی' آتش فشاں پھٹیں گے' بے موسم برسات ہوگی اور ساحلی علاقے ہر سال انسانوں کے لئے تباہ کاریاں اگلیں گے۔سائنس دانوں نے تنبیہ کی ہے کہ انسانی زندگی کو لاحق خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اور درجہ حرارت کو مزید بڑھنے سے روکنے کے لئے ماحول کو مجموعی طور پر انسان دوست رکھنا ہوگا۔اس کے لئے ایسے تجربات اور سرگرمیوں سے باز رہنا پڑے گا جو تابکاری اثرات پھیلاتے ہیں' تیل کے متبادل کے طور پر گیس

کے استعمال کو رواج دینا ہوگا اور ایسے سب اقدامات سے گریز کرنا ہوگا جو ماحول میں کثافت کا زہر گھولنے کا موجب بنتے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ کثافت پر قابو پائے بغیر ماحول کو مکمل طور پر انسانوں کے حق میں نہیں کیا جاسکتا۔

ایک اور تشویش ناک تحقیق پڑوسی ملک بھارت کے سائنس دانوں کے توسط سے ہاتھ آئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اب ہر سال مون سون کی بارشیں اوسطاً ۵۰ ملی میٹر کم ہوں گی۔ اس کے باوجود بھارتی سائنس دانوں کی خوش فہمی ہے کہ بارش کم ہونے کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ بارش کی کمی اور خشک سالی میں براہِ راست کوئی رشتہ ہے۔ بارشوں کی نایابی سے فصلوں کی پیداوار پر اثر ضرور پڑتا ہے مگر قحط سالی میں زیرِ زمین پانی کی سطح اہم کردار ادا کرتی ہے۔ بھارتی سائنس دان پرشانت گوسوامی کے خیال میں صحرائی علاقوں میں خشک سالی کا بنیادی سبب وہاں زیرِ زمین پانی کی سطح میں تیزی سے ہوتی ہوئی کمی ہے جو ہر سال بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔

بھارت ہی کے ایک نوبل انعام یافتہ ' معاشیات اور اقتصادیات کے ماہر پروفیسر امریتا سین نے اپنے طویل تحقیقی مقالے میں پاکستان' بھارت اور افغانستان میں قحط اور خشک سالی کے قضیئے کو موضوع بنایا ہے۔ وہ ماہرین کے اسی روایتی مباحثے کو زیرِ بحث لائے ہیں کہ قحط کا باعث انسان ہیں یا قدرتی عوامل؟ تاریخ ایسے کئی واقعات سے بھری پڑی ہے کہ لوگ سیلاب یا خشک سالی کے ہاتھوں بڑے پیمانے پر لقمہ اجل بنے یا ایسا بھی ہوا ہے کہ یہ دونوں عناصر نہ ہونے کے باوجود بھی انسانوں کو قحط کا شکار ہونا پڑا اور جانوں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ یقینی طور پر قحط کی ان دو اقسام میں تفریق ممکن ہے' جہاں ایک میں کوئی طبعی محرک کارفرما ہوتا ہے تو دوسرے میں سماجی اور معاشی تبدیلیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے لئے امریتا سین ۱۹۴۳ء میں بنگال میں پڑنے والے قحط کی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس قحط کا سبب قدرتی آفات سے زیادہ جنگی حالات اور ناموافق سرکاری پالیسیاں تھیں جبکہ اس کے مقابلے میں ۷۰ کی دہائی میں ایتھوپیا میں پڑنے والے قحط کا سبب محض خشک سالی تھی۔

قحط کو بہت حد تک ایک سماجی عمل قرار دیا جاسکتا ہے' امریتا سین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کیونکہ اس افتاد میں بہت سے لوگوں اور اداروں کی نااہلی کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ ناکامی اس وقت ظاہر ہوتی ہے کہ جب ادارے پانی اور خوراک کی صورت حال کو یکسر نظرانداز کرتے ہیں

یا اصلاحِ احوال کا کوئی راستہ نہیں نکال سکتے۔اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قحط کا باعث سیلاب ہو یا خشک سالی' لوگوں پر اس کے اثرات کا انحصار سماج اور سماج پر قادر طبقے کی سماجی تنظیم اور رویوں پر ہوتا ہے۔مثال کے طور پر جس سماج میں نہری نظام وسیع اور موثر ہو گا وہاں خشک سالی کے اثرات بہت کم ہوں گے یا ان کے اثرات کو بڑی آسانی سے بہت دیر تک قابو میں رکھا جا سکے گا۔امریتا سین اپنی تحقیق کی روشنی میں کہتے ہیں دنیا کے کئی صحرا انسان کی عاقبت نا اندیشانہ پالیسیوں اور سرگرمیوں کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر افریقہ کے استوائی خطوں میں محض موسمیاتی تبدیلیوں کو قحط اور خشک سالی کا سبب تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس خطے کے لوگوں کی روایتی پیاس اور بھوک کے اندازے سطحی طور پر لگائے جاتے ہیں اور وہاں اس مستقل آفت سے بچنے کے لئے کسی طرح کی منصوبہ بندی بروئے کار نہیں لائی گئی۔قحط اور خشک سالی کے لئے قدرت کو الزام دے کر ذمہ داری سے پہلو چھڑانا بہت آسان ہے مگر قدرتی آفات سے متعلق پیشگی اطلاع کا نظام وضع کر کے اور افتاد کی صورت میں پہلے سے تیار شدہ موثر منصوبہ بندی بروئے کار لا کر کسی بڑی مصیبت سے بچا جا سکتا ہے۔اس حوالے سے سماج کو بیدار کرنے میں ذرائع ابلاغ کا کردار بھی اہم ثابت ہوتا ہے۔

یہ کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی ' میں آپ کو ایک اور تصویر دکھاتا ہوں جو اقوامِ متحدہ نے اپنی ایک رپورٹ میں کھینچی ہے۔اس کے مطابق ۲۰۲۵ء تک دنیا کی کم و بیش ۸۱ رفیصد آبادی ترقی پذیر ملکوں میں مقیم ہو گی اور ایک اندازے کے مطابق دنیا کے ۶۰ فیصد افراد قحط' خشک سالی' سیلاب' شدید طوفانوں' زلزلوں اور قدرتی آفات کی زد میں ہوں گے۔اس صدی میں آبادی میں اضافے اور ترقی کے لئے بے پناہ دباؤ کے باعث خشک سالی کا اندیشہ پہلے سے بڑھ جائے گا۔رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے کہ اگر متوقع صورتِ حال سے بچنے کے لئے معقول پیش بندی اور ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کی گئی تو دنیا ایک بہت بڑے بحران سے دوچار ہو جائے گی۔خدشہ ہے کہ یہ بحران ترقی پذیر ملکوں میں کروڑوں انسانوں کو غربت' افلاس اور غیر یقینی کے اندھیروں میں دھکیل دے گا۔

گزشتہ کئی عشروں سے ایٹمی پھیلاؤ نے دنیا کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔اس کے حوالے سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ تاثر پختہ ہو چکا ہے کہ جوہری تجربے دنیا میں تابکاری کے اثرات پھیلانے کا سبب بنتے ہیں اور اس سے بڑے پیمانے پر موسموں اور ماحول میں تغیرات پیدا

ہوتے ہیں۔ ان تغیرات کے نتیجے میں دنیا کے صحرائی علاقوں میں خشک سالی آبادیوں کو بڑے پیمانے پر اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ لیکن جوہری سائنس سے وابستہ ماہرین کی اکثریت اس مفروضے سے قطعی اتفاق نہیں کرتی۔ ایٹمی سائنس دانوں کا موقف ہے کہ جوہری تجربے کسی طرح بھی تابکاری پھیلانے کا موجب نہیں بنتے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ تجربے حد درجہ احتیاط اور مخصوص ڈیزائن کے تابع ہوتے ہیں اس لئے تابکاری پھیلنے کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔

تھر کے المیے کو عالمی ذرائع ابلاغ بھی نظرانداز نہیں کر سکے۔ غیر ملکی اخبارات نے لکھا ہے کہ خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں زندگی نے اپنا دامن سمیٹ لیا ہے۔ لوگوں کی قوتِ خرید انتہائی کم ہوگئی ہے' انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے میں شدید مشکلات کا سامنا ہے۔ متاثرہ علاقوں میں روزگار کے مواقع نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ خاندان اور قبائل قافلوں کی شکل میں بڑے پیمانے پر ان علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں جہاں پانی دستیاب ہے۔ ان بارانی علاقوں میں زمینوں کی پیداواری صلاحیت ختم ہو کر رہ گئی ہے جس کی وجہ سے مویشیوں کی بقا اور افزائش بری طرح متاثر ہوئی ہے اور انسانی زندگی سنگین بحران کا شکار ہے۔ ان علاقوں میں بھیڑوں کا ۴۵ر سے ۵۵ر اور بکریوں کا ۳۰ر سے ۴۰ر فیصد نقصان دیکھنے میں آیا ہے جبکہ بڑے جانوروں کے نقصان کی شرح ۲۰ سے ۲۵ فیصد تک سامنے آئی ہے۔ اناج کی پیداوار میں بھی گزشتہ برسوں کے مقابلے پر ۲۰ سے ۲۵ فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ تھریوں میں ختم ہوتی قوتِ خرید نے خوراک اور غذا تک ان کی رسائی کے عمل کو بری طرح متاثر کیا ہے۔

صحرائے تھر میں خشک سالی کا یہ عمل گزشتہ دو دہائیوں سے جاری ہے اور سال بہ سال اس کی شدت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پچھلے تین برسوں میں تو صورتِ حال انتہائی ابتر ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا بنیادی سبب بارش کا کم ہونا یا بالکل نہ ہونا ہے۔ اس کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۹ء تک صرف نو برسوں میں تھرپارکر کو چار بار ۹۲۔۱۹۹۱ء اور ۹۴۔۱۹۹۳ء میں آفت زدہ علاقہ قرار دیا جا چکا ہے۔ اس خطے میں لوگوں کا ذریعہ معاش محدود پیمانے پر کھیتی باڑی اور بڑی حد تک گلہ بانی پر ہے۔ بارش نہ ہونے کے سبب یہ دونوں وسائل تھریوں کی دسترس سے دور ہو گئے ہیں۔

صحرائے تھر میں پڑنے والا قحط اور خشک سالی اپنے وجود کے دو پہلو لئے ہوئے ہے۔ ایک

طرف تو قدرت اس خطے پر نامہربان ہے تو دوسری طرف مقتدر اداروں کی طرف سے پیشگی یا آفت کی صورت میں ٹھوس منصوبہ بندی کے حوالے سے اسے مجرمانہ حد تک نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ میں یہاں قحط اور خشک سالی شروع ہونے کے ۵۰ دن بعد پہنچا ہوں۔ اب تو یہاں تباہ کاری اپنا کام دکھا چکی ہے۔ مجھے ہر طرف مرے ہوئے انسانوں اور جانوروں کی سڑاند محسوس ہو رہی ہے مگر دور دور تک حکومتی مشینری' تھر کے نام پر سیاست چمکانے والی تنظیموں اور این جی اوز کا وجود تک نظر نہیں آیا اور نہ ہی کوئی ارباب' کوئی لاٹ اور رانا ان کی مدد کے لئے میدان میں آیا ہے۔ ان وڈیروں کو صرف ان کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے' انتخابات کے بعد یہ مخلوق کراچی' اسلام آباد یا بیرونِ ملک پائی جاتی ہے۔ بڑھتی ہوئی آفات اور مصائب کے باوجود سرکار کا کردار نا قابلِ فہم اور قابلِ گرفت ہے۔ اسے بھی ان لوگوں کی تکالیف کا کما حقہ ادراک نہیں ہے۔

میں نے اپنے صحرائے تھر کے اس لمبے سفر میں جا بہ جا بیمار' مدقوق چہروں والے گھسٹتے انسان' چلتی پھرتی زندہ لاشیں اور مردہ جانوروں کے ڈھانچے بکھرے دیکھے ہیں۔ مجھے یہ مناظر دیکھ کر خدا یاد آ گیا ہے۔ میں سوچ رہا ہوں میری قدرت میں جو کچھ ہے وہ ان متاثرین پر نچھاور کر دوں مگر میرا دامن بھی خالی ہے' میرے قبضہ قدرت میں بھی کچھ کوششوں' ناکامیوں اور خوابوں کے سوا ہے ہی کیا؟ میرے پاس انہیں دینے کے لئے صرف دعائیں اور تسلیاں ہیں لیکن میری دعاؤں اور تسلیوں سے ان کا پیٹ تو بھرنے سے رہا۔ مجھے اپنی بے چارگی پر خفت ہو رہی ہے۔

آ کہ رو لیں دیارِ دشت وجبل
اپنی قسمت میں نوحہ خوانی ہے
تیری ویران راہ گزاروں سے
ملتی جلتی مری کہانی ہے



صحرائے تھر کی دہلیز پر دستک

کچی پکی سڑکوں اور عمارتوں کا شہر مٹھی صحرائے تھر کا دل گردانا جاتا ہے۔ یہ شہروں جیسا شہر تو نہیں مگر تھریوں کے لئے جنت سے کم نہیں۔ ہر تھری یہاں رہائش کے خواب آنکھوں میں سجائے رہتا ہے۔ قدیم دیو مالائی قصوں میں مذکور شہروں کی مانند یہ کوئی عروس البلاد نہیں' نہ تو یہاں نگار خانے ہیں نہ پریاں اور نہ میخانے' ایک ٹیڑھا میڑھا سا' میلا کچیلا سا قدیم بازار ہے جو مرکزی شاہراہ کو اپنی طویل بانہوں میں لئے سسک رہا ہے۔ دھول اڑاتی یہ شاہراہ تاریخی شہر مٹھی کو چیرتی ہوئی اسلام کوٹ' ڈانو دھاندل اور ویرا واہ کے راستے سرحدی شہر ''ننگر پارکر'' کے پاؤں جا پڑتی ہے۔ قدیم زمانے میں مٹھی ایک بہت بڑا گاؤں تھا جو بتدریج ایک دیہی شہر اور قابلِ ذکر تجارتی مرکز کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ ہر دو قدم پر جھونپڑہ ہوٹل اور موسیقی کے مراکز یہاں گہما گہمی کا بہت بڑا ذریعہ بنے ہوئے ہیں جہاں ہر وقت تھر کے گیت گونجتے رہتے ہیں اور گاہکوں کا رش لگا رہتا ہے۔ ہم نے بھی انہی ہوٹلوں میں سے ایک جھونپڑا ہوٹل میں' چارپائیوں پر بیٹھ کر کڑک چائے کی چسکیاں لیں اور تھر کے وڈیروں اور سیاست دانوں کے خوب لتے لئے۔ لباس اور وضع قطع سے الگ دکھائی دینے کے سبب ہم لوگوں کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ زیادہ تر ہوٹلوں پر تھر کی کوئل مائی بھاگی کے گیت چل رہے ہیں۔

سندھ کی عظیم لوک گلوکارہ مائی بھاگی بھی عہد جدید میں تھر کی شناخت بن گئی ہے۔ مائی بھاگی کا تعلق ڈیپلو کے ایک منگنہار قبیلے سے تھا۔ گائیکی انہیں ورثے میں ملی۔ وہ چھوٹی عمر ہی میں

تھر کے لوک گیت گانے لگیں۔ جب ان کی آواز ڈیپلو کے گوٹھوں سے نکل کر مٹھی پہنچی تو لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور انہیں مشورہ دیا کہ وہ تھر کے صدر مقام مٹھی منتقل ہو جائیں۔ وہ ڈیپلو کو خیر باد کہہ کر مٹھی میں رہائش پذیر ہو گئیں۔ اس شہر نے انہیں ایک معروف گلوکارہ کے طور پر شہرت دلوانے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ برسوں اس شہر میں رہیں اور اپنی آواز کا جادو جگاتی رہیں' اسی شہر نے انہیں عالمی سطح پر متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ عمر کے آخری حصے میں نوکوٹ چلی گئیں اور وہیں وفات پائی۔ تھر میں اب بھی ان کے گائے ہوئے گیت شوق سے سنے جاتے ہیں۔

خواجہ غلام فرید کی کافی کو ان کی وفات کے بعد جس عقیدت اور جذب کے ساتھ زاہدہ پروین نے گایا ہے' وہ اعزاز وسیب یا پاکستان کے کسی اور گلوکار یا گلوکارہ کو حاصل نہیں ہو سکا۔ زاہدہ پروین اگر روہی کی کوک تھی تو مائی بھاگی تھر کی کوئل۔ مائی بھاگی کا وجود نہ ہوتا تو سندھ کی لوک گائیکی کا دامن بھی خالی خالی محسوس ہوتا۔ مرشد فرید اس سفر میں میرے ساتھ ساتھ ہے تو زاہدہ پروین کی آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی ہے لیکن میں تھر میں ہوں اور میرا جی مائی بھاگی کو سننے کو مچل رہا ہے۔ شاہ لطیف کی سورمی جدید سندھ کی ہیروئن' ملیر کی ماروی کے نام پر اکثر دوکانوں اور ہوٹلوں کے نام بھی رکھے جاتے ہیں اور شہید بے نظیر بھٹو کو بھی ملیر کی ماروی کہا جاتا ہے۔ ہم جہاں بیٹھے چائے پی رہے ہیں یہ ہوٹل بھی ماروی سے منسوب ہے۔ ماروی ہوٹل پر اس وقت جلال چانڈیو کا گیت چل رہا ہے۔ میں نے ہوٹل والے سے درخواست کی کہ اگر ممکن ہو تو وہ مائی بھاگی کی کیسٹ چلا دے۔ اس نے خوش دلی سے کہا کہ کیوں نہیں؟ وہ تیزی سے پلٹا اور چند ہی لمحوں میں تھری کوئل کی کوک نے ایک سماں باندھ دیا:

کھڑی نیم کے نیچے ھوں تو ھیکلی
جا توڑا وٹاڑو مناں چھنی منی دیکھلے
جھر ہر جھر ہر میھولا برسے پون ھلولا کھائے
مور پپیھر میٹھا بولیں ' کوئل شور مچائے
ھوں تناپچھاں چھیل بھریا ھیکلی
جا توڑا وٹاڑو مناں چھنی منی دیکھلے

ترجمہ: میں نیم کے درخت کے نیچے اکیلی (اداس) کھڑی ہوں۔ اے راہ گیر و میری

پریشانی اور حالت زار میرے محبوب تک پہنچا دینا۔ رم جھم رم جھم بارش ہو رہی ہے اور ہوا ہے کہ ہچکولے لے رہی ہے۔ ایسے (مست موسم) میں مور، پپیہے سریلے گیت گا رہے ہیں اور کوئل شور مچا رہی ہے۔ مگر میں ان سب چیزوں سے بے نیاز محبوب کی راہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں راہ گیروں سے تیرا پوچھ رہی ہوں۔ اے راہ گیرو میری پریشانی اور حالت زار میرے محبوب تک پہنچا دینا۔

اوٹے پڑیو ڑی رینگڑونی رڑیو رڑیو جائے
ساسو جی تھارو چھیل بھمر یو، ماساں ڈریو جائے
ہوں تناپچھاں چھیل بھمریا ہیکلی
جا توڑا وٹاڑو مناں چھنی منی دیکھلے

ترجمہ: صحن میں جس طرح بینگن رینگتا لڑھکتا جاتا ہے۔ ساسو جی تمہارا لاڈلا بھی مجھ سے ایسے ہی دور بھاگ رہا ہے۔ مگر میں ان سب چیزوں سے بے نیاز اپنے محبوب کی راہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں راہ گیروں سے تیرا پوچھ رہی ہوں۔ اے راہ گیرو (جا کر) میری پریشانی اور حالت زار میرے محبوب تک پہنچا دینا۔

اوچی نڑی اونجڑی نی، مھیں لونباڑی کھاٹ
رن میں ڈھولیو پوڈیانی سگھن سیاڑری رات
ہوں تنا پچھاں چھیل بھمریا ہیکلی
جا توڑا وٹاڑو مناں چھنی منی دیکھلے

ترجمہ: اونچی اور سفید خوب صورت ماڑی (عمارت) میں خوبصورت طریقے سے سجی چارپائی بچھی ہے۔ جس پر میرا محبوب مست مست سرد راتوں میں سو رہا ہے۔ مگر میں ان سب چیزوں سے بے نیاز محبوب کی راہیں دیکھ رہی ہوں۔ میں راہ گیروں سے تیرا پوچھ رہی ہوں۔ اے راہ گیرو میری پریشانی اور حالت زار میرے محبوب تک پہنچا دینا۔

تھری کوئل کی مدبھری آواز نے ہمیں مسحور کر دیا ہے۔ مائی بھاگی کے گیت سن کر ہم سب مچل اٹھے ہیں۔ دودو تو چہچہا رہا ہے۔ تھری لوک گیت کے ایک ایک بول کے ساتھ وہ مجھے اس کا ترجمہ کر کے سنا رہا ہے۔ یہ گیت مائی بھاگی کی زندگی ہی میں سندھ کی کئی اور خواتین گلوکاراؤں نے گایا مگر جو مقبولیت مائی بھاگی کے حصے میں آئی وہ کسی اور کا مقدر نہیں بن سکی البتہ یہی تھری لوک

گیت جب روہی کے درویش گلوکار آں جہانی فقیرے بھگت نے مائی بھاگی کی عقیدت میں یک تارے اور چپڑی کے ساتھ گایا تو لوگ جھوم اٹھے۔

تھر کے لوک گیتوں کا ذکر چلا ہے تو ایک دو گیت اور آپ کی نذر کرتا چلوں جن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ ریگستانی شاعری کے رنگ کتنے اجلے اجلے اور دل کو موہ لینے والے ہیں۔ پہلا گیت ''ونجارو'' (بنجارہ) ہے۔ تھر کا یہ گیت موضوع اور جذبے کے اعتبار سے فراقیہ گیت ہے اور تھر میں کافی مقبول ہے۔ تھری لہجے میں موزوں کردہ یہ لوک گیت راگنی سورٹھ میں گایا جاتا ہے۔

تھلے متھے پیپڑی
جکھی ری چھایا میں بیٹھا مور
اونچی میڑھی اوجڑی
مینھان لوباڑی کھاٹ
ڈن ناں ڈھولو پوڈیا
سکھن سیاڑی ری رات
ہائے ونجارو بالم رے

ترجمہ: آنگن میں پیپل کی چھایا میں بیٹھے ہیں مور' اونچے اور سفید محلات میں چھپر کھٹ ہے' ڈھولا اور اس کا ریوڑ آرام کر رہے ہیں' جاڑے کی رات ہے' ہائے بنجارہ بالم رے۔

منھیار: محبت کے سچے جذبوں سے لبریز یہ لوک گیت پورے تھر میں مقبول ہے۔ اس کا پس منظر ایک عشقیہ داستان ہے جس کا تعلق زیریں سندھ کے شہر راحموکی بازار سے ہے۔ کہانی کچھ اس طرح ہے کہ ایک پردیسی بیوپاری راحموکی بازار میں ہار سنگھار اور خواتین کی آرائشی چیزیں فروخت کرتا تھا۔ یہیں اس کی ملاقات ایک لڑکی سونل سے ہوئی جو وقت کے ساتھ ساتھ عشق میں بدل گئی۔ جب یہ سوداگر اپنا سامان فروخت کر چکا تو دوسرے سوداگروں کے ساتھ وطن لوٹ گیا۔ اس کی محبوبہ نے اسے روکنے کے بڑے جتن کئے لیکن وہ نہیں رکا۔ اس فراق نے تھری لہجے کے اس گیت کو جنم دیا جو آج بھی زبان زدِ عام ہے:

لاگت گوری رو نینھڑو
پردیسی منھیار

منھیارو گورل رو
جانکڑیاں موچھاں رو منھیار
ھالو تاں سھیلڑیاں ری
جھولڑی ھالی جوآں منھیار
جنم ڈنو منھیاری ماتاڑی
روپ ڈنو کلتار

ترجمہ: گوری کو پردیسی منھیار سے پیار ہو گیا۔ گوری کا منھیار موچھوں والا تھا۔ اے سہیلیو چلو چل کر دیکھیں، منھیار کو جنم ماں نے دیا اور روپ خدا نے۔

کانگڑو: کانگ (کوا) کی تصغیر ہے۔ کوے کو مختلف زبانوں کی شاعری میں پیغامبر کے طور پر لایا گیا ہے۔ ہندی، سندھی اور سرائیکی زبانوں میں تو کوا ایک قاصد کے طور پر مسلمہ پرندہ ہے۔ یہ لوک گیت تھر کے علاوہ سندھ کے کئی اور علاقوں میں بھی گایا جاتا ہے۔ اس میں محبت اور مجاز کے علاوہ بھی کئی مضامین قلم بند کئے گئے ہیں۔ کہیں ایک شادی شدہ لڑکی کے جذبات ہیں جو میکے کی یاد کو تازہ کرتے ہیں۔ یہ گیت عام طور پر شادی بیاہ میں گایا جاتا ہے۔

ہیٹھ ڈھنڈ مچھی مری ، متھانس میانی
اُج ناں مرندی تاں پیاں پریں ری پانی
منھنجو اج وھیٹو کانگل جانی
لئو صبحا ، لئو صبحا
موں جیڈین وچ میں سونو بھارو
سوری سوری چھڈیاں ، پر ھینڑو ویچارو
منھنجو کھوڑ دھیتو کانگڑو
لئو صبحا ، لئو صبحا

ترجمہ: نیچے جھیل میں مچھلی کا شکار، اوپر میانی۔ پیاسی کبھی نہ پیوں محبوب کے بغیر پانی۔ میرا پیا سا ہے کانگل جانی، صبح صبح بولی بول۔ میرے اور سہیلیوں کے درمیان سونے کا جھاڑو، جھاڑو دیتی رہوں پر ہائے میرا دل، میرا پیارا ہے کانگل، صبح صبح بولی بول۔

مٹھی کے ہوٹلوں پر بھی دھلے ان دھلے کپڑوں میں ملبوس تھریوں کا جمگھٹا رہتا ہے جہاں وہ چائے کی چسکیوں کے ساتھ سیاست پر بحث مباحثے کا چسکا لیتے رہتے ہیں۔ ہر ہوٹل پر کہیں نہ کہیں ٹوٹی پھوٹی سندھی میں لکھا ہوا ہے:

''یہاں نشہ کرنا اور سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔''

سیاسی اصولوں کے تابع اور سیاسی کوششوں کے نتیجے میں حاصل ہونے والے ملک میں سیاست کو نشے کی طرح وبال اور قابل نفرت سمجھا جاتا ہے۔ جھوٹ، مکروفریب اور ریا کاری کا دوسرا نام سیاست بنا دیا گیا ہے مگر اس ملک کے عوام ساٹھ سال سے جاری اس پروپیگنڈے کے فریب میں نہیں آئے اور اب بھی سیاست کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یہاں بیٹھے لوگ بھی اس انتباہ کو خوش گپیوں اور دھوئیں کے مرغولوں میں اڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ سیاسی گفتگو انہیں جھونپڑہ ہوٹلوں میں چھڑی رہتی ہے۔ دوسرا ان ہوٹلوں میں منی سینما قائم ہیں جہاں سارا سال نئی پُرانی بھارتی فلموں کی نمائش جاری رہتی ہے۔ ایک چائے کی پیالی کے عوض ایک فلم، ہوٹل والوں کا خوب دھندہ چلتا رہتا ہے۔ لگتا ہے مٹھی کی پوری آبادی گھروں سے بازاروں میں امڈ آئی ہے۔

ہم یہاں تماشا بنے ہوئے ہیں۔ لوگ رک رک کر ہمیں دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے اور آگے نکل جاتے۔ ہمیں خود پر عجیب الخلقت ہونے کا گمان گزر رہا تھا۔ ہمیں یہ عجیب لگ رہا تھا مگر یہ ان لوگوں کی عادت سی ہے۔ جہاں کہیں کسی اجنبی کو دیکھا، جمع ہو گئے اور گھیر لیا۔ ہم بھی اس وقت لڑکوں کے ایک بے ضرر اجتماع میں گھرے ہوئے تھے۔ دو دو چانڈیو اِن معصوموں پر برس پڑا۔

''چھوڑ یار! تیرا کیا جا رہا ہے؟ جانے دے، دیکھ رہے ہیں کہ یہ نئی مخلوق کہاں سے آئی ہے، انہیں دیکھنے دے۔ ہمارا کیا بگاڑ رہے ہیں بے چارے، انہیں اپنا من راضی کرنے دے۔''

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارے میزبانوں نے بتایا کہ ہمارا ٹھکانہ، جہاں ہم نے رات بسر کرنی ہے، بس چند ہی قدموں پر ہے۔ ہم نے ہوٹل سے بسیرے کی جگہ تک چہل قدمی کا فیصلہ کیا مگر یہ چند قدم تھے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ سندھی اور سرائیکی سماج کا ''سڈ پندھ'' (آواز کی حد تک کا فاصلہ) یا ''لیلے باک'' یعنی جہاں تک بکری کے بچے کی آواز سنائی دیتی ہے، کافی تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں مگر فاصلہ نہیں سمٹتا۔ ''لیلے باک'' پر سرائیکی کے نامور محقق ظامی بہاول پوری مرحوم نے ایک بہت خوب صورت مضمون بھی لکھا

تھا۔ چلتے چلتے ہماری ٹانگیں بھی جواب دے گئیں مگر میزبانوں کی طفل تسلیاں ''وہ رہی اوطاق'' ''بس وہ سامنے رہی اوطاق'' ہماری برداشت سے باہر ہوگئیں۔ ہم ٹانگیں سیدھی کرنے کے لئے پیدل چلے تھے مگر اب تو ٹانگیں اکڑ گئیں۔

خدا خدا کر کے وہ اوطاق آپہنچی کہ جسے رات بھر کے لئے ہمیں اپنی امان میں لینا تھا۔ اوطاق کیا تھی' اچھی خاصی وسیع وعریض حویلی تھی جسے مہمان خانہ کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ ایسی اوطاقیں عام طور وڈیروں کی ہوتی ہیں جسے وہ دیرے داری اور مہمان داری کے علاوہ پنچائتوں کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ زیادہ تر یہ اوطاقیں وڈیروں کے گھروں سے ہی جڑی ہوئی ہوتی ہیں اور ایک راستہ اوطاق سے رہائشی حصے کو جاتا ہے۔ سندھ میں جتنا بڑا وڈیرا ہوگا اتنی بڑی اس کی اوطاق ہوگی۔ کئی ایک نے تو سرکاری اسکولوں' مراکز صحت اور ڈاک بنگلوں کو اپنی ذاتی اوطاقوں میں تبدیل کر رکھا ہے۔

یہاں ایسے کئی وڈیرے ہیں جو ایک قطعہ ارضی حکومت کو اسکول کے لئے دان کرتے ہیں' بڑی واہ واہ ہوتی ہے کہ سائیں نے اسکول کے لئے زمین وقف کی ہے۔ حکومت لاکھوں خرچ کر کے وہاں پختہ عمارت تعمیر کراتی ہے۔ آغاز میں اسکول بھی کھلتا ہے اور پھر وہ عمارت دیکھتے ہی دیکھتے وڈیرے کی اوطاق بن جاتی ہے۔ میرے دوست الطاف مجاہد کی ایسے معاملات پر گہری نظر ہے' ان کا دعویٰ ہے کہ سندھ میں بلا مبالغہ ایسے سیکڑوں اسکول ہیں جن پر وڈیرے اور زمیندار قابض ہیں اور وہاں انہوں نے اپنی اوطاقیں قائم کر رکھی ہیں۔ یہ جاگیردارانہ سماج کا کڑوا سچ ہے کہ عام طور پر وڈیرا آج بھی اپنے علاقوں میں نہ تو اسکول کھلنے دیتا ہے اور نہ سڑکیں بننے دیتا ہے کہ کہیں ہاریوں اور ان کے زیرِ اثر لوگوں کی اولادیں پڑھ لکھ کر ان کے مقابل نہ آن کھڑی ہوں۔ یہ لوگ زیرِ دست طبقوں کو روشنی اور رسائی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ وڈیرے اپنی اولاد کو علاج اور تعلیم کے لئے بیرونِ ملک بھجواتے ہیں مگر ان کی رعایا کو صحت اور تعلیم کی یہ سہولتیں معمولی مقدار میں مقامی طور پر بھی میسر نہیں۔

اوطاق میں گھستے ہی ''جھولے لال'' کے نعرے گونج اٹھے:

''بولے حق پک فضل پنجتن یا علی

یا اللہ یا محمد ﷺ یا علی

قادرِ قلندر رہو.....''

سارے دن کے تھکے ہارے مسافر کمروں میں سلیقے سے فرش پر بچھے بستروں میں جا دبکے۔ میزبان مہمانوں کی شوخیوں اور اداؤں پر دل وجان سے فدا ہیں کہ یہی اہل سندھ کا شیوہ ہے۔ غریب سے غریب میزبان اپنا آپ بیچ کر مہمان پر نچھاور کر دے گا۔ ذرا سا ستانے کے بعد ہم دوبارہ اٹھ بیٹھے۔ جس محفل میں دودو جیسا زندہ دل اور چلبلا ہو تو دوسرے بھی اپنے آپ میں نہیں رہتے' ایسے میں چین کی رین کہاں؟ پھر وہی قصے کہانیاں' جگت بازی' ٹھٹھا مخول۔ باتوں ہی باتوں میں کبھی کبھی تھر میں پیاس وافلاس اور زندگی وموت کے کھیل کا ذکر چھڑتا تو زبانیں لڑکھڑانے لگتیں۔ اس ناخوشگوار ذکر سے پیدا ہونے والی اداسی پورے ماحول پر حاوی ہو جاتی تو سب کے سب مرجھا جاتے۔ ایک گہرا سکوت ہمارے قہقہوں کی گردن دبوچ لیتا ہے۔ ہم ان مختصر سی ساعتوں میں کئی بار سانسیں لینا بھول گئے۔ سلام ہے جفاکش اہلیانِ تھر پر' جو روز جیتے ہیں' روز مرتے ہیں' یہ کہانی نہیں حقیقت ہے۔ ہم نے اسی ماحول میں رات کا کھانا کھایا۔ باتوں کے ساتھ گھاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ تھر کا نوحہ ہمارے اس سفر میں ہمارے ساتھ ساتھ رہے گا مگر میں یہاں آپ کو اپنے میزبانوں میں سے ایک قادر ڈنو کی زبانی اپنے آج کے میزبان شہر مٹھی کا مختصر سا تعارف پیش کرتا چلوں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ میری درخواست پر مٹھی کے بارے میں تفصیلات بتانے پر آمادہ ہو گیا۔

''ضلع تھرپارکر کا صدر مقام مٹھی ایک زمانے میں بہت بڑا گاؤں تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ کم وبیش آٹھ سو سال قبل یہ گاؤں موجودہ شہر سے ذرا پرے شمال کی طرف ریگ زار میں گھرے ایک دیوہیکل خشتی ٹیلے پر آباد تھا۔ اس ٹیلے کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ جب کبھی برکھا کی رانی تھر پر مہربان ہوتی ہے تو بارش میں مٹی کا تودہ بہنے بکھرنے سے ان آثار سے اینٹیں' مٹی کے ٹوٹے پھوٹے برتن اور دوسری اشیا دریافت ہوتی رہتی ہیں۔ اس گاؤں کی بنیاد کب اور کیسے پڑی اور اس کا نام مٹھی کیوں اور کیسے پڑا اس حوالے سے تاریخ کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتی لیکن کچھ روایات ہیں جو مختلف اندازوں اور قیاس آرائیوں کے ذریعے حقیقت کے قریب پہنچنے تک معاونت فراہم کرتی ہیں۔ انہی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اس گاؤں کا نام ایک نیک نام خاتون ''مٹھاں'' سے منسوب ہے جو کمہاروں کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ خاتون غریب مگر ذہین' زیرک' حسن و

اخلاق میں بے مثال اور مہمان نوازی میں لاثانی تھی۔مٹھاں نے اس ٹیلے پر اپنے وسائل سے کنواں کھدوایا۔تھر میں جہاں کہیں پانی کے وسائل میسر ہوتے ہیں تو اردگرد سے لوگ آ کر وہاں آباد ہو جاتے ہیں۔مٹھاں کے کھدوائے ہوئے کنوئیں کی کشش بھی بہت سے لوگوں کو قریب کھینچ لائی اور آہستہ آہستہ یہاں ایک بڑا گاؤں آباد ہو گیا جو''مٹھاں کے گاؤں''اور پھر مٹھی کے نام سے مشہور ہو گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک غیر منظم مگر بڑے شہر کی شکل اختیار کر گیا۔

کچھ روایات میں ہے کہ مائی مٹھاں کا تعلق کمہاروں کے قبیلے سے تھا جبکہ بعض روایات میں ہے کہ وہ''بجیر'' قبیلے سے تھی۔اس سے قطع نظر کہ وہ کمہار قبیلے سے تھی یا بجیر قبیلے سے' تاریخ نے اسے اس کے اوصاف کے باوصف امر کر دیا۔کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس شہر کی بنیاد ۲۰۰ء میں تھر پارکر کے حکمران راجہ میگھ نے رکھی مگر مورخین اس روایت کو مستند قرار نہیں دیتے۔تاریخ داں رائے چند ہریجن اپنی کتاب''تاریخِ ریگستان''میں رقم طراز ہیں کہ مٹھی تھر پارکر کا سب سے نمایاں اور بڑا شہر ہے جہاں درجنوں قبائل آباد ہیں جن میں غیر مسلموں کی بڑی آبادی شامل ہے۔غیر مسلم قبائل میں برہمن' میگھواڑ' کراڑ' کرڑا' مونارا' مالہی' کولہی' لوہانا اور کھٹی یعنی کھتری جبکہ مسلم قبائل میں ارکاسائی' بجیر' پیجارا' خاصخیلی' حجم یعنی حجام اور منگن ہار قابلِ ذکر ہیں۔

اس شہر کی قدامت کا اندازہ اس کے آثار سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ابھی تک موجود ہیں۔شہر کے مغرب میں قدیم علاقہ مٹھی کی تاریخی اہمیت کی زندہ شہادت ہے۔یہاں گڑھی بھٹ پر قلعہ تھا اور مٹھی میں دوسرا قلعہ اس مقام پر تھا جہاں آج کل سیشن کورٹ قائم ہے۔مٹھی ہر دور میں جنگجوؤں اور طالع آزماؤں کے لئے ترغیب اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔کئی نامور فاتحین اہلِ مٹھی کو میزبانی کا موقع دیئے بغیر نہ پلٹے نہ آگے بڑھے۔میر فتح علی خان تالپور نے سندھ فتح کرنے کے بعد اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے تھر کی طرف قدم بڑھائے۔میروں نے جب تھر پارکر پر حلہ بولا اور اس مہم میں انہیں مٹھی شہر پر فتحیابی ہوئی تو انہوں نے اس کا نام''فتح گڑھ''رکھ دیا۔میر فتح علی خان نے ۱۷۸۰ء میں یہاں جنگی حکمتِ عملی کے تحت مضبوط قلعہ تعمیر کرایا۔۱۷۸۹ء میں شہر کی شرقی سمت میں ایک بڑے ٹیلے پر مورچے کے طور پر ایک اور چھوٹا سا قلعہ تعمیر کرایا جو بتایا جاتا ہے کہ ۱۸۴۴ء میں زلزلے کی بھینٹ چڑھ گیا۔تخت وتاج کے متوالے میروں کا ستارہ عروج پر تھا' وہ مٹھی شہر پر غلبہ حاصل کرنے میں کامیاب رہے مگر وہ خدا ترس مائی مٹھاں کا نام مٹانے سے معذور

رہے۔ نئے نام کو سماج نے قبولیت نہیں دی، فتح گڑھ تاریخ کے اندھیروں میں غرق ہو گیا مٹھی آج بھی مٹھی ہے، زندہ اور روشن۔''

شہروں کے نام اپنے اندر ایک مکمل تاریخ سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ صرف نام نہیں رہ جاتے بلکہ تاریخ بن جاتے ہیں اور تاریخ بدلنے سے اور بھی بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ آج کل نواب شاہ کا نام بدلنے کا فیصلہ بھی شاید ایسا ہی فیصلہ ہو۔ شہید رانی بے نظیر بھٹو جیسی عظیم رہنما کے نام پر ایک نیا شہر بسایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ خود ایک تاریخ ساز شخصیت تھیں مگر ان کا نام تاریخ بدلنے کے لئے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ بعض اوقات عجلت میں کئے گئے سیاسی فیصلے مستقبل میں پشیمانی کا باعث بن جاتے ہیں۔

قادر ڈنو کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ مائی مٹھاں کے ذکر پر وہ جذبات سے مغلوب دکھائی دے رہا تھا۔ لوگوں کا اپنے ماضی سے کتنا گہرا رشتہ ہوتا ہے، اس کا اندازہ مجھے قادر ڈنو کی گفتگو سے بہ خوبی ہو رہا تھا۔ لوگ روایات اور لوک کہانیوں کے ذریعے اپنے بیتے کل سے جڑے رہتے ہیں اور اسے آنے والے کل کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ قادر ڈنو بھی اپنے بیتے ہوئے کل کے کندھے کے ساتھ کندھا جوڑے کھڑا ہے اور اسکی آنکھوں میں آنے والے کل کے جگنو جگمگا رہے ہیں۔ جب بھی وہ مٹھاں اور مٹھی کا ذکر کرتا ہے وہ بہت زیادہ پر جوش ہو جاتا ہے۔ اب وہ ماضی کے جھروکوں سے نکل کر حال کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ مٹھی کی داستان اسے کے ہونٹوں پر پھر مچلنے لگتی ہے:

''یوں تو تھر کی تقدیر بدلنے کے دعوے ہر حکومت کرتی رہی ہے مگر جو کام اسی کی دہائی میں محمد خان جونیجو کے دور میں ہوئے اس کی مثال نہیں ملتی۔ مٹھی تک پختہ سڑک کی تعمیر، فراہمی آب اور بجلی کی فراہمی کے منصوبے انہی کے دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ ان کی برطرفی کے بعد باقی ماندہ منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ تھر کے عوام محمد خان جونیجو مرحوم کا نام آج بھی عقیدت واحترام سے لیتے ہیں۔ کیوں نہ لیں، ان سے پہلے تو کوئی تھریوں کو انسان تسلیم کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھا، یہ محمد خان جونیجو مرحوم ہی تھے جنہوں نے پہلی بار تھر اور تھریوں کے دکھ کو سمجھا اور ان کے زخموں پر مرہم رکھا اور یہاں کئی منصوبے دیئے۔

مٹھی کو ۱۹۹۰ء میں ضلع تھر کے صدر مقام کا درجہ دیا گیا تو اس کے دن پھر گئے۔ پہلی بار

یہاں ڈپٹی کمشنر' اسسٹنٹ کمشنر' ایس پی' اینٹی کرپشن' تعلیم' صحت' سازدا' اور پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے دفاتر قائم ہوئے۔علاج معالجے کی سہولتوں کی فراہمی کے لئے تعلقہ اسپتال قائم کیا گیا۔اب یہ سول اسپتال کا درجہ حاصل کر چکا ہے مگر یہاں ابھی سہولتیں ضرورت کے مطابق موجود نہیں ہیں۔ضلع بھر سے مریض یہاں لائے جاتے ہیں طبی عملہ بھی محدود ہے جو مریضوں کی تعداد کے مطابق استعداد فراہم کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ادویات بھی اکثر ناپید رہتی ہیں۔کم آتی ہیں' جو آتی ہیں بدعنوان عملہ بیچ کھاتا ہے۔اکثر مریض اسپتال تک رسائی سے پہلے ہی موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔تھر کے شفاخانوں میں کوئی بھی کام کرنے کیلئے تیار نہیں۔میڈیکل کالجوں میں صحرائے تھر کا کوٹہ مقرر ہے۔ہر سال کئی طلبہ تھر کے کوٹے پر میڈیکل کالجوں میں داخلہ حاصل کرتے ہیں مگر جب ایم بی بی ایس کر لیتے ہیں تو کوئی ایک بھی تھر میں خدمات انجام دینے پر رضامند نہیں ہوتا' ان میں سے ہر ایک شہر میں کام کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔تھر کا نصیب یہی ہے' وقت آنے پر اپنے بھی منہ موڑ لیتے ہیں' حکمرانوں سے کوئی کیا شکوہ کرے انہیں تو اپنی پڑی رہتی ہے۔حکومتیں بنانے اور حکومتیں بچانے میں لگے رہتے ہیں۔

مٹھی ہنرمندوں' دستکاروں اور فنکاروں کا شہر ہے۔خوب صورت ظروف سازی اور قالین بافی کا کام عروج پر پہنچا ہوا ہے اور اس علاقے کی سوتی نواڑ' جو چارپائیاں بننے میں کام آتی ہے' بہت مشہور ہے۔مٹھی کی خواتین بھی ہنرمندی میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔وہ دیدہ زیب گلے کاڑھتی ہیں جو ملک کے دوسرے شہروں میں بہت مقبول ہیں جن کا انہیں بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔یہ کام مٹھی کے اکثر و بیشتر گھروں میں ہوتا ہے۔اگر حکومت یہاں منصوبہ بندی کرے تو دستکاری کا کام ایک بڑی صنعت کا روپ دھار سکتا ہے۔اس سے حکومت کو بھی آمدنی ہوگی اور تھر میں روزگار کے وسائل بھی میسر آ جائیں گے۔مگر کون ہے جو ہمارے دکھوں کا مداوا کرے' غریب تھر ایک اور محمد خان جونیجو کا منتظر ہے۔''

قادر ڈنو کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔یہ ادبی سانذرانہ ہے جو اس نے محمد خان جونیجو کی یاد میں چھلکایا۔میں قادر ڈنو سے مزید کچھ سننے کا خواہشمند تھا مگر میرے سارے مسافر دوست نیند کے ہاتھوں یرغمال بن چکے تھے۔ان کے خراٹوں کی آوازوں میں قادر ڈنو کی آواز دبتی چلی جا رہی تھی۔اس نے مہمانوں کے ڈھیر پر نظر دوڑائی اور اٹھ کھڑا ہوا اور سرگوشی میں صبح جلدی ملنے کا

کہہ کراوطاق سے اپنے گھر رخصت ہو گیا۔

''شب بخیر''۔ میں نے جواب دیااور طویل جماہیوں کے ساتھ بستر پر دراز ہو گیا۔

ہم گھوڑے بیچ کر سوتے رہے۔تھکاوٹ کی وجہ سے خوب گہری نیند آئی ۔گو کہ رات میں چند گھنٹے باقی تھے مگراس کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔علی الصباح ہمارے میز بانوں کی مداخلت پر بستروں کے ڈھیر میں جان پڑ گئی اور ایک ایک کر کے سارے دوست اٹھ بیٹھے۔

''کیا وقت ہوا ہے؟''۔تقریباً سب کی زبان پر یہ سوال اور نظریں دستی گھڑیوں پر تھیں۔ سورج طلوع ہو چکا تھااور ہمیں پروگرام کے مطابق ناشتہ کر کے صبح سویرے ہی نکلنا تھا۔ہماری نیند پوری نہیں ہوئی مگر سفر میں ادھوری نینداور آدھی غذا کے اپنے ہی فائدے ہیں۔ہمیں ناشتہ کر کے اسلام کوٹ کے راستے ننگر پارکر کا سفر اختیار کرنا ہے جہاں دھانو دھاندل اور ویراواہ کے درمیان بھالوا بھی جانا ہے' ماروی کے حضور حاضری کے لئے۔



ماروی سے مکالمہ

ماروؤں کے دیس میں آنا ہو تو آپ ماروی کے گوٹھ بھالوا اور اس کے شہرہ آفاق کنوئیں کی زیارت کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ تھر کے سرحدی شہر ننگر پارکر جاتے ہوئے ویراواہ سے چند کلو میٹر پہلے مٹھی روڈ سے ذرا سا ہٹ کے شاداب اور گھنے صحرائی درختوں میں گھرا یہ گاؤں شمع عشق کے پروانوں کے لئے بڑی عقیدت کا مرکز ہے۔ میری چاہت نے مجھے بھی ماروی سے ملے بغیر سفر جاری رکھنے سے روک دیا ہے۔ میری التجا پر افضل نے گاڑی کا رخ مرکزی سڑک سے بھالوا جانے والے کچے راستے کی طرف موڑ دیا جس کی طرف جمن نے اشارہ کیا ہے۔ اس راستے پر گاڑیوں کے مستقل نشان موجود ہیں جو بھالوا میں ''زائرین'' کی بڑے پیمانے پر آمد و رفت کی گواہی دیتے ہیں۔ لوئی کی لاج نبھانے والی ماروی کے دیس میں آ کر عاشقوں کے سر فخر سے بلند ہو جاتے ہیں۔ میرا سر بھی آسمان کو چھو رہا ہے۔ دھان پان سی ماروی نے عشق کے ماروں کا بھرم رکھ لیا ہے۔

میں نے جمن سومرو سے کہا کہ وہ ہماری رہنمائی کرے تاکہ ہم بھالوا میں اس کنوئیں کو دیکھ سکیں جہاں پانی بھرتے ہوئے وہ حاکمِ وقت عمر سومرو کی نظروں میں آ گئی تھی۔ جمن خود بھی سومرو ہے مگر اس کے نزدیک عمر سے زیادہ ماروی' دھرتی کا معتبر حوالہ ہے۔ سومرو قبائل کے افراد صدیوں سے اپنے سردار کی لغزش کا قرض اتارتے پھرتے ہیں۔ تخت اور تاج کے سامنے ماروی کے ایک انکار نے اسے ماروؤں کا دائمی اعتبار اور وقار بخش دیا ہے۔ وہ دھرتی سے لازوال محبت اور بالا دست قوتوں کے خلاف مزاحمت کا ایک بے مثال استعارہ ہے۔ شاہ لطیف تو ماروی کی استقامت پر دیوانہ وار فدا

ہے ہی' میرے مرشد فرید نے بھی اس لافانی کردار کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔

ہم ماروی کے گوٹھ میں داخل ہوئے تو فرید نے میرے دل اور دماغ کی کیفیت یکسر بدل دی ہے۔ میں اپنے آپ کو اڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ ہم تھوڑی ہی دیر میں ماروی کے تاریخی کنوئیں پر تھے۔ جمن سومرو نے مچل کر آواز لگائی:

''یہ رہا ماروی کا کنواں۔'' اس نے ایک کھنڈر کی طرف انگلی نچاتے ہوئے اور خودرو پودوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ہر طرف خاموشی اور ویرانی کا راج ہے۔ شدید قسم کی لُو چل رہی ہے۔ گرم و نرم ریت زمین کے وجود سے اٹھکھیلیاں کر رہی ہے۔ ہم ماروی کے ''ملک ملیر'' میں کھڑے ہیں جس کی چاہت میں اس نے سومرو تخت و تاج کو ٹھوکر ماردی تھی۔ چاروں جانب جانوروں کے ریوڑ گھوم رہے ہیں۔ یہیں وہ بھی سارا سارا دن بھیڑ بکریاں چرایا کرتی تھی۔ میں نہیں جانتا وہ کون تھی؟ کس قبیلے سے تعلق تھا؟ کس کی بیٹی تھی؟ تاریخ بھی اس حوالے سے خاموش ہے مگر ماروی کی ثابت قدمی اور دھرتی سے اٹوٹ رشتے نے اسے تاریخ میں امر کر دیا ہے۔ میں ماروی کے بارے میں سوچ رہا ہوں' مجھے مرکزی شاہراہ سے ہٹ کر عمر کوٹ کو جانے والے درمیانی راستے نے اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔ جمن سومرو نے مجھے بتایا:

''یہی وہ راستہ ہے جس راہ سے وہ ماروی کو لے کر گئے تھے۔ وہ سکھیوں کے ہمراہ کنوئیں پر پانی بھرنے آئی تھی' عمر سومرو اسے اچک کر لے گیا۔ اس کی سکھیاں' سہیلیاں دُہائیاں دیتی رہ گئیں' اسے ذرا بھی ترس نہیں آیا۔''

میں نے اپنی دائیں جانب دیکھا۔ وہاں مجھے اڑتی ریت کا غبار دکھائی دیا' ایسے لگتا تھا جیسے ابھی ابھی عمر سومرو اور اس کے ہتھیار بند' تھر ی غزال کو بندھنوں میں باندھ کر ٹیلوں میں روپوش ہو گئے ہیں۔ وہ چوروں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ ان کے برق رفتار اونٹوں اور گھوڑوں کے سُموں سے اُڑنے والی ریت اور دُھول کے بادل ابھی چھٹے نہیں۔ میں نے غصے اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔ میرے سامنے چند سو گز پر ماروی کا گوٹھ ہے جسے ہرے بھرے درختوں نے اپنی بانہوں میں لے رکھا ہے۔ درختوں میں دبکے بے آس پرندے گھٹاؤں کو ترس رہے ہیں۔ اتنی شدید گرمی میں مور اپنا ناچ اور پرندے چہچہانا بھی بھول گئے ہیں۔

میں نے چنوروں سے سجے آنگنوں کی طرف دیکھا جہاں ماروی نے اپنے ماہ و سال بتائے تھے۔ میں نے سوچا کبھی یہاں اس کے بچپن کی معصوم شرارتیں اور کبھی پُر شباب نقرئی قہقہے ماحول میں قوسِ قزح کے رنگ بکھیر دیتے ہوں گے۔ اب وہ یہاں نہیں ہے تو اس کے بغیر مجھے یہ گاؤں سُونا سُونا لگ رہا ہے۔ میں نے منڈیر پر پاؤں رکھ کر کنوئیں کے اندر جھانکا' وہاں مجھے ماروی کا عکس نظر آیا۔ کنوئیں میں زیادہ پانی نہیں ہے۔ حالیہ خشک سالی میں پانی کی سطح اوسطاً ۱۰۰ر فٹ نیچے چلی گئی ہے۔ کنوئیں میں موجود تھوڑے سے گدلے پانی نے ماروی کا عکس سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ ماروی کے حسن کا جادو ہے جو دیکھتی آنکھوں میں ہمیشہ کے لئے نقش ہو کر رہ گیا ہے۔ پانی سے لبالب بھرا مٹی کا گھڑا اٹھائے ماروی میرے روبرو کھڑی ہے۔ رہِ عشق کے مسافر کی اچانک پیاس بیدار ہوگئی ہے۔ میں پھر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔

میں نے خود کو بھالوا سے ۵۰ر کوس دور جودھ پور' حیدر آباد سڑک کے کنارے واقع قلعہ عمر کوٹ کے سامنے پایا۔ کچھ لوگ اسے امر کوٹ سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ وسیع و عریض قلعہ سومرو حکمران عمر نے چودھویں صدی عیسوی میں اپنے دورِ اقتدار میں تعمیر کرایا تھا۔ عمر سومرو ۱۳۵۵ء سے ۱۳۹۰ء تک ۳۵ر برس برسرِ اقتدار رہا۔ اس کی وفات کے نصف صدی بعد ہی سوڈھوں نے بزورِ طاقت سومروں سے قلعہ عمر کوٹ ہی نہیں ہتھیالیا' ان کے ۵۰۰ر سالہ اقتدار کا بھی ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔

۱۴ر مربع کلومیٹر پر پھیلا یہ قلعہ اپنی وسعت کے اعتبار سے سندھ کے کئی دیگر قلعوں اور کوٹوں سے بازی لے گیا ہے۔ اس کی دیوار ۱۰ر فٹ چوڑی اور ۵۲ر فٹ اونچی ہے۔ اس کے وسط میں بنے برج کا قطر ۵۶ر فٹ اور اونچائی ۳۰ر فٹ ہے جس پر سات دیو ہیکل توپیں نصب ہیں۔ اس کے علاوہ چار اور بڑے برج ہیں جو اس قلعہ کی عظمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ قلعہ ایک زمانے میں راجستھان سمیت عظیم سندھ کا صدر مقام رہا۔ یہ قلعہ کئی اہم تاریخی واقعات' تقریبات اور سانحات کا چشم دید گواہ ہے۔ تالپور حکمران ''شیر سندھ'' میر شیر محمد خان کو انگریزوں نے مفاہمت کے بعد ''ستارہ ہند'' کا خطاب اور تمغہ اسی قلعہ میں دیا تھا اور ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کی ۵۰ر سالہ تقریبات اسی قلعہ میں منائی گئی تھیں۔

اس قلعہ نے کئی نامور فاتحین کو خوش آمدید کہا' انہیں امان دی اور اگلے سفروں کے لئے ''زادِراہ'' بھی فراہم کیا۔ عمر کوٹ یا امر کوٹ کی چار باتیں ہند سندھ میں مشہور ہوئیں۔ یہاں کے

مرد عقلمند ہوتے ہیں۔ عورتیں حسن کا پیکر، ایسی حسین کہ حسن کو بھی شرما دیں۔ اس کا قلعہ شہرہ آفاق ہے اور اس کے تالاب کے کنارے برگد کے گھنے درختوں کی گھنی چھاؤں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گی۔ اس قلعہ کو مغل شہنشاہ ہمایوں کی میز بانی کا موقع بھی ملا۔ ۱۵۴۱ء میں ملکہ پر شاد سوڈھی کے دور حکومت میں ہمایوں جودھ پور کے راجہ کی بغاوت کچلنے کے لئے اس علاقے میں آیا تو اپنے منہ بولے بھائی مرزا ہندال سے ملنے تھر آیا۔ یہاں سوڈھا تخت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یہاں وہ مرزا ہندال کے استاد میر بابا دوست کی خوبرو بیٹی کو دل دے بیٹھا۔ کنول چہرہ حمیدہ کی ایک نظر نے شاہی مہمان ہمایوں کو گھائل کر دیا۔ میر بابا دوست کا تعلق شیخ احمد جام زندہ پیر کے خاندان سے ہے، انہیں اور ان کے خاندان کو صحرائے تھر میں بڑی عقیدت واحترام سے دیکھا جاتا ہے۔

مغلوں کے بارے میں مشہور تو ہے ہی کہ وہ جہاں جاتے ہیں داستانیں چھوڑ جاتے ہیں۔ ہمایوں نے بھی تھر میں قیام کے دوران ایک رومانی داستان رقم کی۔ عمروں کے واضح تفاوت کے باوجود اس کی حمیدہ بیگم سے محبت پروان چڑھی تو اس کی خبر ہر سو پھیل گئی۔ ہمایوں نے اس رشتے کے لئے اپنے منہ بولے بھائی مرزا ہندال سے بات چھیڑی مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اپنی سوتیلی ماں دلدار بیگم کو قائل کرنے میں کامیاب رہا جس کی کوششوں سے میر بابا دوست نے اپنے جگر کا ٹکڑا ہمایوں کے حوالے کرنے کی حامی بھر لی۔ ادھیڑ عمر ہمایوں اور ۱۴ سالہ حمیدہ بیگم کا یہ عشق بالآخر دونوں کی شادی پر منتج ہوا۔ یہ شادی ۱۵۴۱ء میں بڑی دھوم دھام سے اسی قلعہ کے قریبی گوٹھ پاٹ میں انجام پائی۔ قلعہ عمر کوٹ سے نظروں کے فاصلے پر اس محبت کے ثمر جلال الدین اکبر کی جائے پیدائش کے آثار میری نگاہوں کے سامنے ہیں جو بتدریج مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ ۵/رجب ۹۴۹ ہجری بمطابق ۲۳ نومبر ۱۵۴۲ء میں پیدا ہوا لیکن اس عہد کے سندھی مورخوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جلال الدین اکبر اسی قلعہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہی نومبر ہے کہ میں اس صحرا میں محو سفر ہوں۔

کچھ مورخین کا خیال ہے کہ جلال الدین اکبر کی جائے پیدائش قلعہ کی حدود ہی میں تھی مگر جب کلہوڑوں نے اس قلعہ کی تعمیر نو کرائی تو اکبر کی جائے پیدائش نئے کوٹ سے باہر رہ گئی۔ بعض روایات میں ہے کہ اکبر بادشاہ کی ولادت اسی قلعہ میں ہوئی تھی مگر اس کی ولادت کا نشان قلعہ سے ذرا سا دور تعمیر کیا گیا۔ اس میں کیا مصلحت تھی تاریخ بتانے سے قاصر ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے اس قلعے کے در و بام دیکھ رہا ہوں۔ اس کی عظمت نے مجھے اپنے سحر میں لے لیا ہے۔

میں مسلح دربانوں اور پہریداروں سے نظریں بچا کر قلعے میں داخل ہو گیا۔ میں نہتا اور پیاسا' بے ضرر مسافر ہوں' ان دربانوں کو مجھ سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہئے اور مجھے بھی ان ہتھیار بندوں سے کوئی خوف نہیں۔ میں اپنے قلم اور نوٹ بک کے وسیلے اس قلعہ کو فتح کرنے سے تو رہا۔ مجھے تو ماروی سے ملنے کی آس اتنی دور کھینچ لائی ہے جسے عمر سومرو نے بھالوا کے کنوئیں سے اغوا کر کے اسی قلعہ میں قید کر رکھا ہے۔ اس نے بہت جتن کئے ہیں مگر ماروی کو ورغلانے میں ناکام رہا ہے۔ اس نے اپنے برسوں پر محیط اقتدار میں کئی میدان مارے ہیں مگر عشق کے میدان میں اسے ابتدا ہی میں منہ کی کھانی پڑی ہے۔ ماروی کے انکار نے اس کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ کسی کا دل جیتنے کے لئے محض دولت اور طاقت کا ہونا کافی نہیں ہے۔ عمر سومرو کو اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اس کا عالی شان قلعہ محبوب کی بے رخی کے سبب اس کے لئے انگاروادی بن گیا ہے۔

ماروی تھری حسن کا شاہکار ہے۔ وہ پڑھی لکھی تو نہیں لیکن خدا نے اسے حسن کے ساتھ ساتھ حب الوطنی کی دولت سے نوازا ہے۔ اپنے منگیتر کھیت اور اپنی سرزمین تھر سے اس کی محبت ناقابلِ یقین حد تک مستحکم ہے۔ حاکمِ وقت عمر سومرو اس پیکرِ جمال پر فدا ہے۔ ایک اقرار ماروی کو تھر کے سیاہ وسفید کا مالک بنا سکتا ہے مگر وہ عمر کوٹ کے محل پر بھالوا کے چنوروں کو ترجیح دیتی ہے۔ عمر اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے مگر ماروی کھیت کی داسی بن کر اپنے ملک ملیر زندگی بتانا چاہتی ہے۔ اسے اپنی بھیڑ بکریاں' ریت رستے اور ٹیلے چنورے اور اپنی آبرو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اپنے پریں اور پیاروں کو یاد کر کر کے ہر سمے روتی رہتی ہے۔ شاہ لطیف کی روحانی واردات ماروی کی زبان پا کر کہتی ہے:

مجھ کو پیارے ملیر کی سوگند
جال میں تیرے میں نہ آؤں گی
اے عمر سوگوار آنکھوں سے
یونہی آنسو سدا بہاؤں گی
ڈال رکھی ہے سر پہ جو کملی
لاج اس کی نہ میں گنواؤں گی
چھوڑ کر ماروؤں کی بستی کو
چین ہر گز یہاں نہ پاؤں گی

لاکھ بھولے ہوں وہ مجھے لیکن
آس ان سے ہی میں لگاؤں گی
مجھ کو سولی ہے تیری سیج نہیں
جان پر اپنی کھیل جاؤں گی

میں قلعے کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک محیر العقول دنیا میرے سامنے ہے۔ میں فوجیوں اور غلاموں کی نظروں سے بچتا بچاتا اصطبل اور تالاب کے راستے عمر سومرو کے محل کے پائیں باغ جانکلا۔ عمر سرکش سوڈھوں کی بغاوت کچلنے کے لئے ایک مہم پر نکلا ہوا ہے۔ میرے لئے نادر موقع ہے کہ میں چوری چھپے ماروی سے مل کر اس کا حال جانوں۔ عمر نے اس پر کڑے پہرے بٹھا رکھے ہیں اور کسی میں ہمت نہیں ہے کہ وہ ماروی تک رسائی حاصل کر سکے۔ اس کے خاندان کے لوگ اس سے ملنے کے بڑے جتن کر چکے ہیں مگر ان کے آنسو، بین اور دہائیاں رائیگاں گئیں۔ عمر نے انہیں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ میں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ خطرہ مول لیا ہے۔ مجھے اس مقصد کے لئے دن ڈھلنے کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہاں کی چہل پہل نے مجھے مسحور کر دیا ہے۔ میرے اندر عمر سردار کا خوب صورت محل دیکھنے اور گھومنے کی خواہش مچل رہی ہے۔ میں نے پکڑے جانے کے خوف سے اس خواہش پر بمشکل قابو پایا اور خود کو اپنے مقصد تک محدود کر کے ایک جھاڑی میں چھپ کر سورج غروب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

یہ وسیع و عریض قلعہ اور عمر سومرو کا محل اپنے اندر بڑی رونقیں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ماروی کی دل لگی کے لئے عمر ہر قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہے۔ اس نے درجنوں کنیزیں اس کی خدمت پر مامور کر رکھی ہیں مگر وہ محل میں دستیاب تمام آسائشوں سے بے نیاز رہ کر اشک بار آنکھوں کے ساتھ چنوروں بھنوروں، ریگزاروں اور مارووں کے گیت گاتی رہتی ہے:

سوچتی ہوں ملیر میں شاید
ہو رہی ہوگی آج کل برسات
ہر طرف آج کل وہاں ہو گی
سبزیوں اور اناج کی بہتات
لیکن افسوس میری قسمت میں

ہیں یہی صرف چند احساسات
پیارے مارو کی راہ تکتی ہوں
بھیگی آنکھوں میں یوں ہی میں دن رات
مجھ کو بھولے ہوئے ہیں کیوں وہ لوگ
میرے آتے ہی ہو گئی کیا بات
کاش پھر ماروؤں میں لے جائے
کھینچ کر مجھ کو گردشِ حالات

عمر' ماروی کی اک ہاں کے لئے ترس رہا ہے اور ماروی اپنوں کے ہجر وفراق میں تڑپ رہی ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی طلب ہے۔ ایک اعصاب شکن کھیل' مدت ہوئی جاری ہے۔ نہ عمر کا ارادہ بدلا ہے نہ ماروی کے قدم ڈگمگائے ہیں۔ میں دن ڈھلے تک لُو اور پیاس سے بے نیاز پائیں باغ کی جھاڑیوں میں دبکا رہا۔ ماروی کو محل اور آسائشوں سے کوئی غرض نہیں تو عمر نے اس کا دل بہلانے کے لئے پائیں باغ میں ملیر جیسا ماحول دے رکھا ہے۔ وہی ریت' ٹیلے اور چنورے' انسانی ہاتھوں سے تخلیق کیا ہوا ایک منظر ہے جس کے اپنے رنگ ہیں۔ انہی ٹیلوں پر اور انہی چنوروں میں بیٹھ کر وہ دن رات آنسوؤں کے ہار پروتی رہتی ہے۔ میں نے اپنی نظریں انہی ٹیلوں اور چنوروں پر جما رکھی ہیں۔ میری نگاہوں میں ماروی کا پیکر سمایا ہے۔ میں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا ہوں۔ سارے دن کا تھکا ہارا سورج بلند قامت برجوں کی آڑ لے کر صحرا کی گود میں پناہ لے رہا ہے۔ ماروی نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے ڈھلتے سورج کو مخاطب کیا:

''اے میرے دن کی فرقتوں اور خلوتوں کے چشم دید گواہ! تو بتا کہ میرے پائے ثبات میں لغزش تو نہیں آئی؟ گواہ رہنا کہ میں نے آج کے دن بھی خود کو صحرا کی رعنائیوں سے آزاد نہیں کیا۔ میں نے آج کے دن بھی اپنے پیاروں کے حضور آنکھوں سے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا۔ گواہ رہنا کہ میرے دن کا کوئی پل اپنے موروں اور ماروؤں کی یاد سے خالی نہیں ہے۔ اے میرے روشنیوں کے دیوتا! انہیں بتا دینا کہ میں نے باطنی روشنی کے عوض ظاہری بے نور اجالوں سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور صبح جب بھالوا کے ریگزاروں پر روشنیاں بکھیرنا تو میرے پیاروں کو پیام دینا کہ تمہاری ماروی تمہارے بغیر انگاروں پر لوٹ رہی ہے۔'' طویل

مسافتوں کے مارے سورج میں مزید کچھ سننے کی تاب نہیں ہے۔ ماروی کی صدائیں صحرا کے سینے میں اتر رہی ہیں' ڈھلمل سورج نے ٹپٹا کر ٹیلوں میں منہ چھپالیا۔

سورج غروب ہوتے ہی نوبت بجی اور قلعے کی دیواریں پہرے داروں کی تبدیلی کے نعروں سے گونجنے لگیں۔ یہ دن کے اختتام کا اعلان ہے۔ رات نے اب عمر کوٹ پر اندھیرے کی چادر تان دی ہے۔ محل کے در و بام پر سناٹوں نے اپنا راج قائم کر لیا ہے۔ غلام گردشوں میں کنیزوں اور خواجہ سراؤں کی چہل پہل ماند پڑ گئی ہے اور ان کی گفتگو اشاروں کنایوں میں ڈھل گئی ہے۔ اب ہر طرف چراغ جل اٹھے ہیں۔ راہداریوں میں روشن دیوں کی جھلملاہٹ سے رات کے اندھیرے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ پائیں باغ میں پُراسراریت مزید بڑھ گئی ہے۔

میں جھاڑیوں سے نمودار ہوا اور دبے پاؤں ماروی کی جانب بڑھا' وہ ٹیلے پر گھٹنوں میں منہ دیئے سسکیاں لے رہی ہے۔ خوشی اور خوف کا مخلوط احساس مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ مجھے پکڑے جانے کا ڈر نہیں' مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ماروی ملنے سے انکار نہ کر دے۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ حسن و وفا کا پیکر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ ماروی جس کے وجود پر عمر سومرو کا قبضہ ہے مگر اس کا دل حاکمِ وقت کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ماروؤں کی آبرو' ماروی کا دل ملیر کے ویرانوں میں بھٹک رہا ہے۔ میرے من میں آیا کہ ماروی جیسے عظیم کردار سے ملاقات میری زندگی کی یادگار ملاقاتوں میں سے ایک ہوگی۔ میں ٹیلے کے قریب پہنچ چکا ہوں۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر میں ریت پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''ماروی!'' بے ساختہ اس کا نام میری زبان پر آ گیا۔

''میں ایک مسافر ہوں' تمہارے دیس تھر کی دریافت کے سفر پر نکلا ہوں۔ بھالوا گیا تھا تمہیں وہاں نہ پا کر تمہاری خبر گیری کے لئے یہاں چلا آیا۔ مجھے ماروؤں نے بتایا کہ تم یہاں قید ہو' تمہارے ساتھ کیا بیتی؟ میں یہ جاننا چاہتا ہوں۔ میں تمہارے لئے اجنبی ہوں مگر دھرتی سے وفا کے مارے مجھے بھی پیارے ہیں۔ میں اپنے تھر کے پیاروں کا المیہ جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا سمجھو' مجھے اپنا راز دو۔'' تاریخ کا ایک زندہ کردار اپنے سامنے پا کر میں خوشی کے مارے بے تکان بولتا چلا گیا۔ میری مداخلت پر یکلخت وہ تصورات کے چنگل سے آزاد ہوگئی۔ بیگانگی کے عالم میں وہ چونکی' ایک سرد آہ کے ساتھ سر اٹھایا' اس کی آنکھیں ویران' بوجھل اور دامن آنسوؤں سے تر ہے۔ اس نے

ایک اجنبی کو سامنے پا کر اپنے سر سے ڈھلکی ہوئی لوئی سمیٹ کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ میں نے اس کی طرف سے خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے استفسار کیا:

''ماروی! یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے' تمہارے ساتھ کیا بیتی؟ اپنا دکھ اس اجنبی مسافر کے ساتھ بانٹو' تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔'' میں نے افسردہ ماروی سے درخواست کی۔ میرے سوال کے جواب میں اس کے لبوں پر غم میں ڈوبے ہوئے ابیات جاری ہوگئے:

نہ آئی تھی کبھی میرے وطن سے
کوئی عورت یہاں بے موت مرنے
جلا کر کیوں نہ پہلے ہی مٹایا
مجھے اس آتشِ قلب و جگر نے

ماروی سے بات چیت کرتے ہوئے مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے سلسلہ جنبانی جاری رکھا۔ اس کا اندر باہر نکالنے کے لئے میں نے اسے عمر کی چاہت کا طعنہ دیا:

''عمر نے تمہارے ساتھ کیا برا کیا ہے' تمہیں جھونپڑی سے اٹھا کر محل میں لا بسایا ہے۔ میں اس کی وکالت نہیں کر رہا مگر سنا ہے وہ تمہیں بہت چاہتا ہے اور تمہیں اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔ تم نے حامی نہیں بھری تو تمہارے ساتھ جبر بھی نہیں کیا۔ تمہیں اپنے محل میں آبرومندانہ زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے۔ تمہارا اقرار تمہاری زندگی بدل سکتا ہے مگر تم اپنی ضد پر اڑی ہوئی ہو۔ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟'' میرے سوال پر ماروی کے چہرے پر ناگواری کی لہر پھیل گئی۔ اس نے اپنی جھیل سی آنکھیں پھیلائیں اور کہا:

کوٹ میں کیسے جی لگے مرا
لاج تھر کی مجھے بلاتی ہے
قید میں یاد پیارے مارو کی
کس طرح مجھ پہ ظلم ڈھاتی ہے
شام ہوتے ہی آشیاں کی طرف
جس طرح کونج اڑ کے جاتی ہے
موجہ قعرِ آب میں جیسے

سیپ بادل سے لو لگاتی ہے
گھر ہی جس کا ہو گھرے ساگر میں
کب ندی میں وہ چین پاتی ہے
میٹھی بوندوں کی آس میں جی کر
کھارے پانی کے دکھ اٹھاتی ہے
پیار سے اپنے من کے موتی کو
دوسروں سے سدا چھپاتی ہے
اس کو پیاری ہے آبرو اپنی
پریت کی رِیت یہ سکھاتی ہے
بادلوں کا اسے سہارا ہے
مجھ کو اپنا ملیر پیارا ہے

''تمہاری یہاں اپنے لوگوں کے بغیر کس طرح بیت رہی ہے' تمہیں اپنی سکھیاں 'پریمی کھیت' بھالوا اور بھالوا کے لوگ' یاد تو آتے ہوں گے؟ اور ہاں تمہیں وہ اپنی بھیڑ بکریاں بھی تو یاد آتی ہوں گی؟ تم نے تو' سنا ہے ان کے نام بھی رکھے ہوئے تھے؟'' میں نے اسے اس کے اپنوں کی یاد دلائی تو وہ لرزنے لگی اور شاہ لطیف کے ابیات اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر مچلنے لگے:

کوئی جانے گا کیا دکھ درد میرا
عمر ! میں حال اپنا کیا بتاؤں
وہ مارو جس کی خاطر جی رہی ہوں
اسی کو جب نہ اپنے پاس پاؤں
تو اس اونچے محل میں کیوں نہ آخر
یونہی بے چین ہو کر تلملاؤں
جو اجڑی ہے مری رسوائیوں سے
میں اس بستی کو کیسے بھول جاؤں

''ماروی! میں پھر وہیں جا رہا ہوں' تمہارے ملیر..... میں تمہارے ماروؤں کی طرح بے

دست و پا ہوں، تمہیں عمر کی قید سے رہائی دلانے کی سکت تو میرے بازوؤں میں بھی نہیں ہے مگر میں تمہارا سندیسہ وفا ان لوگوں تک پہنچا سکتا ہوں۔ تم اگر کچھ کہنا چاہو تو تمہارے جذبات تھر کے ماروؤں تک پہنچ جائیں گے۔" میری خواہش پر اس نے خوشگواری کے عالم میں اپنی پلکیں جھپکائیں، دونوں ہاتھوں سے لوئی کو اپنے سر کا سائبان کیا اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ ملیر اور ماروؤں کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں، لمحوں میں ایک جھڑی سی لگ گئی۔ اس کے اشکوں نے اس کے گال سیراب کر دیئے ہیں، اس کا گلاب سا چہرہ اور کھل اٹھا ہے۔ وہ دکھی دکھائی دے رہی ہے اور چھلکتی آنکھوں کے ساتھ وہ اور زیادہ باوقار اور وفادار دکھائی دے رہی ہے۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی اور لطیف کی زبان میں اسے دلاسہ دیا:

تو ہے اس قید سے نکلنے کو
پھر اٹھا لے ذرا دعا کو ہاتھ
شب ہے نورِ سحر میں ڈھلنے کو
پھر ترے تھر میں آئے گی برسات
بھیگی بھیگی ہوا ہے چلنے کو
پھر انہیں ماروؤں میں تو ہو گی
تیرے حالات ہیں سنبھلنے کو
ساعتِ نیک آنے والی ہے
سوز ہے ساز میں بدلنے کو

ماروی کی روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی اور کہا:

"ماروی مجھ پر بھروسہ کرو، مجھے اپنا ہمدم سمجھو۔ میں تمہاری امانت، تمہارا حالِ دل تمہارے پریمی اور تمہاری سکھیوں تک ضرور پہنچاؤں گا۔ میں بھالوا جا کر وہاں تمہاری وفا، خلوص اور استقامت کی قسمیں کھاؤں گا۔ میں انہیں بتا دوں گا کہ تم نے ان کی محبت پر تخت و تاج کو ٹھوکر مار دی ہے۔ میں انہیں بتاؤں گا کہ ان کے بغیر پل پل عذاب میں بتا رہی ہو۔" ماروی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں پلو اپنے سیدھے اور الٹے ہاتھ میں پکڑ کر اپنی لوئی سر کے اوپر فضا میں پھیلا دی اور اپنی مدھ بھری آواز میں اپنا پیغام گنگنانے لگی:

یاد آتے ہیں تھر کے وہ دن رات
جھونپڑوں میں وصال کے لمحات
نامہ بر میرے پیارے مارو سے
کہنا رو رو کے میری ہر اک بات
بھوکی پیاسی ہوں میں کئی دن سے
بھیج دے دیس کی کوئی سوغات
ہائے یہ قید و بندِ تنہائی
حیف یہ دلفگار احساسات
برق کی طرح دیدہ و دل میں
تلملاتی ہے یورشِ جذبات
میرے ''پہنوار'' اب تو آ بھی جا
دشمنِ جاں ہے گردشِ حالات
پیارا مارو نہ تھر کے سبزہ زار
کوئی ساتھی نہ اب کوئی غمخوار
ہتھکڑی اور بیڑیاں توبہ
نت نیا سوگ نت نیا آزار
کھاتی ہوں گی سہیلیاں ''سنگر''
اور ''کرڑوں'' میں ہوں گے برگ و بار
جا کے اے قاصدِ وطن ان کو
دینا میرا پیامِ پُر ایثار
میرے سرتاج سے بہ صد آداب
کہنا اے خوش ادا و خوش اطوار
پھر انہیں پُر سکوں فضاؤں میں
کب بلائے گا مجھ کو تیرا پیار

ماروی کی آواز نے فضاؤں میں مٹھاس گھول دیا ہے۔رات دھیرے دھیرے سمٹ رہی ہے' ماروی کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان بھی تھم چکا ہے۔اب ان آنکھوں میں دوبارہ ملیر کی اداس ریت اڑ رہی ہے۔ بھالوا کے سارے منظران غزالی آنکھوں میں تازہ ہو گئے ہیں اوراس کی آواز بھرا گئی ہے۔ مجھے ماروی سے اپنا مکالمہ ناتمام چھوڑ کر راتوں رات یہاں سے نکلنا ہوگا۔دن کا اجالا میرے لئے خطرات کا باعث بن سکتا ہے اور ماروی کو بھی میں کسی نئی الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتا۔اس نے وطن اور اہلِ وطن کی محبت میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ایک طرف عمر کی انا ہے' دوسری طرف ماروی کی وفا ہے۔ مجھے یقین ہے انا اور وفا کی اس مڈبھیڑ میں آخری فتح وفا ہی کی ہو گی۔عمر کی انا کے سامنے ماروی کے انکار نے اسے تاریخ میں امر کر دیا ہے۔

میں نے ایثار و وفا کی اس دیوی سے رخصت چاہی اوراس کے ماروؤں کے نام سندیسے کو سینے میں سنبھال کر اٹھ کھڑا ہوا۔سلگتی ریت سے اٹا طویل سفر ایک بار پھر عمرکوٹ کے دیوقامت قلعہ کے باہر میرا انتظار کر رہا ہے۔عمرکوٹ سے بھالوا کی دشوار گزار مسافتیں میرے قدموں سے لپٹنے کے لئے بے چین ہیں۔میں چھپتا چھپاتا قلعہ کے مرکزی دروازہ کے قریب پہنچ گیا ہوں۔پہریدار بھالے اور بندوقیں گھٹنوں میں لئے اونگھ رہے ہیں مگر مجھے باہر نکلنے کے لئے دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا ہوگا اوراس کا بہترین وقت پہریداروں کی تبدیلی کا ہی ہوسکتا ہے۔اس لئے مجھے نوبت بجنے کا انتظار ہے۔دفعتاً دروازے کے باہر سے نقارے بجنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آئیں۔شاید عمر سومرو سوڈھوں کی بغاوت سے نمٹنے کے بعد واپس قلعہ لوٹا ہے۔سارے پہریدار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے' انہوں نے ٹوپیاں اور بھالے بندوقیں سنبھالیں اور تن کر کھڑے ہو گئے۔ان میں سے کچھ دروازے کی طرف لپکے' مخصوص الفاظ کا تبادلہ ہوا اور جلدی سے قلعے کے دروازے کھول دیئے گئے۔ایک طوفان اندر امڈ آیا۔

عمر سومرو سر سے پاؤں تک آہنی لبادے میں جکڑا' مسلح دستے کی قیادت کرتا ہوا ابلق گھوڑے پر سوار آگے بڑھا۔سوار ہاتھوں میں ہتھیار بلند کر کے فاتحانہ نعرے لگا رہے ہیں۔اس کا مطلب ہے مہم کامیاب رہی ہے۔پسینے میں نہائے ہنہناتے گھوڑے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں ہیں۔ڈھول کی تھاپ پر جنگی ترانے گائے جا رہے ہیں۔اتنا شور ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی۔میرے لئے اس ہڑبونگ میں قلعے سے نکلنا بہت آسان ہوگیا ہے:

کوئی قاصد وہاں سے آیا ہے
ماروؤں کا پیام لایا ہے
ماروی اس قدر ہے کیوں مایوس
کیوں یہ خوف وہراس چھایا ہے
تجھ کو جانا ہے لوٹ کر تھر میں
کوٹ تیرے لئے پرایا ہے

''ماروی الوداع!'' میں نے خود کلامی کی۔

''کیا ہوا خاور بھائی' خیالوں میں ماروی سے ملاقات ہوگئی کیا؟ کاوش کے دودو چانڈیو نے مجھے ٹھوکا دیا تو میں چشمِ تصور سے باہر آ گیا۔ میرے سامنے ریت اڑ رہی تھی۔ میں کنوئیں کی منڈیر پر پاؤں رکھے اتنی دیر سے کہیں کھویا ہوا تھا کہ دودو چانڈیو کی آواز سے میرا ذہن منتشر ہو گیا۔ دودو سندھی صحافی ہے جو اسی سفر میں میرا دوست بنا ہے۔ وہ سندھ کی قوم پرست سیاست میں متحرک رہا ہے اور اس کی سوچ پر رسول بخش پلیجو کے افکار کی چھاپ واضح ہے مگر اب لگتا ہے اس نے ''پلیجو دبستانِ سیاست'' سے علیحدگی اختیار کر کے صحافت کے دامن میں پناہ لے لی ہے۔

عمر کے ہر حصے میں انسان کے عشق اور عمل کی شکلیں مختلف ہوتی رہتی ہیں' وقت کے ساتھ ساتھ ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ جب سے دودو نے شادی کی ہے وہ بھی ہماری طرح بیوی' بچوں اور نوکری کو پیارا ہو گیا ہے۔ کراچی نے اس کے بھی پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی ہیں۔ سماجی علوم پر دودو چانڈیو کی گہری نظر ہے' وہ سندھ کی سیاست اور سماج پر بے تکان کئی گھنٹے گفتگو کر سکتا ہے۔ وہ سندھ خاص طور پر تھر کے بارے میں بھی بڑی معلومات رکھتا ہے' میں نے تھر کے اس سفر میں اُس کی معلومات سے بہت استفادہ کیا ہے۔

''بس یار میں ذرا ماروی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کتنی عظیم تھی وہ' دھرتی ماتا کی خاطر تخت اور تاج کو ٹھکرا دیا۔ مصائب اور مشقتیں جھیلیں مگر اس کے قدم کسی بھی موقع پر ذرا بھی نہیں ڈگمگائے۔ اس کے انکار نے تھر کے ماروؤں کو سربلند کر دیا ہے۔ میری طرح دودو چانڈیو بھی دخترِ تھر ماروی کے کردار کا دل سے معترف ہے۔

''ہاں یار! ماروی نہ ہوتی تو اس کے بغیر تھر کی تاریخ ادھوری ہوتی۔ ماروی کے لازوال کردار نے تھر اور اہل تھر کو توقیر بخش دی ہے۔

''تمہاری سسی بھی ایسی ہی باوفا اور باوقار تھی کیا؟'' ماروی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اچانک اس نے سوال داغ دیا۔

''سسی کا کردار بھی ماروی کی طرح بلند وبالا ہے۔ ہمارے بعض کوتاہ بیں کہتے ہیں سسی اونگھ کا استعارہ ہے لیکن میرے مرشد فرید نے جن زاویوں سے اسے دریافت کیا ہے وہ سب پر بازی لے گئی ہے۔ ماروی کی طرح دھرتی سے جڑت اور اپنے پریں سے وفا نے اسے سب کرداروں سے اونچا کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں سسی کی نوکوٹ کے سدھونت کی طرح انتظارِ یار میں آنکھ لگ گئی تھی مگر ماروی نے پلک نہیں جھپکائی' سارے تماشے میں آنکھیں کھلی اور دماغ روشن رکھا۔ اسی وصف نے اسے روشن ضمیروں میں سرخرو کر دیا ہے لیکن مرشد فرید کہتا ہے کہ سسی نے خود کو مطعون کر کے پنوں کو سرخرو کر دیا۔ ہوت کو بچانے کے لئے ساری ملامت اپنے سر لے لی۔

پنوں ہوت نہ کھڑ مکلایا
چھڈ کلھڑی کیچ سدھایا
ہوت جان پچھان رلایا
کوڑا عذر نبھایم گھل دا
کیا حال سناواں دل دا
کوئی محرم راز نہ مل دا

تین تہذیبوں کی وفا شعاری کی عظیم علامت میری سسی کی وفا اور حب الوطنی کو سندھ کی سرکار شاہ لطیف بھی سراہے بغیر نہیں رہ سکے۔ وہ شاہ جو رسالو کے سرکوھیاری میں کچھ اس طرح اسے ہدیہ پیش کرتے ہیں:

ان بلوچوں کی خادمہ ہوں میں
جن سے وابستہ دردِ ہستی ہے
لاکھ ترکِ تعلقات کریں
میرا مسلک وفا پرستی ہے

ہر تمنا ہے ہوت سے منسوب
دل کی مستی عجیب مستی ہے

سسی کی وکالت میں تو سچل سرمست بھی گواہی دیتا ہے:

جودم غافل سو دم کافر ساکوں مرشد اے فرمایا
سچل گالہہ عشق دی سچی بیا سارا پندھ اجایا

عصر حاضر کی سسی پروین شاکر نے بھی اپنے اس شعر میں برملا میری سسی کی بے گناہی کا اعلان کیا ہے' وہ کہتی ہے:

کیسے کہہ دوں کہ مجھے چھوڑ دیا ہے اس نے
بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

مرشد فرید کہتا ہے کہ عاشق اور غفلت کرے' ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ سسی وہ جرات مند کردار ہے جس نے اپنے پنل کی بے وفائی کا الزام اپنے سر لے کر اسے دنیا کی رسوائی سے بچالیا اور خود کو معتوب ٹھہرالیا لیکن تاریخ نے اس کی خطاؤں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اسے عاشقوں کے نصاب میں سرخرو کر دیا ہے۔ میرے رہبر فرید کی تفہیم نے میری سسی کو عاشقوں کی آبرو بنا دیا ہے۔ محبوب کے حصے کی ملامت اپنے سر لے کر سسی نے تین خطوں کی لاج رکھ لی۔ سندھو کے کنارے سرائیکی سرزمین بھٹے واہن میں جنم لیا' تقدیر بھنبھور سندھ کھینچ لائی اور کیچ بلوچستان مدفون ٹھہرا۔ آبروئے عشق سسی نے پنل کی غفلت کا الزام اپنے ذمہ لے کر اپنے محبوب کو جگ ہنسائی سے محفوظ رکھا۔ مرشد خواجہ غلام فرید نے سسی اور پنوں کے عشقیہ فلسفے کی تین مصروں میں تفہیم کر کے سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

بٹھ پیا بھٹڑے واہن دا جماں
شہر بھنبھور وی کوڑ نکماں
کیچ ہئی وطن حقیقی وار

ترجمہ: بھٹے واہن کا جنم راس نہ آیا' بھنبھور کی زندگی بھی کس قابل' اصل منزل اور وطن تو کیچ ہے جو تلاشِ یار میں آبلہ پا کر دیتا ہے۔

یہ ہے میری سسی' ماروی کی مانند باوفا اور باوقار..... بقول فرید:

ہے ہے! بروچل یار
ہک تل ترس ناں کیتا
کر کے سخت نمانی
اپنے نال ناں نیتا
ہجر پیالہ ازلوں
میں مٹھڑی لو پیتا

''واہ کیا بات ہے! کیا خوب تجزیہ ہے؟ لگتا ہے آپ نے خواجہ غلام فرید کو دل سے پڑھا ہے۔'' دودو نے مجھے تھپکی دی۔

''میں نذیر لغاری اور جاوید چانڈیو کی طرح کوئی اچھا فرید شناس تو نہیں ہوں لیکن میں نے فرید کی روہی میں جنم لیا ہے اور وہ میری رگ رگ میں سمایا ہے..... میں نے لطیف کو بھی شیخ ایاز کے توسط سے پڑھا ہے اور ماروی سے ملا بھی ہوں۔''

''ہیں!'' ایک لمحے کے لئے وہ ٹپٹا گیا۔

''آپ ماروی سے کیسے ملے ہو' خواب میں؟'' اس نے تعجب سے مجھے گھورا۔

''یار! ماروی ہم سب کے اندر موجود ہے' تمہارے اندر بھی اور میرے اندر بھی' ماروی ہر انسان دوست اور دھرتی پرست کے اندر موجود ہے۔ وہ میرے اندر بھی زندہ ہے' میں اس سے گاہے بہ گاہے مکالمہ کرتا رہتا ہوں۔ میرا اس سے بات کر کے ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔''

''زبردست! ہاں آپ صحیح کہہ رہے ہو' ماروی کی بھڑکائی ہوئی آتشِ عشق نسلوں تک ہمارا اندر گرمائے رکھے گی۔'' دودو بھی پُر جوش دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ماروی کے گوٹھ پر الوداعی نگاہ ڈالی اور با آوازِ بلند کہا:

''اے بھالوا کے مارووً! تمہیں سلام پہنچے آبروئے تھر ماروی کا' وہ جس کا ایک ایک سانس تمہاری یادوں سے جڑا ہے۔ اس نے عمر کوٹ کے محلات تمہارے ان چنوروں کی خاطر ٹھکرا دیئے ہیں۔ ماروی تمہاری ہے' تمہاری رہے گی۔'' دودو ہی نہیں سارے ہمسفر میری دیوانگی پر مسکرا دیئے۔ میں نے چشمِ تصور میں مرشد فرید کو ماروی سے ہم کلام پایا:

اونی لوئی لاج دی
اطلس مشروع مخمل

سندھ سے باہر نہ صرف سرائیکی بلکہ دیگر تمام زبانوں میں بھی خواجہ غلام فرید وہ پہلا شاعر ہے جس کی شاعری میں ماروی کی لوئی کی لاج اور تھر کا ذکر ملتا ہے بلکہ مرشد فرید نے ماروی کے حضور سندھی کافی بھی لکھی جوان کے سرائیکی دیوان میں شامل ہے۔ جس میں دکھوں کی ماری' ماروی عمر سومرو سے کہتی ہے کہ:

"(اے عمر) تیرے مخمل کو میں آگ لگا دوں گی مگر اپنے ماروؤں کی لاج کی لوئی نہیں اتاروں گی۔" اس کافی میں ماروی اپنے وطن تھر' اپنے چنوروں' اپنے ماروؤں' اپنی بارشوں اور اپنی سہیلیوں کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے:

لج لوئی کین اتاریندس
تونجا مخمل بھا میں باریندس
تونجا زور زلل اوں مکرو دغا
تونجے ظلم جیاں گارہیوں عمر ادا
ونجیں وہیڑیجن ساں گاریندس
تھر پنہوارن جا ڈیس وطن
تھر آہے سہنجا ملک وطن
خوش سینگیں ساں گزاریندس
ہن قید میں کیڑھو کام کیاں
شالا ماروَن وارے وہن ویاں
جاتھی واراوگار بوہاریندس
ہوجے ہر دم ڈیہہ ابانے مینہہ
آہے سک ساڑیہ جے راتیں ڈینہہ
ڈیٹھی دھانہہ کندس ہنجوں ہاریندس
بٹھ ماڑیوں اوں محلات جا گھر

آکھے مرک فرید جا مارو تھر

وہن سانگے اڑن جے چاریندس

روہی اور سسی کے قصیدہ گو فرید کا ملک ملیر کی ماروی کے لئے یہ تاریخ ساز نذرانہ اپنی مثال آپ ہے۔ میں نے اردگرد نظر دوڑائی' ماروی کے ملک ملیر پر ویرانیاں چھائی ہوئی ہیں۔ مجھے بھی اداسیوں نے اپنی بانہوں میں کس لیا۔ میری نگاہوں کی آخری حد تک ایک سنسان صحرا کا اجنبی سا منظر ہے جو شاہ لطیف کی زبان بن کر میری سماعتوں سے ٹکرا رہا ہے:

کنوئیں ہیں اب نہ چرخی کی صدا ہے

سماں اس گاؤں کا سنسان سا ہے

نظر آتے ہیں ان کے حوض خالی

نہ گلہ ہے نہ کوئی جھونپڑا ہے

کہاں ہیں اب وہ خرقہ پوش مارو

خدا جانے وہاں کیا ہوگیا ہے

سراپا محو حیرت ہو گئی ہوں

خیال ان کا مرے دل میں بسا ہے

''چلیں صاحب! دیر ہو رہی ہے' ابھی ۳۸ کلو میٹر کا سفر باقی ہے' ننگر پارکر پہنچنے میں' دھوپ بھی بہت ہے اور راستہ بھی بہت خراب ہے۔ وقت سے پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔'' افضل نے ہمیں ''گپ شپ'' میں مصروف دیکھا تو دُہائی دی۔ میں نے جیب ٹٹولی اور ساتھیوں کی نظروں سے بچ بچا کر چند سکے نکال کر ماروی کے کنوئیں میں اچھال دیئے۔ میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ یا خدا ماروی کے صدقے مجھے بھی ماروی اور سسی کے اسوہ پر چلنے کی توفیق دے۔ مقامی لوگوں کی طرح مجھے بھی یقین ہے کہ میری منت بھی ضرور پوری ہوگی۔

میں نے دودو کا ہاتھ پکڑا اور کہا:

''چلو یار! ڈرائیور صحیح کہہ رہا ہے' دیر ہو جائے گی اور یار لوگ' ہمیں موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔ مائی ماروی اور سسی کا ذکر خیر پھر سہی۔''

ہم نے دوبارہ اپنی نشستیں سنبھال لیں اور افضل نے گاڑی چلا دی اور ہم ماروی کے گوٹھ

بھالوا سے نکل کر ننگر پارکر کے راستے پر آ گئے۔ ایک قاصد نے ابھی اپنا ایک اہم فرض نبھانا ہے۔ میں نے تنہائیوں اور سناٹوں میں گھرے ماروی کے ملک ملیر' بھالوا پر الوداعی نگاہ ڈالی اور ماروؤں سے سرگوشی کی:

''گواہ رہنا' میں نے عمر کوٹ میں مقید ماروی کا سندیسہ وفا تم لوگوں تک پہنچا دیا' تمہاری امانت تمہارے حوالے' زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

ایک بڑی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے بعد میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے' میں خود کو فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا ہوں۔ ماروی سے ملاقات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ میں نے شاہ لطیف کی نگاہوں سے اس اجڑے دیار پر آخری نظر دوڑائی:

کس طرف کوچ کر گئے وہ لوگ
یہ دلِ بے قرار کیا جانے
اجڑا اجڑا سا سبزہ زار ہے کیوں
دیدہ اشکبار کیا جانے
ہائے یہ دوری اور یہ مجبوری
خلشِ انتظار کیا جانے

میرا عاشقوں کی سرزمین بھالوا چھوڑنے کو جی نہیں چاہ رہا لیکن ہمیں مزید آگے جانا ہے۔
اب ہماری اگلی منزل تاریخ ایک اور شہادت ویراواہ ہے۔ مرشد فرید کا بند میرے لبوں پر ہے:

پیت پنل دی رگ رگ گھیریم
یار اغیار کنوں مونہہ پھیریم
جھور جھرانے جڑ جڑ ویڑہیم
چھٹ گیا کل کم کار اساہاں

ترجمہ: محبوب کی چاہت میری رگ رگ میں سما گئی ہے۔ (میرا یہ حال ہوا ہے) دوست دشمن سب سے کنارہ ہو گیا ہوں۔ ہجر یار نے کچھ اس طرح سے گھیرا ہے کہ کسی کام کے نہیں رہے۔



سارنگا اور سدھونت

میں ماروی کے حضور حاضری کے بعد ویراواہ کی طرف بڑھا ہوں تو میری نگاہیں مہ وش سارنگا اور جوگی من کے روگی سدھونت کی متلاشی ہیں۔ وہ دونوں میرے دیرینہ آشنا تو نہیں مگر مجھے ان کے بارے میں مکمل جانکاری ہے۔ وہ زندہ تھے تو زمانہ ان کے پیار کا دشمن تھا' مر گئے ہیں تو ان کے پیار کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ سسی اور پنوں کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا' مومل اور میندھرا کے ساتھ بھی۔ یہ زمانہ بڑا ظالم ہے' پیار کے ماروں کو جیتے جی مار دیتا ہے اور مارنے کے بعد تاریخ انہیں زندہ جاوید کر دیتی ہے۔ سارنگا اور سدھونت نے اپنی لازوال محبت سے تھریوں کے دل جیت لئے ہیں۔ ان کے عشق کے فسانے زبانِ زدِ عام ہیں۔ میری سسی اور پنوں سے شناسائی ہے اور میں مومل اور میندھرا کو بھی جانتا ہوں مگر سارنگا اور سدھونت میرے لئے بالکل نئے کردار ہیں۔ کردار تو خیر بہت ہی پُرانے ہیں مگر میری ان سے جان پہچان زیادہ پرانی نہیں۔ یہ پریمی جوڑا میرے تھر کے اس سفر میں مجھ پر دریافت ہوا ہے۔ یہ کہانی صحرا اور ساحل سے جڑی ہوئی ہے۔

سارنگا کی ایک نظر نے سدھونت کو ہمیشہ کے لئے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ سارنگا اور سدھونت ایک دوسرے پر فدا ہیں مگر زمانہ ان دو دلوں کے بیچ دیوار بنا ہوا ہے۔ دونوں نے جب سے ماتا دیوی کے روبرو ساتھ جینے ساتھ مرنے کی قسمیں کھائی ہیں' زندگی ان کی نظروں میں کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ سارنگا کے والدین اس ناطے پر خوش نہیں' وہ اپنی خوبرو سارنگا کے لئے محلوں کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ایک غریب صحرائی چرواہا سدھونت' ان کی نظروں میں جچا نہیں' مگر سارنگا کے لئے

یہ چرواہا شہزادوں سے کم نہیں۔ سارنگا کے والدین اسے سدھونت کی نظروں سے بچا کر دور کہیں ٹھر کے ساحلی شہر ''پاری نگر'' لے گئے ہیں۔

سارنگا کو یہ جدائی گوارا نہیں' وہ محبوب کے فراق میں پل پل تڑپ رہی ہے۔ اس نے راتوں کی نیندیں خود پر حرام کر رکھی ہیں اور ہر وقت اپنے پریمی کے تصوّر میں گم رہتی ہے۔ یہیں کہیں ویراوہ کے بیابانوں میں دیوی کا مندر سارنگا اور سدھونت کی جدائی پر اداس کھڑا ہے۔ دونوں نے ماتا دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر ساتھ نبھانے کی قسم کھائی تھی' ماتا بھی اس جدائی پر خوش نہیں۔ وہ اکثر یہیں' اسی مندر میں ملا کرتے تھے۔ سدھونت سارنگا کی تلاش میں دن رات صحرا کی خاک چھانتا رہتا اور تھک ہار کر اسی مندر میں ماتا دیوی سے محبوب کے وصال کی بھیک مانگتا رہتا ہے۔ آج بھی وہ اپنے من کی دیوی کے درشن کرنے کے لئے شدت سے منتظر ہے۔ وہ روزانہ یہاں آتا ہے اور سارنگا کی راہیں تکتا رہتا ہے۔

آتشِ عشق دونوں طرف برابر بھڑک رہی ہے مگر فاصلوں نے انہیں الگ کر دیا ہے۔ ''پاری نگر'' میں سارنگا کی شادی عجلت میں کسی اور کے ساتھ طے کر دی گئی ہے مگر سارنگا نے ٹھان لی ہے' مر جائے گی مگر سدھونت سے کئے ہوئے وچن سے نہیں پھرے گی۔ ''پاری نگر'' میں اس کے گھر میں خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں مگر اسے تو اپنے محبوب سے ملنے جانا ہے جو روزانہ رات ڈھلے دور دیوی کے مندر میں اس کی راہیں دیکھتا رہتا ہے۔ سدھونت کو بھی یقین ہے کہ وہ ایک روز ضرور آئے گی۔ وہ اپنی نگاہوں میں محبوبہ کا پیکر سجائے انتظار کی گھڑیاں گن رہا ہے۔ ایک ایک پل اس پر بھاری ہے۔ جوں جوں رات ڈھل رہی ہے مایوسیاں اور وسوسے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ انتظار کی اذیت سے بچنے کے لئے اس نے ساغر و مینا کا سہارا لیا ہے' اب تک وہ کئی جام چڑھا چکا ہے۔ اپنے پریتم کا انتظار کرتے کرتے وہ نڈھال ہو گیا ہے۔ ماتا دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر اپنی محبوبہ کی راہیں تکتے تکتے سدھونت نیند کی وادی میں کھو گیا۔

اپنے شہر ''پاری نگر'' میں سارنگا ہاتھوں میں مہندی رچائے' سہاگ رات کا گلابی جوڑا زیبِ تن کئے' گھونگٹ نکالے باراتیوں کی نگاہوں کو خیرہ کئے دے رہی ہے۔ باراتی دولہا کی خوش قسمتی پر نازاں ہیں کہ اسے سارنگا جیسی حسینہ کی رفاقت مل رہی ہے۔ سارنگا کے گھر میں گہما گہمی زوروں پر ہے۔ رنگا رنگ کپڑوں میں ملبوس عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر شادی کے نغمے الاپ رہی

ہیں، خوشی ان کے تن بدن سے پھوٹ رہی ہے:

ماڑا بھائی سنارارے گھڑ ڈے سونہرو ہار
ہار ماڑے لاڈن روشن گار رے
ہار ماڑے بیر روشن گار رے
ماڑا بھائی سنارارے گھڑ ڈے سونہرو ہار
ایہے ہار میں گھنگھرو لگائی ڈے
گھڑی گھڑی پڑے چھمکار رے
ماڑا بھائی سنارارے گھڑ ڈے سونہرو ہار
ہار ماڑے لاڈن روشن گار رے
ہار ماڑے بیر روشن گار رے
ایہے ہار میں پھولڑا لگائی ڈے
خوشبو تو پڑے ہبکار رے
ماڑا بھائی سنارارے گھڑ ڈے سونہرو ہار
ہار ماڑے لاڈن روشن گار رے
ہار ماڑے بیر روشن گار رے
ایہے ہار میں ستارا لگائی ڈے
انگڑیں پڑے لشکار
ماڑا بھائی سنارارے گھڑ ڈے سونہرو ہار
ہار ماڑے لاڈن روشن گار رے
ہار ماڑے بیر روشن گار رے

ایک طرف باراتی خوش ہیں، عورتیں سہرے گا رہی ہیں تو دوسری طرف سارنگا کی ہم جولیاں اداس ہیں۔ انہیں اپنی ''سارنگ'' کے خود سے بچھڑنے کا غم نہیں، وہ تو سارنگا اور سدھونت کی پریم کہانی کے متوقع انجام پر غم زدہ ہیں۔ دو پریمی اس طرح سے اچانک جدا ہو جائیں گے، یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ان کے لبوں پر وصال کے نغموں کی بجائے جدائی کے گیت تڑپ

رہے ہیں۔ درد میں ڈوبی ابیات نے شام کے سایوں پر غم کے بادل گھیرے کر دیئے ہیں:

سیکڑوں سورج چمک اٹھیں بھی گر مل کر اک ساتھ
سال کی ساری چودہویں راتیں بن جائیں اک رات
بن ساجن کے قسم خدا کی ' پھر بھی لگے اندھیرا
میرا ساجن سب سے روشن ' ساجن کی کیا بات

ایک فریاد ختم ہوتی ہے، پھر کوئی دوسری آہ کسی لوک گیت کا پیراہن اوڑھ کر اداس فضاؤں میں بکھر جاتی ہے:

''اے میرے محبوب! وہ زندگی کس کام کی، جو تیرے بغیر گزرے گی، تیرے بناں یہ جوبن کس کام کا۔ اگر تو نہ ملا تو میں اس جیون سے ہاتھ دھولوں گی۔ تیرے چرنوں میں جو جگہ نہ پائی تو یہ زندگی بے نام و بے کار ہے۔ اے میرے محبوب! وہ زندگی کس کام کی جو تیرے بغیر گزرے گی، تیرے بناں یہ جوبن کس کام کا۔''

سارنگا کو صحرائی اور ساحلی پھولوں سے مہکتی سیج سے کوئی غرض نہیں۔ وہ تو اپنے محبوب کے تصور میں کھوئی اسے جلد پانے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ اس کے پاؤں ریت رستوں کو چومنے کے لئے بے چین ہیں۔ فرید کے یہ بول اس کی دلی کیفیت کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں:

سیجھ ناں بھاوم پئی تڑپاواں
تارے گن گن رات نبھاواں
ناں کوئی ساتھی ناں کوئی غمخوار
ماپیو ویری مول ناں بھاندے
مہنیں ڈیوم بردے باندے
سینگھیاں سرتیاں کردے عار

ترجمہ: میرے لئے (پھولوں کی) سیج کانٹوں کی سیج ہو گئی ہے اور میں اس پر تڑپ رہی ہوں۔ تارے گن گن میری رات بسر ہو رہی ہے، اس عالم میں نہ کوئی ساتھی ہے اور نہ کوئی غمخوار کہ جسے دل کا بھید بتاؤں۔ میرے پیار کے دشمن ماں باپ میرے لئے بالکل اجنبی ہو گئے ہیں۔ میری اس بے بسی پر نوکر چاکر بھی مجھے طعنے دیتے ہیں اور میری سہیلیاں بھی مجھ سے منہ موڑ گئی ہیں۔

رات نے جونہی اپنی زلفیں ''پاری نگر'' پر دراز کیں تو سارنگا نے سہاگ رات کے منتظر دولہا کو چھوڑا اور اپنے پریمی سدھونت کو پانے کے لئے صحرا کے سفر پر نکل کھڑی ہوئی۔ اس کے عزم میں محبوب کو ہر حال میں پا لینے کی بھرپور قوت موجود ہے۔ وہ صحرا کے ایک دشوار گزار سفر کے بعد دیوی کے مندر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ اس کا محبوب ماتا دیوی کے قدموں میں بے سدھ پڑا ہے:

''سدھو' سدھو! دیکھو میں آ گئی ہوں۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہے۔ تو نے بلایا میں چلی آئی' اب دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی۔ میں نے بابل کی لاج پر تیرے پیار کو اولیت دی ہے' اٹھو اور مجھے اپنی بانہوں کی پناہوں میں لے لو۔''

سارنگا کی صدائیں مندر کی دیواروں کو چیر کر صحرا میں گونجتی رہیں مگر سدھونت بے سُدھ پڑا رہا۔ سارنگا کا چہرہ اشکوں سے بھیگ گیا۔ محبوب کے وصال میں تڑپتی ترستی وہ مایوس ہو کر ''پاری نگر'' پلٹ گئی۔ بقول محمد اقبال صدف:

ان ریتلی راہوں میں
ڈھولے سے بچھڑنے کا
منظر ہے نگاہوں میں

اگلے روز رات کے سر سے اندھیرے کا آنچل سرکا' سورج کی ناراض کرنوں نے دیوی کے مندر میں بے حال پڑے سدھونت کو جھنجھوڑا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں رات بھر کے انتظار اور خمار سے بوجھل ہیں۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں' اسے سارنگا کہیں نظر نہیں آئی۔ دیوی کا مندر صحرائی دلہن کی پھیلائی ہوئی خوشبو سے ابھی تک مہک رہا ہے لیکن سارنگا کا دور دور تک نام و نشاں نہیں۔ اس نے ریکھا پڑھنے کے لئے دونوں ہاتھ پھیلائے تو ہتھیلیوں پر سارنگا کی تحریر دیکھ کر وہ چونک گیا' لکھا ہے:

''پاری نگر کے جس گھر میں ناریل کا درخت ہے وہاں تیری سارنگا تیری منتظر رہے گی۔''

سدھونت دیوانہ وار مندر سے باہر لپکا۔ ساحل' ماتا دیوی کے مندر سے کوسوں دور ہے مگر پری وش کی جستجو کے سامنے صدیوں کے فاصلے لمحوں میں سمٹ جاتے ہیں۔ سارنگا ''پاری نگر'' پلٹتے ہوئے راستوں پر جا بہ جا اپنے نقش چھوڑ گئی ہے۔ اس کے قدموں کے نشان تو تھر کا

ریت نے چُرا لئے ہیں' ایک اس کے بدن کی مہک ہے جو اس کے وجود کی سمت کا تعین کر رہی ہے۔اسی مہک کے سہارے جوگیوں کا روپ دھارے سدھونت سلگتی ریت پر سارنگا کے نقشِ قدم ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔وہ اپنے پیار کی خوشبو کے تعاقب میں دیوانہ وار ایک اجنبی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔وہ خود کو کوس رہا ہے کہ ایک ذرا سی غفلت نے اسے پریتم سے اس قدر دور کر دیا ہے۔محبت اور جنگ میں غلطی کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہوتی۔ایک چھوٹی سی غلطی نے دو دلوں میں اچانک اتنے فاصلے بچھا دیئے ہیں۔وہ خود کو اپنے پیار کا مجرم سمجھنے لگتا ہے اور اس کے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔

صحرائے تھر نے ایک دیوانے کو اپنی وحشتوں کی آغوش میں لے لیا ہے۔اس نے اپنی پلکوں پر آنسو سجا رکھے ہیں اور کپکپاتے ہونٹوں پر سارنگا کا ورد جاری ہے۔سورج کے سائے تلے سدھونت ''سارنگا' سارنگا'' پکارتا' گرتا پڑتا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔اس نے اپنے دونوں ہاتھوں پر محفوظ 'اپنی پریتم کی تحریر کو سینے سے لگا رکھا ہے اور اس کی صدائیں صحرا کے سینے میں پیوست ہو رہی ہیں۔پیاس بجھانے کے لئے جب کبھی کسی تالاب تک رسائی حاصل کرتا ہے تو محبوب کی تحریر کو بچانے کے لئے وہ جانوروں کی طرح پانی پینے پر مجبور ہے۔

ایک طویل سفر کے بعد شہرِ نگاراں ''پاری نگر'' سدھونت کی آنکھوں کے سامنے ہے۔تھر پارکر کا یہ ساحلی شہر ۵۰ ہزار افراد کو اپنی امان میں لئے ہوئے ہے۔بندرگاہ پر تاجروں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہے۔رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس سیکڑوں ماہی گیر خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔بادبانی کشتیاں بحرِ بیکراں میں عجب منظر پیش کر رہی ہیں۔سدھونت شہر میں داخل ہوا ہے تو کئی اجنبی منظر اس مضطرب عاشق کا استقبال کرنے کے لئے موجود ہیں۔اس شہر کی اکثریتی آبادی جین دھرم سے تعلق رکھتی ہے۔ہزاروں پجاری اپنی پوجا پاٹ میں مشغول ہیں۔بھجن گانے والے مردوں اور عورتوں کے الاپ گلی گلی میں گونج رہے ہیں۔خوبصورت سنگی مندر' بلند و بالا منقش عمارتیں اور طویل پُر رونق بازار شہر کے حسن کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔بازاروں میں دیسی بدیسی لوگ کندھوں سے کندھے اُچکاتے پھر رہے ہیں۔سدھونت ہر راہ گیر سے سارنگا کے گھر کا پتہ پوچھتا پھر رہا ہے۔

''پاری نگر'' ساحلی شہر ہے' یہاں تو ہر گھر میں ناریل کا درخت ہے۔وہ جس طرف سے

گزرتا ہے نرگسی آنکھوں والے بھرپور سراپے حیرت سے اس خوبصورت مگر پریشان حال اجنبی تھری جوگی کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ ریگزاروں کا مارا شہرِ محبوباں کی گرد چھانتا پھر رہا ہے۔ ڈھونڈتے ڈھانڈتے سدھونت خود کو ناریل والے اس گھر کے سامنے پاتا ہے' جہاں سارنگا کی چنری نشانی کے طور پر لہرا رہی ہے۔ اس کے چلتے قدم رک جاتے ہیں۔ منزل کو سامنے پا کر وفورِ جذبات سے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ جھکا اور محبوب کی دہلیز پر ماتھا ٹیک دیا۔ اس کے آنسوؤں سے پریتم کا در تر ہو گیا۔ طویل وقفے کے بعد ایک سرد آہ کے ساتھ سدھونت گھٹنوں کے بل اٹھا' اس کی آنکھیں سرخ اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے نعرہ مستانہ بلند کیا:

''رے جوگی آیا جوگی' جوگی من کا روگی۔'' اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ دیوانہ وار یہی چلاتا رہا۔ ''جوگی آیا جوگی' جوگی من کا روگی۔''

''پاری نگر'' میں بھجنوں کے الاپ تھم چکے ہیں۔ اب شہر میں صرف ایک جوگی کی پکار گونج رہی ہے۔ اس کی صدائیں ڈھلتی شام کے سناٹوں کو چیرتی ہوئی ساحلی شہر کے گلی کوچوں میں ہر سو پھیل گئیں۔ سارنگا کی اپنے دونوں ہاتھوں پر رقم تحریر کو چومتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ صحرائے تھر کے ایک دیوانے عاشق نے اپنے بلند بانگ آہنگ سے شہری فضاؤں کے دل گرما دیئے ہیں۔

جوگی کے دل ہلا دینے والے نعرے سارنگا کی سماعت سے ٹکرائے تو وہ جان گئی کہ اس کا پریمی سدھونت آ پہنچا ہے۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتی ہوئی حویلی سے باہر نمودار ہوئی۔ اس کا محبوب' اس کا پریمی' پریم نگر نوکوٹ کا شہزادہ سدھو اس کے روبرو تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے برتن میں بھرے بے شمار سچے موتی اپنے محبوب کے قدموں پر نچھاور کر دیئے۔ دونوں اشکبار آنکھوں اور دھک دھک' دھڑکتے دلوں کے ساتھ لپکے اور ایک دوسرے کی بانہوں میں کھو کر ہمیشہ کے لئے امر ہو گئے۔

میں نے دو دلوں کو ملتے دیکھا تو خوامخواہ میری نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ صحرا میں دیوی کا بوڑھا مندر' مندر میں صدیوں سے ایستادہ بوڑھی ماتا دیوی' پریم پیارے سارنگا اور سدھونت میری نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ میں نے پریمی جوڑے کے الوداعی اشاروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دیا۔ ویراوہ کے صحرائیں' اپنے خوب صورت اور وفا کے پیکر میزبانوں کا خیال دل سے ترک کرنا میرے لئے بہت محال ہے۔ ہم بوڈھیسر کی جانب رواں دواں ہیں۔ سفر کی اونگھ

سے بوجھل، میرے سارے ساتھی بھی جاگ گئے ہیں۔ پھر وہی صحافیوں کا روایتی ٹھٹھا مخول، نوک جھونک شروع ہوگئی ہے۔ مجھے ایسا لگا کہ ہم کراچی پریس کلب کے سبزہ زار پر بیٹھے گپیں ہانک رہے ہیں۔ تجزیہ نگاری اور بحث وتمحیص کا جارحانہ سلسلہ جاری ہے۔ پریس کلب کراچی میں واحد جگہ ہے جہاں ''اظہار'' کی مکمل آزادی ہے۔ آپ یہاں بیٹھ کر کامل مختاری کے ساتھ اپنا فلسفہ بگھار سکتے ہیں اور آپ کسی بھی وقت کسی کے بھی خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتے ہیں۔ ہماری گاڑی ''منی پاکستان'' کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ اس میں ہر زبان، ہر علاقے، کئی نمائندہ اخبارات اور مختلف وابستگیوں کے لوگ موجود ہیں جو اپنا اپنا مقدمہ زورِ بیان کے ساتھ فضاؤں میں اچھال رہے ہیں۔ خیالات اور جذبات کا ایک بے قابو سیلاب امڈ آیا ہے۔ مجھے اس کھلے مباحثہ میں شریکِ گفتگو بننے میں دلچسپی نہیں ہے۔ اب میری توجہ اپنی اگلی منزل کی جانب مبذول ہوگئی ہے۔ میں سارنگا اور سدھونت سے ملاقات کی یادوں میں کھویا ہوا ہوں اور ان کے پیار کی خوشبو دل میں بسائے ویرا واہ سے بہت دور نکل آیا ہوں۔



تھر میں تعلیم وصحت کے مسائل

عوام کو بنیادی سہولتوں کی فراہمی کسی بھی ریاست کا بنیادی فرض ہے۔ جو ریاستیں اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتی ہیں وہ کامیابیوں کا سفر زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکتیں۔ سرکاری سطح پر حکومتی توجہ سے محروم عوام قومی ترقی میں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس اہمیت کو دنیا کی تمام قوموں اور ریاستوں نے تسلیم کیا ہے مگر ہمارے ہاں ''گڈ گورنینس'' کا تصور ایک خواب کی مانند ہے۔ ابھی تک ہم اس حقیقت تک نہیں پہنچ سکے کہ تعلیم اور صحت کی ضمانت کے بغیر کوئی معاشرہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تھر میں تعلیم وصحت کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ عام لوگوں کے لئے تعلیم وصحت کا حصول تو خیر دور کی بات ہے یہاں تو زندگی برقرار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ قہر آلود موسموں نے تھری باشندوں کی زندگیاں سولی پر لٹکا رکھی ہیں۔

تھر پارکر میں تعلیم اور صحت کے مسائل بہت زیادہ ہیں۔ اس عظیم خطے میں آبادی کم ہے مگر گاؤں گوٹھ دور دور ہونے کی وجہ سے تعلیم اور صحت کے مسائل دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ حکومتی توجہ کم ہونے کے باوجود تھر پارکر نے ثانوی تعلیم میں کافی ترقی کی ہے۔ تھر کے کئی اساتذہ نارا اور میر پور خاص کے علاقوں میں درس وتدریس کا کام انجام دے رہے ہیں۔ تھر کی خواتین نے بھی تعلیم کے شعبے میں قدم آگے بڑھائے ہیں۔ چونکہ تھر میں پردے کا رواج نہیں ہے، اس لئے لاتعداد تھری خواتین میر پور خاص اور نارا سب ڈویژن میں معلمی کے پیشے سے منسلک ہیں۔ تھر پارکر کے چاروں تعلقوں میں صرف ننگر پارکر میں ابتدائی تعلیم لازمی ہے۔ تھر میں لڑکوں

کے پرائمری اسکول کافی تعداد میں موجود ہیں جہاں تیسری جماعت سے اردو لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے مختلف گوٹھوں میں مکتب قائم ہیں جہاں بچوں کو قرآن مجید پڑھایا جاتا ہے۔ بعض بڑے گوٹھوں اور قصبوں میں بڑے دینی مدرسے موجود ہیں جہاں مولوی درجے تک تعلیم دی جاتی ہے۔ تھر میں غیر مسلموں کی مذہبی تعلیم کے لئے کوئی خاص انتظام موجود نہیں ہے۔ خاص طور پر مقامی ہندوؤں میں ان کے عقائد کی تعلیم کا رواج نہ ہونے کے برابر ہے۔ عام طور پر جو کچھ بھی ہندوؤں میں بنیادی دینی علم موجود ہے اس کا منبع نسل در نسل منتقل ہونے والی روایات ہیں۔ البتہ تھر کے پنڈت اپنی اولاد کو ایک حد تک دینی تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں اور انہیں شادی بیاہ' خوشی غمی کی رسموں سے آشنا کرتے ہیں۔

تھر میں ناخواندگی کا تناسب پاکستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت تشویشناک حد تک زیادہ ہے۔ یہاں ۱۰/سال یا اس سے بڑی عمر کے افراد کی تعداد ۵/لاکھ ۸۱ ہزار ۴۳۵ ہے' جن میں سے ۴/لاکھ ۷۴ ہزار ۹۰۸ افراد پڑھے لکھے نہیں۔ باقی ماندہ ایک لاکھ ۶ ہزار ۵۲۷ خواندہ افراد میں سے ۲۴ ہزار ۹۵۷ پرائمری سے بھی کم' ۳۳/ہزار ۵۲ پرائمری' ۱۶ ہزار ۹۸۰/مڈل' ۱۸/ہزار ۸۲۶ میٹرک' ۸/ہزار ۱۳۱۷ انٹر' ۳/ہزار ۱۶۷ گریجویٹ اور ایک ہزار ۵۳۵ ماسٹرز کی ڈگری رکھتے ہیں۔ پورے تھر میں صرف ۹۳/لڑکیوں نے ایم اے کر رکھا ہے۔ گریجویٹ لڑکیاں ۴۲۷/انٹر پاس ۲۴۷/میٹرک پاس ۲/ہزار ۱۶۰ ہیں جبکہ ۲/ہزار ۱۸۱ نے مڈل اور ۶/ہزار ۷۸۶ نے پرائمری پاس کیا ہوا ہے۔ تھر میں ترقی کا زیادہ سے زیادہ درجہ ۴ء۱۴ ہے جبکہ کم سے کم ۴ء۵ رہتا ہے۔

پچھلے چند برسوں میں تھرپارکر میں شعبہ تعلیم میں کسی حد تک بہتری آئی ہے۔ اب کئی دور دراز علاقوں میں پرائمری اسکول کھل گئے ہیں اور متعدد مڈل اور ہائی اسکول بھی قائم کئے گئے ہیں لیکن بدقسمتی سے لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ کے لئے کوئی بڑا کام نہیں ہوسکا۔ اور لڑکوں کے لئے بھی جو اسکول ہیں وہ زیادہ تر چنوروں میں قائم ہیں۔ کئی علاقوں میں حکومت اور این جی اوز نے اسکولوں کی پختہ عمارتیں تعمیر کرائی ہیں لیکن وہ ویران پڑی ہیں۔ تدریسی عملہ نہ ہونے کے باعث یہاں بچوں کو مقامی سطح پر زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواب خاک میں مل گئے ہیں۔

تھر سے تعلق رکھنے والے تعلیم اور صحت کے شعبوں میں دسترس کے حامل لوگ اپنے سنہرے

مستقبل کے لئے تھرپارکر کی بجائے قصبوں اور شہروں میں خدمات انجام دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے ماہرین کی تعداد ۱۰ رفیصد سے زیادہ نہیں ہے جو تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ہی علاقوں میں کام کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بہر حال تھر میں تعلیم اور صحت کے مسائل بہت زیادہ اور گمبھیر ہیں جنہیں کسی خاص جذبے اور غیر معمولی منصوبے کے تحت ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ جس ملک میں تعلیم اور صحت کے شعبے کے لئے کل بجٹ کا صرف دو یا ڈھائی فیصد خرچ کیا جائے وہاں تھر جیسے دور افتادہ اور پسماندہ ترین علاقے میں ان شعبوں کا انجام کیا ہوگا اس کا سب کو اندازہ ہے۔

پورے تھر میں تین کالج ہیں جن میں ایک ڈگری کالج' ایک سیکنڈری کالج اور ایک گرلز ڈگری کالج شامل ہے۔ یہاں ایک پولی ٹیکنک انسٹیٹیوٹ اور ایک مونو پولی ٹیکنک کالج بھی موجود ہے جبکہ پورے تھر میں تقریباً ۲,۹۲۵ ر پرائمری اسکول' ۴۳ ر سیکنڈری اسکول' ۲۶ ر ہائی اسکول اور ایک ڈگری کالج ہے۔ اس وقت تھر کے پرائمری اسکولوں میں تقریباً ۲۰,۷۰۱ ر سیکنڈری اسکولوں میں ۵,۰۴۲ ر ہائی اسکولوں میں ۹,۱۹۲ ر جبکہ ڈگری کالج میں ۸۶۴ ر طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں۔ ان ۳۵,۷۹۹ ر طلبہ اور طالبات میں طالبات کی تعداد بدقسمتی سے بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ پرائمری اسکولوں کی حد تک دیکھا جائے تو یہاں تعلیمی ڈھانچہ کسی سطح تک موجود ہے لیکن زیادہ موثر نہیں ہے۔ اس ضمن میں عملے اور سہولتوں کا جائزہ لیا جائے تو تھر میں بڑی مایوس کن صورتِ حال سامنے آتی ہے۔

میں نے تھرپارکر کو پیاس اور افلاس سے نجات دلانے کے لئے چند گزارشات اس کتاب کے آخر میں پیش کی ہیں جن سے رہنمائی حاصل کر کے تھر کو جنت نظیر بنایا جا سکتا ہے لیکن اب جبکہ تعلیم کے شعبے کا ذکر ہو رہا ہے تو میری تجویز ہے کہ اسے تھر کی ترقی کے منصوبے کی اولین ترجیحات میں جگہ دی جائے۔ جب تک یہاں جہالت اور پسماندگی کا خاتمہ نہیں ہوگا' یہ تاریخی خطہ مصیبتوں اور آزمائشوں سے دوچار رہے گا۔

میری استدعا ہے کہ تھر کو ایک مثالی تصویر بنانے کے لئے نظامِ تعلیم کو نچلی سطح پر موثر کیا جائے۔ ہر یونین کونسل سطح پر لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہائی اسکول قائم کئے جائیں اور یونین کونسل کی سطح پر ہی مختلف تھری ہنر کی جدید خطوط پر تعلیم و تربیت کے لئے ادارے قائم کئے جائیں تا کہ مقامی افرادی قوت اپنے علاقوں میں تربیت حاصل کر کے روزگار حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ ہر تعلقہ صدر مقام پر لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ پرائمری اسکول' مڈل اسکول' ہائی اسکول اور ایک

ایک اعلیٰ ثانوی اسکول کھولا جائے۔تعلقہ کی سطح پر مونو ٹیکنیکل اسکول بھی قائم کیا جائے تا کہ مقامی بے روزگار نوجوانوں کو ہنر مند بنایا جا سکے۔

تھر کا صدر مقام مٹھی سرکاری طور پر ہی نہیں تاریخی طور پر بھی صحرا کا دل ہے۔اس وقت یہاں جو تعلیمی سہولتیں میسر ہیں وہ اس تاریخی شہر کے شایانِ شان نہیں۔میری تجویز ہے کہ مٹھی میں ایک عالمی جامعہ قائم کی جائے جہاں علوم فنون' لسانیات' سائنس اور ٹیکنالوجی' طب وصحت اور تاریخ وتہذیب سمیت دیگر تمام مروجہ موضوعات پر تعلیم دی جائے اور ایک مونو ٹیکنیکل یونیورسٹی بھی قائم کی جائے تا کہ تھر سمیت سندھ کے ہنر مندی اور دستکاری کے تمام شعبوں کی تربیت یہاں دی جا سکے۔ ان جامعات کی معاونت کے لئے تھر بھر میں تعلیم کا ایک موثر اور مربوط ڈھانچہ دیا جائے۔پرائمری اسکولوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے' وہاں تدریسی عملے اور عمارتوں کی کمی پوری کی جائے۔ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں کے جال بچھائے جائیں۔مٹھی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے متعدد اسکول' انٹر اور ڈگری کالج بنائے جائیں۔اچھی نیت سے تشکیل دیا گیا ایک جامع پانچ سالہ منصوبہ تھر میں ہر طرف روشنیاں پھیلا سکتا ہے۔

تھر میں صحت کے شعبے کا تجزیہ کیا جائے تو ایک ہولناک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔اکیس ہزار مربع کلومیٹر میں پھیلی دس لاکھ سے زائد آبادی کے لئے پورے تھر پارکر میں کہنے کو تو ۳۴ ر بنیادی صحت مرکز یا دیہی صحت مرکز' ۲۱ ر اسکول صحت مرکز اور ضلع کونسل کے کئی شفاخانے موجود ہیں جہاں ۱۴۱ ر مرد معالج اور صرف تین خواتین معالج خدمات انجام دے رہے ہیں لیکن ان مراکز اور اسپتالوں میں طبی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔دور دراز علاقوں کے لوگ طبی سہولتیں نہ ملنے کے سبب کئی ایسی جان لیوا بیماریوں کے شکار ہو کر لقمہ اجل بن جاتے ہیں جن کی تشخیص تک نہیں ہو پاتی۔

لاتعداد معصوم بچے کم خوراکی کے باعث چھوٹی عمر ہی میں موت کا نوالہ بن جاتے ہیں۔ بلاشبہ بچے کی صحت کا دار و مدار ماں کی صحت اور متوازن غذا پر ہوتا ہے جو تھری عورتوں کے لئے خواب کی مانند ہے۔تھر آئے دن خشک سالی اور قحط کی لپیٹ میں رہتا ہے اس لئے بھوک اور بیماری کی زد میں آ کر عورتوں کی صحت اکثر ٹھیک نہیں رہتی جس کی وجہ سے حمل سے لے کر ولادت تک مناسب اور متوازن خوراک کی عدم دستیابی کے باعث بچے مختلف بیماریوں کے نرغے میں رہتے ہیں۔طبی سہولتوں کے فقدان کی وجہ سے یہاں دورانِ حمل اور بچے کی ولادت کے بعد زچہ بچہ کی زندگی

خطرات سے دوچار رہتی ہے۔تھری خواتین میں خون کی کمی کی بیماری عام ہے۔صاف ظاہر ہے کہ اس کا سبب غذائی ضروریات پوری نہ ہوتا ہے۔تھر کی اکثریت تپ دق' پولیو' اسہال ' قے' ملیریا' پیچش، جگر' آنکھوں اور جلد کے امراض میں مبتلا ہے۔لیکن خشک سالی اور قحط کے دنوں میں تو صورت حال اور زیادہ گمبھیر ہو جاتی ہے اور ماحول پہلے سے زیادہ ہیبت ناک ہو جاتا ہے۔

تھر میں خشک سالی کے بعد غذا کی قلت کی صورتحال پیدا ہونے سے اکثر علاقوں میں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ویسے بھی یاس اور افلاس کے مارے تھری باشندوں کی اکثریت دن میں صرف ایک یا دو وقت کے کھانے پر اکتفا کرتی ہے۔گاؤں گوٹھوں میں دوپہر کے کھانے کا رواج نہیں ہے۔دن چڑھے کھانا کھالیا اور پھر شام ڈھلے جو مل گیا حلق سے اتار لیا۔غذائی قلت کے باعث انہیں کبھی بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔قحط کے دنوں میں تو نوبت فاقوں تک آجاتی ہے۔مسلسل کم خوراکی کی وجہ سے ان کے بدن کا مدافعتی نظام بیماریوں کے خلاف مزاحمت میں ناکام رہتا ہے'لوگوں میں قوتِ مدافعت ختم ہونے کی وجہ سے خوفناک بیماریاں جنم لیتی ہیں جن میں تیز بخار' کھانسی' پیٹ کے امراض اور رات کے اندھے پن کی بیماری اور خاص طور پر ٹی بی کے مرض میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ٹی بی ایک موذی مرض ہے جو پاکستان سمیت تیسری دنیا کے تمام پسماندہ ممالک میں عام ہے۔ایک اندازے کے مطابق سال میں تین لاکھ پاکستانی اس مرض کی لپیٹ میں آتے ہیں۔یہ بیماری جسم میں بکٹیریا کے داخل ہونے سے انسان کو جکڑتی ہے اور دھیرے دھیرے اسے موت کے منہ میں دھکیل دیتی ہے۔چونکہ یہ متعدی مرض ہے اس لئے تھوکنے' کھانسنے' تنگ اور تاریک جگہ پر زیادہ لوگوں کی ایک ساتھ رہائش کی وجہ سے اور زیادہ پھیلتا ہے۔تھر میں ایک تنگ اور تاریک چنورے میں درجنوں افراد رہتے ہیں اس لئے یہاں یہ بیماری عام ہے۔پینے کا صاف پانی' بہتر اور معقول غذا کی نایابی اور کثرت سے تمباکو نوشی کی وجہ سے ٹی بی کا مرض ملک کے دوسرے حصوں کی نسبت تھر میں سب سے زیادہ ہے۔سرکاری سروے کے مطابق تھر کے بیس سے پچیس فیصد باشندے ٹی بی جیسے جان لیوا مرض میں مبتلا ہیں'یعنی تھر کا ہر چوتھا باشندہ اس مرض میں مبتلا ہے۔ان میں بچے بھی ہیں'بوڑھے بھی ہیں' جوان اور عورتیں بھی ہیں۔

ٹی بی کا علاج مہنگا اور طویل مدت تک جاری رہتا ہے۔طبی ماہرین کے مطابق ٹی بی کا علاج

کم از کم نو مہینے تک بغیر کسی وقفے کے جاری رکھنا پڑتا ہے اور اس کی ادویات پر ۴۰ / سے ۴۵ / روپے یومیہ خرچ آتا ہے۔ تھر کے لوگ چونکہ بے وسیلہ اور ایک ایک وقت کی روٹی کو ترستے ہیں' اس حال میں ان کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اس بیماری کا علاج باقاعدگی سے کرا سکیں۔ یوں یہ جلد یا بدیر اس بیماری کے ہاتھوں لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔

تھر کے اس سفر میں ہم جس طرف بھی گئے ہیں' ہمیں بیماری اور موت کے شکنجے میں جکڑی زندگی نظر آئی ہے۔ ہم چھاچھرو تعلقہ کے گوٹھ بھور یلو آئے ہیں تو یہاں بھی ہر طرف مدقوق چہرے اور لاغر جسم بکھرے دکھائی دیئے ہیں۔ ہمیں ایک مقامی باشندے نے بتایا کہ اس بستی کے صرف ایک' ستار پاڑے میں ۲۰۰ / سے زائد گھر ہیں' سوائے چند گھروں کے اس پاڑے کے ہر گھر کے جملہ افراد ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہیں' حتیٰ کہ دودھ پیتے بچے بھی اس مرض کا شکار ہیں۔ اس حوالے سے مقامی ڈاکٹروں نے بتایا کہ ٹی بی یہاں غریب طبقے میں بہت عام ہے یہی وجہ ہے کہ تھر میں ٹی بی کو غریبوں کی بیماری کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہاں لوگوں کو اس بات کا شعور ہی نہیں ہے کہ یہ مرض متعدی ہے' اس لئے مریضوں سے اخلاط کی وجہ سے بڑی تیزی سے پھیلتا ہے۔

تھر پارکر کو ضلعی حیثیت ملنے' مٹھی میں سول اسپتال قائم ہونے' سول سرجن مقرر ہونے اور ضلعی صحت افسر کی تعیناتی کے بعد اب امید پیدا ہو چلی ہے کہ کم از کم مٹھی اور گردونواح کی آبادیوں کو علاج معالجے کی بہتر سہولتیں دستیاب ہو جائیں گی۔ اس کے باوجود صحت عامہ کو بہتر بنانے کے لئے بنیادی سطح پر انقلابی اقدامات اٹھائے جانے چاہئیں۔ خاص طور پر بچوں کی غذائی ضروریات پوری کرنے اور زچہ بچہ کی صحت وسلامتی یقینی بنانے کے لئے ایک غیر معمولی منصوبے کی ضرورت ہے تاکہ ماؤں کو بچایا جا سکے اور اوائل عمری کی اموات کی روک تھام کی جا سکے۔ اس حوالے سے یونیسف کے تعاون سے تھر پارکر میں پرائمری اور سیکنڈری سطح پر غذائی پروگرام متعارف کرایا گیا ہے جس کے یقیناً مثبت اثرات مرتب ہوں گے لیکن اس طرح کے پروگرام کو وسعت دینے کی ضرورت ہے اور اس کا دائرہ کار شیر خوار بچوں اور تھر پارکر کی تمام آبادیوں تک پھیلانے سے تھری معاشرے کو صحتمند ماحول میں ڈھالنے میں مدد ملے گی۔

تھر پارکر کے دور افتادہ گاؤں گوٹھوں میں لاتعداد بنیادی' دیہی صحت مرکز موجود ہیں لیکن یہ مسائل سے دوچار ہیں۔ کہیں اکادکا عملہ موجود ہے تو عمارت نہیں یا پھر ادویہ دستیاب نہیں۔ کہیں پختہ

عمارتیں تو موجود ہیں لیکن عملہ مقرر ہونے کے باوجود اکثر غائب رہتا ہے۔ تھرپارکر میں گھوسٹ اسکولوں کی طرح گھوسٹ اسپتالوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ ایسے کئی کاغذی اسپتال ہیں جو زمین پر موجود نہیں ہیں۔ اس بات کا اہتمام ہونا چاہئے کہ ریکارڈ پر موجود اسپتال' عملہ' ضروری ساز و سامان اور تھری ماحول اور موسم میں درکار ادویہ ہر علاقے میں موجود ہوں۔ حکومت کے لئے فوری طور پر ممکن نہیں ہے کہ وہ تھر کے ہر گوٹھ تک طبی سہولتوں کی فراہمی یقینی بنا سکے لیکن تھر کے طویل فاصلوں اور دور دور قائم آبادیوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہاں بڑے پیمانے پر گشتی طبی یونٹ رواں رکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن اور یونیسف کا تعاون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ماضی میں جاپان کے تعاون سے گشتی طبی یونٹوں کا تجربہ بدانتظامی اور کام چوری کی وجہ سے ناکام ہو گیا تھا لیکن تھر کے طول و عرض میں تھری عوام کو معقول حد تک طبی سہولتیں پہنچانے کا یہی ایک راستہ ہے جسے بروئے کار لا کر یہاں صحتمند معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کی جا سکتی ہے۔

تھر کے باسی سندھ ایرڈ زون ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سازدا) کے کردار پر کڑی تنقید کرتے نظر آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس ادارے کی کارکردگی تھرپارکر کے عوام کے لئے معمہ سے کم نہیں' یہ ادارہ کس لئے قائم کیا گیا اور کس قدر موثر رہا اس پر سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جاپان نے تھر کے عوام کو صحت کی سہولتیں ان کے گھروں پر بہم پہنچانے کیلئے کروڑوں روپے مالیت کے ۵/ جدید ترین گشتی طبی یونٹ دیئے تھے' ان میں سے چار بالکل ناکارہ ہو چکے ہیں' ایک یونٹ ننگرپارکر کے تعلقہ اسپتال میں پڑا اسڑ رہا ہے۔ جس سے اس منصوبے کے تحت لوگوں کو ان کے گھر کے دروازے پر صحت کی سہولت بہم پہنچانے کے تصور کی افادیت ختم ہو گئی ہے۔ یہ منصوبہ کیوں اور کیسے اور کس نے ناکام بنایا؟ اس سے پردہ اٹھنا چاہئے تاکہ مستقبل میں' تھر میں ایسا کوئی منصوبہ ناکام بنانے کی کوئی شخص یا ادارہ جسارت نہ کر سکے۔ سندھ ایرڈ زون ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سازدا) کیا ہے؟ کب قائم ہوئی اس کے قیام کا مقصد کیا تھا اور کیا یہ اتھارٹی اپنے مقاصد پورے کرنے میں کامیاب رہی؟ ان سوالوں کا جائزہ لینا اس لئے بھی ضروری ہے تاکہ اندازہ لگایا جا سکے کہ تھر اور اہلیانِ تھر کو ملنے والے ادارے' منصوبے اور فنڈز عوام کے لئے کارآمد ثابت کیوں نہیں ہوتے؟

سندھ حکومت نے صوبے کے صحرائی علاقوں کوہستان' نارا اور تھر کی اراضی اور عوام کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے سندھ ایرڈ زون ڈویلپمنٹ اتھارٹی (سازدا) قائم کی تھی لیکن برسوں بعد

بھی اس ادارے کے منصوبے اور تجاویز کاغذوں تک محدود ہیں۔ اس ادارے کا ایجنڈا تھا کہ:

۱: یہ ادارہ زیر زمین پانی کے ذخیروں کا کھوج لگائے گا۔

۲: آبپاشی کے لئے چھوٹے چھوٹے بند باندھ کر پانی ذخیرہ کر کے اسے قحط کے دنوں میں استعمال کرنے کے انتظامات کرے گا۔

۳: تھر میں تھور زدہ زمینوں کو قابل کاشت بنانے کی منصوبہ بندی کرے گا۔

۴: مویشیوں کے فارم قائم کریگا۔

۵: جانوروں کے لئے پورے صحرا میں مویشی اسپتال قائم کرے گا۔

۶: طبی سہولتوں کا پورے تھر پارکر میں جال بچھائے گا۔

۷: تھر پارکر میں پختہ راستے تعمیر کرے گا۔

۸: گرڈ اسٹیشنوں کے ذریعے بجلی کی سہولتیں بہم پہنچائے گا۔

۹: شمسی توانائی کے پلانٹ لگائے گا۔

۱۰: گھریلو دستکاری کے مراکز قائم کرے گا۔

۱۱: وسیع میدانوں کو ترقی دینے کے اسباب مہیا کرے گا۔

۱۲: تھر کو مزید ویران ہونے سے بچانے کے لئے کوششیں بروئے کار لائے گا۔

۱۳: مختلف شعبوں میں تحقیقی کاموں کے لئے فنڈز مہیا کرے گا۔

اس ادارے کے مقاصد کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے خدوخال پر من وعن نہ سہی کسی حد تک عمل کر کے تھر پارکر میں زندگی کی بحالی کے لئے بہت بہتر ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ادارہ برسوں بعد بھی اپنی موجودگی کا احساس دلانے میں ناکام رہا ہے۔ تھر کا اہم ترین مسئلہ پانی کی نایابی ہے۔ اس ادارے نے برسوں پہلے خوشخبری سنائی تھی کہ تھر میں دس ہزار مربع کلومیٹر پر زیر زمین پانی کے وسیع ذخائر موجود ہیں جو تھر پارکر کی آبادیوں اور مویشیوں کی سو سالہ ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔ ایسی خوشخبریاں آئے دن تھر کے نمائندے' تھر سے متعلق ادارے سناتے رہتے ہیں۔ تھری باشندے اس راگ پاٹ کے عادی ہو گئے ہیں۔ ''سازدا'' کے دعوے اور منصوبے بھی کاغذوں سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ چونکہ تھر میں طبی سہولتوں کو فروغ دینا سازدا کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے اس لئے میں نے ضروری سمجھا کہ اس کے کردار کا جائزہ لے کر اس

کی سمت درست کرنے کی کوشش کی جائے۔

بھوک، پیاس، افلاس اور امراض کی سرزمین تھر میں گزشتہ کئی عشروں میں ترقی تو کیا ہونا تھی غربت اور امارت کے درمیان فرق بہت بڑھ گیا ہے جس کی تصدیق "یونائٹڈ نیشن ڈویلپمنٹ پروگرام" کی اس رپورٹ سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر محبوب الحق نے لکھی تھی۔ یہ رپورٹ بھی کافی پرانی ہو چکی ہے لیکن عوام کی حاکمیت کے نام پر بنائے گئے ملک کے اربابِ بست وکشاد کو غیرت دلانے کے لئے اس کی چند سطریں کافی ہیں۔ اس رپورٹ میں موازنہ پیش کیا گیا ہے کہ اس ملک میں پانچ مالدار اشخاص ہر پانچ غریبوں سے لگ بھگ ایک سو پچاس گنا زیادہ کماتے ہیں جس سے پاکستان میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو رہا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ پاکستانی غریبوں کی زندگی بدلنے کے لئے بنیادی پالیسیاں یہی مالدار طبقہ ترتیب دیتا ہے۔

جس معاشرے میں غریب اور امیر کے درمیان خلیج اتنی وسیع ہو وہاں عام آدمی کی تعلیم اور صحت کے لئے کیا وسائل دستیاب ہوں گے اس کا اندازہ پوری قوم کو ہے۔ غریب آدمی جس کے ووٹوں سے پالیسی ساز برسر اقتدار آتے ہیں، وہ اپنے گاؤں گوٹھ میں بھی تعلیم اور صحت کی بنیادی سہولتوں سے محروم ہیں اور امیر آدمی اپنے بچوں کو ملک اور بیرون ملک مہنگی اور اعلیٰ ترین تعلیم سے آراستہ کرتا ہے اور اپنے اور اپنے خاندان کے لئے علاج معالجے کی بہترین سہولتوں سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اس ملک کا غریب غربت، جہالت اور بیماری کے ہاتھوں سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ یہ ہے مملکتِ خداداد پاکستان! اس عظیم مملکت کے عظیم صحرا تھر کے لاکھوں باشندے بھی غربت، پسماندگی اور ناخواندگی کو اپنا نصیب اور قسمت کا لکھا جان کر جانوروں جیسی زندگی کو خدا کی عطا کردہ نعمت سمجھتے ہیں اور وہ خوش ہیں کہ وہ ایک عظیم ریگستان کے باسی ہیں۔ حکومتوں اور اداروں کو بھی پروا نہیں کہ جب یہ خود اپنی تقدیر بدلنے پر رضامند نہیں ہیں تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ ان خاک نشینوں کی فکر میں دبلے ہوں۔

میں تھر کی تحصیل چھاچھرو کے آفت زدہ علاقوں سے نکلا ہوں تو میرا ملال بہت بڑھ گیا ہے۔ ملول اور مدقوق تھر کی زندہ لاشوں نے مجھے مضطرب کر دیا ہے، درد کی یہ تصویریں میری یادداشت میں مستقل محفوظ رہیں گی۔ ہم ان اداس نسلوں کو تسلی کے چند جملوں اور چند لمحوں کی رفاقت دے کر اگلے سفر پر گامزن ہیں۔ غم اور الم کی ایک اور تصویر دیکھئے۔



تھر کے کمسن کھڈی مزدور

پاکستان بچوں کی جبری مشقت کے حوالے سے دنیا میں کافی بدنام ہے۔مختلف ملکوں‘ تنظیموں اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے کسی حد تک بلا جواز اور غلط پروپیگنڈے کے باوجود سولہ کروڑ کی آبادی میں بلاشبہ لاکھوں بچے ایسے ہیں جو اپنے والدین کی غربت کے باعث کمسنی میں محنت اور مشقت کرنے پر مجبور ہیں۔ جوں جوں پاکستان کی آبادی میں خطِ غربت سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی شرح بڑھ رہی ہے اسی شرح سے ملک میں بچوں میں جبری مشقت کا رجحان بھی بڑھ رہا ہے۔بچوں سے جبری مشقت لینے کے حوالے سے تھر بلاشبہ زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ ناداری کے باعث یہاں بچوں کی اکثریت کم عمری ہی میں محنت مزدوری میں جھونک دی جاتی ہے۔ چونکہ یہاں معاشی وسائل محدود ہیں‘ خاص طور پر بچوں کے کرنے کے لئے کام کے مواقع نایاب ہیں‘ اس لئے قالین بافی کی صنعت سے وابستہ سیٹھوں اور ساہوکاروں نے تھر کا رخ کیا ہے اور پورے تھر کو اپنی آماجگاہ بنالیا ہے۔

میں تھر آیا ہوں تو چند روز قبل ہی ۱۴ر نومبر کو پاکستان سمیت دنیا بھر میں ’’عالمی یومِ اطفال‘‘ منایا گیا ہے۔ مجھے بھی کراچی میں غیر سرکاری انجمن کے زیرِ انتظام ایک ایسی تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا جہاں بچوں کی جبری مشقت کے خلاف بڑی پرجوش تقریریں کی گئیں اور بتایا گیا کہ اس وقت ملک بھر میں ایک کروڑ بچے مزدوری کرنے پر مجبور ہیں جبکہ پرائمری اسکول جانے کے قابل ۲ کروڑ ۲۵ لاکھ بچے ایسے ہیں جو مختلف وجوہات کی بنا پر اسکول نہیں جاپاتے۔ مقررین نے بتایا

کہ بچوں کی مشقت کا اہم اور بنیادی سبب غربت ہے۔ پاکستان میں آبادی کے ساتھ ساتھ غربت بھی مسلسل بڑھ رہی ہے۔ جس کے نتیجہ میں سماجی بے چینی اور بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں بے روزگار والدین کے کروڑوں معصوم بچے اپنے بنیادی حقوق سے لطف اندوز ہونے کی بجائے مشقت پر مجبور ہیں۔

غربت ہی کا شاخسانہ ہے کہ تھر کی چاروں تحصیلوں میں سیکڑوں خاندانوں کو مختلف متمول افراد اور ان کے گماشتوں نے قالین بافی کے کاروبار کے توسط سے یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان سیٹھوں اور گماشتوں کی تعداد سو سے بھی زیادہ ہے جبکہ بچوں کی جبری مشقت میں ملوث ان بااثر افراد کو کئی مقامی وڈیروں کی سرپرستی حاصل ہے۔ قالین بافی سے منسلک کئی افراد ایسے ہیں جن کے پاس سو سو کھڈیاں موجود ہیں۔ کمسن بچوں سے محنت مزدوری کروانے کے گھناؤنے فعل میں ملوث ان سیٹھوں کی تھرپارکر کے طول و عرض میں پھیلی ۶،۰۰۰ کھڈیوں میں ۱۰،۰۰۰ ہزار سے زائد بچے قالین بافی کے کاروبار میں جبراً کام کر رہے ہیں۔ ان معصوم بچوں کے ہاتھوں میں اسکولوں کے بستے، قلم اور کتابیں ہونی چاہئے تھیں لیکن یہ بدنصیب کھیلنے کودنے اور پڑھنے کی اس عمر میں معصوم اور ناتواں ہاتھوں سے سیٹھوں اور ساہوکاروں کے لئے دن رات پیسے کھوجتے رہتے ہیں۔

غربت کے مارے تھری بچے اور ان کے والدین بھی کھیت مزدوروں کی طرح ساہوکاروں کے پھیلائے ہوئے پرفریب اور گنجلک قرضوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان سیٹھوں اور گماشتوں نے وڈیروں کی طرز پر تھری خاندانوں کو یرغمال بنایا ہوا ہے۔ قالین ساز سیٹھ ان خاندانوں کو قرض کی کچھ رقم فراہم کرتا ہے اور ان کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے کہ اس کے عوض ان کے خاندان کے تمام افراد بشمول کم عمر بچے ان کی کھڈیوں میں کام کریں گے۔ ان خاندانوں کو دیا گیا قرض سود در سود کی وجہ سے بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور اسے اتارنے میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو نسلیں مرکھپ جاتی ہیں لیکن ساہوکاروں کا قرض ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ اور یوں یہ غریب اور لاچار خاندان نسل درنسل اس چنگل میں پھنسے رہتے ہیں۔

قرض اور لین دین کی یہ شکل تھر میں غریب خاندانوں کے مستقل استحصال کا سبب بن گئی ہے۔ اگر کوئی خاندان کسی سیٹھ سے دس ہزار روپے قرض اٹھاتا ہے تو وہ پانچ سال بعد پچاس ہزار روپے تک جا پہنچتا ہے۔ حالانکہ اس دوران تھری خاندان دن رات محنت کر کے سیٹھوں کو اونے پونے

نرخوں پر مسلسل قالین مہیا کرتے رہتے ہیں جو وہ کئی گنا منافع سے کھلی مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔ان تھری خاندانوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا مال کھلی منڈی میں بیچ سکیں۔قرض کے علاوہ قالین بافی کے شعبے کے لوگ عام تھریوں سے روزانہ اجرت کی بنیاد پر بھی کام لیتے ہیں۔تھر میں یہ کام کمسن بچوں سے بھی روزانہ اجرت پر لیا جاتا ہے۔مسلسل بارہ بارہ گھنٹے کام کرنے کے عوض ان ننھے مشقتیوں کو زیادہ سے زیادہ چالیس سے پچاس روپے روزانہ ملتے ہیں۔اس شعبے میں معصوم بچوں کے استحصال کی اتنی شکلیں ہیں کہ لکھنے بیٹھوں گا تو بات بہت پھیل جائے گی۔

صحرائے تھر میں مٹھی بھر سیٹھوں نے چھوٹی چھوٹی کھڈیوں کا جال بچھایا ہوا ہے۔عام طور پر ایک کھڈی ایک بڑے کے لئے مخصوص ہوتی ہے لیکن زیادہ تر سیٹھ اس سے روگردانی کرتے ہیں اور ایک اوسط درجے کی کھڈی پر دو یا تین بچے بٹھا دیتے ہیں۔تھر میں قالین سازی کی صنعت سے وابستہ مزدوروں کی اندازاً ۸۰ فیصد تعداد نابالغ بچوں اور بچیوں کی ہے۔آجر یہ سمجھتا ہے کہ بچے بڑوں کی نسبت کم اجرت پر اور آسانی سے قابو میں رہنے والے مزدور ثابت ہوتے ہیں اور بسا اوقات پیداوار میں بڑوں کی نسبت کہیں زیادہ نتائج دیتے ہیں۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۵۴ اسکوائر فٹ کا ایک قالین بالغ مزدور دو مہینوں میں تیار کرتا ہے تو یہی دو یا تین کمسن مزدور بچے صرف ایک مہینے میں تیار کر لیتے ہیں۔

ملک بھر میں پانچ سے بارہ یا چودہ برسوں کی عمر کے تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ بچے ہیں جو قالین کی صنعت سے وابستہ سیٹھوں اور ساہوکاروں کے لئے مشقت کرنے پر مامور ہیں۔میں بتا چکا ہوں کہ تھر میں پانچ سے بارہ سال کے کم و بیش دس ہزار بچے ایسے ہیں جو قالین کی کھڈیوں میں کام کر کے نہ صرف اپنی صحت برباد کر رہے ہیں بلکہ اپنا مستقبل اندھیروں میں جھونک رہے ہیں۔ان میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ۳۰ سے ۳۵ فیصد تعداد کمسن بچیوں پر مشتمل ہے۔یہ کم عمر مزدور ایک ہفتے میں ساٹھ ساٹھ گھنٹے تک کام کرتے ہیں۔

اوائل عمری کی مشقت سے تھری بچوں اور بچیوں کی صحت انتہائی خراب ہو جاتی ہے۔سیٹھ سارا سال ان بچوں کا خون نچوڑتے ہیں لیکن جب یہی بچے بیمار پڑتے ہیں تو وہ ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور ان کے علاج معالجہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔دن رات کھڈیوں میں کام کرنے کی وجہ سے ان کی کمریں دوہری ہو جاتی ہیں اور انہیں سانس کی بیماریاں اور امراضِ چشم لاحق ہو جاتے ہیں اور بلوغت

کی عمر تک پہنچتے پہنچتے یہ بیماریاں خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ تھر میں قالین سازی کی صنعت سے جڑے کمسن بچوں میں کمر درد، ٹی بی، سانس اور آنکھوں کی بیماریاں عام ہیں جبکہ سیٹھوں کی طرف سے ان کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی انتظام اور ترکیب نہیں ہوتی۔

ایک جمہوری نظام میں ہر بچے کو قدر و وقعت حاصل ہوتی ہے لیکن ہمارے ہاں حکومتیں بچوں کو محفوظ اور بہتر مستقبل دینے کے لئے جوابدہ نہیں ہیں۔ اس لئے حکومتوں کا نعرہ ''آج کا بچہ کل کا مستقبل'' یہاں مذاق بن گیا ہے۔ بدقسمتی سے سیاسی جماعتوں کے ایجنڈے پر بھی بچوں کی صحت، تعلیم، خواندگی اور غذائیت جیسے اہم مسائل ہوتے ہی نہیں ہیں۔ پاکستان میں بھی چودہ سال سے کم عمر بچوں سے جسمانی مشقت کرانے کی قانوناً ممانعت ہے لیکن ملک کے تھر جیسے پسماندہ اور دور دراز علاقوں میں ہی نہیں بڑے بڑے شہروں میں بھی اس قانون کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں۔ پورے تھر میں بچوں کی معاشرتی اور نفسیاتی نشوونما اور جبری مشقت روکنے کے لئے کسی قسم کے عملی منصوبے موجود نہیں ہیں۔

ایک غیر سرکاری نجی تنظیم ''تھر دیپ'' کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کمسن کھڈی مزدوروں کو اس دوزخ سے نکالنے کے لئے عملی اقدامات کر رہی ہے۔ اس تنظیم نے نہ صرف کئی خاندانوں کو قرض کی لعنت سے نجات دلائی ہے بلکہ ان کے کم عمر بچوں کو محنت مزدوری سے بچا کر مقامی طور پر تعلیم اور تربیت کی سہولتیں فراہم کی ہیں جس سے تھری معاشرے میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ تھر دیپ نے اپنے دیہی ترقی منصوبے کے تحت ۵۰ سے زائد درس گاہیں قائم کی ہیں جہاں ہزاروں بچے کھڈیوں سے ناطہ توڑ کر تعلیم کی سہولتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔ تھری بچوں کو جبری مشقت کی لعنت سے چھٹکارا دلانے کے لئے اس تنظیم کی کوششوں کو سراہا جانا چاہئے لیکن یہ کام نجی تنظیموں کے بس کا نہیں ہے اس کے لئے حکومتی کردار مضبوط کرنا ہوگا۔ حکومت ایک طرف جہاں تھر میں کمسنی کی مشقت کے خاتمہ کا اہتمام کرے وہاں بچوں کی ذہنی نشوونما، بہتر غذائیت اور معقول تعلیم و تربیت کو یقینی بنائے۔

سندھ میں کمسنی کی محنت مزدوری کو روکنے اور عام مزدوروں کے عمومی مسائل حل کرانے کے لئے ضلعی سطح پر لیبر انسپکٹر موجود ہوتا ہے لیکن تھر میں بچوں کی مشقت اور جبری مشقت روکنے کے لئے کوئی اہلکار سرگرم نہیں ہے۔ تھر میں اس لاقانونیت کو روکنے کے لئے سرکاری سطح پر ایک ویجیلینس کمیٹی تشکیل دی گئی تھی جو غیر موثر اور غیر فعال ثابت ہوئی ہے۔ تھر میں کتنے ایسے بچے ہیں جو پڑھ لکھ کر

اپنے ماں باپ ' علاقے اور ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں اور کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں لیکن والدین کی مجبوریوں اور ناداری کے باعث اسکولوں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے اور ان کا مستقبل تاریکیوں میں کھو جاتا ہے۔ جبری مشقت ان کا مقدر بن گئی ہے اور وہ والدین کا ہاتھ بٹانے کے لئے چھوٹی عمر ہی میں سیٹھوں ' ساہوکاروں اور ان کے گماشتوں کا بخشا ہوا غلام بچپن جھیل رہے ہیں۔

یوں تو پورا صحرا قالین بافی کی صنعت سے وابستہ سیٹھوں اور ان کے گماشتوں کے گرفت میں ہے اور کوئی ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن بچپن کی مزدوری کا نصیبہ لئے تھری بچے سراپا احتجاج ہیں۔ ہم چھاچھرو کے گوٹھ رنچھانی پہنچے ہیں تو میرے ہاتھ میں قلم اور کاغذ دیکھ کر ننھے منے کھڈی مزدوروں کے ایک ہجوم نے مجھے گھیر لیا ہے۔ اس ہجوم میں کمسن بچے بھی ہیں اور معصوم بچیاں بھی۔ خوبصورت قالین تیار کرنے والے یہ بچے میل سے اٹے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان کے نحیف ونزار جسم ان کی غربت اور افلاس کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ وہ سب کے سب ننگے سر' ننگے پاؤں اور ان کے ہاتھ کھڈیوں پر چلتے چلتے زخموں سے چور ہو گئے ہیں۔

''ہم پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں مشقت کی بھٹی میں جھونک دیا گیا ہے۔ ہمارے ماں باپ مجبور اور بے کس ہیں' ان کا بال بال قرض میں جکڑا ہے۔ وہ اس قابل نہیں کہ ہمیں اچھی خوراک اور تعلیم دے سکیں لیکن ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے لئے بات کریں' ہمارے لئے کچھ کریں' ہم اچھی زندگی جینا چاہتے ہیں' ہم مرنا نہیں' پڑھنا چاہتے ہیں۔''

ان بچوں کے چہروں اور جسموں سے ٹپکنے والی غربت سے تو میں پہلے ہی رنجیدہ تھا' لیکن ان کے جملے میرے ذہن وقلب پر بجلی بن کر کوندے ہیں۔ میں مسافر ہوں' تھوڑی ہی دیر میں ان سے رخصت ہو جاؤں گا۔ میں سوچتا ہوں کہ انہیں کیا تسلی دوں۔ کیا یہ میرے تاسف اور تسلی بھرے چند جملوں سے بہل جائیں گے؟

میں وقت سے پہلے دکھوں اور آزمائشوں بھرے جیون کو گلے لگانے والے ان بچوں سے کہتا ہوں کہ میں ان کے لئے ضرور کچھ کروں گا۔ اچھی زندگی اور تعلیم تمہارا بھی حق ہے۔ میں نے بڑھ کر کمسن کھڈی مزدور مانک چند کو اپنی بانہوں میں لے کر پیار کیا اور کہا کہ میں تم سب کی بہتر زندگی کے لئے آواز بلند کروں گا۔ میں تم لوگوں کو تمہارا حق ضرور دلاؤں گا۔ میں نے دیکھا کہ معصوم شانت' نندو اور اس کی بہن گنگو اور ان کے ساتھیوں کے ہونٹوں پر مسکان سی پھیل گئی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے

جملوں کا بھرم کمسن کھڈی مزدوروں کے اس ہجوم پر رہ گیا ہے۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ رنچھانی کے ان ننھے منے دوستوں سے اجازت لیتا ہوں۔ان کے الوداع کہتے چھوٹے چھوٹے گھائل ہاتھ دور تک مجھے دکھائی دیتے رہے۔ڈھلتا سورج رنچھانی کے بلند ٹیلوں میں منہ چھپا کر بستی کو رات کے اندھیروں میں دھکیلنے کی کوششوں میں مصروف ہے لیکن مجھے یقین ہے ان تھری بچوں کا مقدر ایک دن ضرور چمکے گا۔اچھی زندگی اور تعلیم ان کا بنیادی حق ہے جو ایک دن انہیں ضرور ملے گا۔

مانک چند' شانت' نندو' گجو اور سارے دوستو! میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔آج میں نے سارے زمانے کو بتا دیا ہے کہ میرے تھر کے یہ معصوم دوست مرنا نہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔زمانے والو! آگے بڑھو اور خدارا! میرے ان کمسن کھڈی مزدور دوستوں کے لئے کچھ کرو۔خدارا! انہیں بے موت مرنے سے بچالو.....



اربابوں اور رانوں کا راج

سیکڑوں سال قبل رائے کنگا کچھ کا حکمران تھا مگر وہ لااولد تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کے ہاں دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے' جڑواں کو سندھی اور سرائیکی میں ''جاڑا'' کہتے ہیں۔ بعد ازاں اس خاندان کی حاکمیت انہی جڑواں بھائیوں سموں اور راجپوت سے آگے بڑھی۔ ان بھائیوں کو جاڑے جام سے شہرت ملی۔ گجرات (بھارت) میں بہت سی ریاستیں جونا گڑھ' بھاونگر' رادھن پور' سہارن پور وغیرہ جاڑا قبیلے کے زیرِ اثر تھیں۔ بعد ازاں اس خاندان کے افراد کو علیحدہ علیحدہ ریاستیں دے کر اقتدار تقسیم کر دیا گیا۔ ارباب خاندان کے آباؤ اجداد نوہڑیو کا تعلق سموں قبیلہ سے تھا۔ یہ خاندان سیکڑوں برسوں سے صحرائے تھر ہی میں آباد ہے' ان کا آبائی علاقہ ڈنگو ہے جہاں کے رہنے والے ارباب کہلاتے ہیں جبکہ انکی ذات نوہڑیو کے لوگ تھر کے دیگر علاقوں کے علاوہ پورے سندھ میں بڑی تعداد میں آباد ہیں۔ صحرائے تھر پر پہلی کتاب ''ممائر آن تھر اینڈ پارکر'' میں نوہڑیو قبیلے اور ارباب خاندان کا ذکر موجود ہے' یہ کتاب بھوج (کچھ) کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن اسٹینلے نے ۱۸۴۷ء میں تحریر کی تھی اور ۱۸۵۹ء اس وقت موجودہ تھر کچھ کے انگریز پولیٹکل ایجنٹ کے ماتحت تھا۔

ارباب کے لفظی معنی مالکان یا پالنے والے ہیں۔ نوہڑیو قبیلے کے سردار ارباب کیسے بنے یا کہلائے اس حوالے سے مختلف روایات ہیں۔ ایک تو یہی ہے کہ چونکہ وہ علاقے کے بااثر جاگیردار تھے' ہزاروں ہاری ان کے زیرِ تسلط تھے' اس لئے ارباب یعنی مالکان کہلائے۔ کچھ روایات ہیں کہ یہ

لفظ ارباب اربعہ سے نکلا ہے' عربی میں اربعہ چار کو کہتے ہیں۔ سندھ میں انگریزوں کے دور میں ڈھل کا نظام نافذ ہوا تو اس کی وصولی ٹھیکے پر دی جاتی تھی۔ وصولی کے تین حصے انگریز سرکار کے خزانے میں جمع کرائے جاتے تھے جبکہ ایک حصہ ڈھل جمع کرنے والے کا ہوتا تھا۔ ڈھل کی صورت میں نقد رقم چوپایا مال اور زمینیں شامل ہوتیں تھیں۔ انگریز یہ کام عام طور پر اپنے وفادار بااثر لوگوں اور قبیلوں کے حوالے کیا کرتے تھے۔ ڈھل وصول کرنے والوں کو اربعہ کہتے تھے جو بعد میں ارباب کہلانے لگے۔ انگریزی دورِ حکومت میں تھر کے علاوہ سندھ کے دوسرے علاقوں اور سرحد میں بھی ڈھل کی وصولی پر مامور خاندان ارباب کے لقب سے مشہور ہوئے۔ نصرپور اور ٹھٹھہ کے میمن' دادو کے پنہور' سرحد کے بعض پٹھان خانوادے آج بھی اسی وجہ سے ارباب کہلاتے ہیں۔

انگریز دور میں مٹھی ڈیپلو' ننگرپارکر کو ضلع کچھ ریاست بھوج کے ساتھ ملا کر ایک ضلع بنایا گیا تھا۔ انگریز پولیٹیکل ایجنٹ سردیوں میں مٹھی میں بیٹھا کرتا تھا جبکہ گرمیوں میں اس کا دفتر بھوج میں ہوتا تھا۔ انگریزوں سے خاص قربت کی وجہ سے تھر میں ڈھل کی وصولی کا ٹھیکہ ارباب خاندان کے حوالے کیا گیا۔ تھر کی زمین چونکہ بارانی تھی' مون سون برس گیا تو فصلیں اچھی ہو جاتی تھیں اور اگر بارشیں نہ ہوتیں تو ڈھل کی ادائیگی درکنار کھانے کے لئے کچھ دستیاب نہیں ہوتا تھا۔ جس سال بارشیں کم ہوتیں تو مقامی افراد ڈھل میں رعایت طلب کرتے تھے۔ ارباب مالدار لوگ تھے' پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس جا کر اپنی جانب سے ڈھل جمع کراتے اور یہ رقوم اپنے نام سے مشترکہ کھاتہ دکھا کر جمع کرائی جاتیں۔ وہ ڈھل نہ دینے یا رعایت طلب کرنے والوں کی زمینیں اپنے قبضے میں کر لیتے تھے۔ مشترکہ کھاتے میں جمع کرائی جانے والی رقم کو ''کھوکھا'' کہا جاتا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ تھر میں ایسی زمینوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ڈھل کے نفاذ سے انگریزوں کی تجوریوں کے منہ بھرنے لگے اور اربابوں نے ایک وسیع وعریض اراضی ہاتھ کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ تعلقہ ڈیپلو کے صحرائی علاقے کی زیادہ تر اراضی مشترکہ ہونے کے باعث آج تک اربابوں کے قبضے میں ہے اور ان زمینوں کا سروے آج تک نہیں ہونے دیا گیا۔ تعلقہ ڈیپلو کے غریب ہاری اور مزارعین صدیوں سے مشترکہ کھاتے کے بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ ارباب خاندان نے ڈیڑھ سو سال سے ان کی ملکیتوں پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا ہے۔ بے بس ہاری جانتے ہیں کہ اگر سروے ہوا تو ان کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اور ان کے آباؤ اجداد کی وراثت طاقت ور ارباب ہڑپ کر لیں گے۔ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے بااثر اربابوں کی غلامی

پر مجبور ہیں۔ان کی اپنی آبائی جائیدادیں ان کے لئے اربابوں کی نجی جیلیں بن چکی ہیں جن میں وہ گھٹ گھٹ کر مرنے پر مجبور ہیں۔

۱۷۵۰ء میں سندھ پر غلام شاہ کلہوڑو کی حکومت تھی۔روایت ہے کہ اس نے تھر میں اپنا تسلط مضبوط رکھنے کے لئے ارباب خاندان سے اپنے لئے رشتہ طلب کیا۔یہ مشورہ غلام شاہ کو اس کے تھر میں کارندے ٹیکراج نے دیا تھا اور وہی بادشاہ کا رشتہ لے کر اربابوں کے پاس آیا تھا مگر اس خاندان کے اب وجد ہندو راجپوتوں نے اسے اپنی غیرت کے خلاف سمجھا اور ایک مسلمان حکمران کو رشتہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔اربابوں کا انکار سندھ کے حکمران غلام شاہ کلہوڑو کے لئے غیر متوقع اور توہین آمیز تھا۔وہ بہت چیں بہ جبیں ہوا اور غصے میں آ کر نوہڑیوں (اربابوں) کے گاؤں پر حملہ کرا دیا۔بپھری ہوئی کلہوڑا افواج نے اربابوں کی حویلیوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ان کے پورے گاؤں کو نذرِ آتش کر دیا۔ارباب خاندان نے راہِ فرار اختیار کی اور بھوج (کچھ) میں جا پناہ حاصل کی۔

۱۷۸۳ء میں جب سندھ پر تالپوروں کی حکومت قائم ہوئی تو تالپوروں نے اپنے دشمن (کلہوڑا خاندان) کے دشمن (ارباب خاندان) کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور انہیں بھوج سے واپس بلوا کر جاگیر ونگے انہیں دوبارہ لوٹا دی۔۱۷۵۰ء میں کلہوڑا مسلمان حکمران کو رشتہ دینے سے انکار کی سزا جھیلنے والے نوہڑی راجپوت ۱۷۸۳ء میں تالپور حکمرانوں کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔اس وقت کے ممتاز عالم دین مولوی عبدالرحیم نے اس خاندان کو دین اسلام کی تعلیم دی۔یہ عالم دین اہلحدیث تھے ان ہی کی تعلیم و تربیت کی وجہ سے ارباب خاندان بھی اہلحدیث فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔بعض سندھی تاریخ دان غلام شاہ کلہوڑو کی طرف سے اربابوں سے رشتہ مانگنے کی روایت کو مشکوک قرار دیتے ہیں۔

عمر کوٹ اپنی جائے پیدائش ہونے کی وجہ سے مغل بادشاہ جلال الدین محمد اکبر کو بہت عزیز تھا اس لئے جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس نے تھر پارکر کی تعمیر و ترقی پر خاص توجہ دی اور اپنے دور میں صحرائے تھر میں ڈھل (لگان) کی وصولی کا نظام ختم کر دیا۔اس ہی زمانے میں نوہڑیو عمائدین کو اربعہ کے بجائے ''مغل حکمرانوں کے ارباب'' کے لقب سے نوازا گیا جس کے بعد ونگے کے جام ارباب کہلانے لگے۔معروف تھری شاعر اور معلم (ریٹائر ہیڈ ماسٹر) دوست محمد دوست ڈیپلائی بھوکڑیو گاؤں میں رہائش پذیر ہیں، انہوں نے اربابوں کی تاریخ لکھی ہے۔یہ ایک مستند کتاب ہے

جس میں ارباب خاندان کی مکمل تفصیلات درج ہیں۔

ارباب توگاچی اول کے بارے میں روایات ہیں کہ وہ ایک ظالم اور سفاک انسان تھا۔ اس کے ستائے ہوئے ڈوڈھارو کے ایک جری سردار شادی خان کھوسو نے ارباب توگاچی اول کو اغوا کرلیا۔ جس پر کھوسوں اور ارباب خاندان کے درمیان اسلام کوٹ کے قریب ''مارو'' (یہاں مارو سے مراد ہے قاتل جگہ، جہاں بہت سے لوگوں کا خونِ ناحق بہا ہو) کے مقام پر خونریز جنگ ہوئی۔ اربابوں کو انگریز حکومت اور پولیس کی مکمل پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لڑائی میں سیکڑوں افراد موت کے گھاٹ اتر گئے۔ شادی خان کو گرفتار کر کے ارباب توگاچی اول کو بازیاب کرایا گیا۔ شادی خان کھوسو پر انگریزوں نے مقدمہ چلا کر اسے موت کی سزا دے دی۔ سندھ کا یہ غیرت مند جنگجو احمد آباد بھارت کے قبرستان میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

ارباب توگاچی دوئم نے اپنے مخصوص مذہبی رجحانات کے زیر اثر ۱۸۴۰ء میں حر تحریک کے خلاف حروں کے مرکز (نوکوٹ کے قریب سات میل موری) مسجد مہران شریف کو اپنے آدمیوں کے ذریعے آگ لگوادی تھی۔ اس مسجد اور علاقے کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں پیر صاحب پاگاڑو کے بڑے بڑے خلیفہ حر تحریک میں حصہ لیتے ہوئے شہید ہوئے تھے اور اسی مسجد کے قریب سپرد خاک ہوئے۔ شاندار ماضی کی حامل یہ تاریخی مسجد آج بھی نوکوٹ کے راستے ڈوڈھارو اور کھیتلاری جاتے ہوئے سات میل موری پر موجود ہے۔

۱۹۴۶ء میں متحدہ ہندوستان کی اسمبلی کے اجلاس کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے جب خان صاحب ارباب توگاچی سندھ سے رکن تھے۔ بجٹ اجلاس چل رہا تھا، بجٹ میں ایک روپے کا مسئلہ ہوگیا تو اسمبلی میں ہنگامہ پھوٹ پڑا، ہاتھا پائی ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ اسمبلی ٹوٹ جائے گی۔ خان صاحب ارباب توگاچی نے اپنی جیب سے چاندی کا ایک روپیہ نکال کر اسپیکر کی طرف اچھالا اور کہا کہ ایک روپے کی بات ہے، جھگڑا کیوں کرتے ہو۔ یہ لو، روپیہ میں دے دیتا ہوں تاکہ اسمبلی ٹوٹنے سے بچ جائے۔ یوں ایک لمحے میں یہ قضیہ نمٹ گیا۔

ارباب خاندان سیاست میں تعلقہ مٹھی کی سرکردہ سیاسی شخصیت فقیر شیر محمد بلالانی کے والد فقیر فیض محمد بلالانی سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ فقیر فیض محمد بلالانی ایک بہت بڑے زمیندار اور روحانی شخصیت تھے۔ تھر میں ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان

کے گدی نشین فقیر شیر محمد بلالانی کا شمار اربابوں کے سیاسی مخالفین میں ہوتا ہے اور وہ پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہیں۔ایک زمانے میں پورے صحرائے تھر میں کسی کے پاس جیپ نہیں تھی۔ سب سے پہلے فقیر فیض محمد بلالانی نے جیپ خریدی جسے قربت کی وجہ سے ارباب بھی استعمال کرتے تھے۔نئی نسلوں میں یہ قربتیں کچھ سیاسی رقابتوں اور کچھ نئے رنگوں میں بدل گئی ہیں' کبھی اتحاد تو کبھی آمنے سامنے۔واقعی سیاست دوراں کے رنگ نرالے ہیں۔

رانا خاندان کا شمار بھی تھر پارکر کے مقتدر خاندانوں میں ہوتا ہے۔ٹھاکر رانا چندر سنگھ کے آباؤ اجداد (رانا) کہلاتے تھے' اس خاندان کے افراد عمر کوٹ' چھاچھرو' نگر پارکر میں صدیوں سے آباد ہیں' جہاں پر ان کی بڑی بڑی جاگیریں تھیں اور یہ وہاں کے حکمران کہلاتے تھے۔اس علاقے کا تہذیبی رنگ راجستھان اور گجرات (بھارت) سے ملتا جلتا ہے اور لوگوں کے رسوم ورواج' اوڑھنا بچھونا ایک جیسے ہیں۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں رانا گنگو پرشاد کے زمانے میں ۱۵۲۹ء میں ہندوستان کا مشہور بادشاہ مغل اعظم جلال الدین محمد اکبر اپنے والد ہمایوں کی جلاوطنی کے دوران حمیدہ بیگم کے بطن سے عمر کوٹ میں پیدا ہوا تھا' جب اکبر بادشاہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس علاقے کا لگان (ڈھل) معاف کر دیا تھا لیکن ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے سندھ پر قبضے کے بعد اس علاقے میں ڈھل کی وصولی کا نظام دوبارہ نافذ کر دیا۔انگریزوں کے قبضے کے بعد ونگے کے اربابوں نے تو انگریزوں کی اطاعت گزاری قبول کر کے اپنی جاگیریں محفوظ کر لیں لیکن نگر پارکر کے کرن سنگھ' لادھو سنگھ اور روپلو کولہی نے ڈھل کی وصولی کا انگریزی فرمان ماننے سے انکار کر دیا اور انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی جس کی پاداش میں انہیں پھانسیوں اور کالے پانی کی سزائیں سنائی گئیں جبکہ انگریزوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے والے رانوں کو جاگیریں عطا کی گئیں اور انہیں مراعات سے نوازا گیا۔

رتن سنگھ سوڈھو ٹھاکر تھا' جو عمر کوٹ اور چھاچھرو علاقے کی ڈھل وصولی کے ٹھیکے لیتا تھا۔عمر کوٹ کے بنیوں نے ڈھل وصولی کے ٹھیکے حاصل کرنے کیلئے کھیجراڑی سید محمد علی شاہ کے ساتھ مل کر رقم دے کر محمد علی شاہ کے نام پر ٹھیکہ حاصل کر لیا جس پر رتن سنگھ کو سخت غصہ آیا اور اس نے بدلے کی ٹھان لی۔بارشوں کے بعد فصل کی تیاری اور کٹائی کے بعد محمد علی شاہ مقررہ علاقوں میں ڈھل کی وصولی کیلئے اپنی گھوڑی پر آیا تو رتن سنگھ اس کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوا۔وہ ڈھل وصول کرتے کرتے

تھک کرایک درخت کے نیچے آرام کررہا تھا کہ رتن سنگھ نے محمد علی شاہ کو سوتے میں بندوق کے فائر کر کے ہلاک کر دیا اور فرار ہو گیا۔ بڑی کوششوں کے بعد وہ گرفتار ہوا' اس کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہوا۔ سیدوں نے مقدمے میں دل کھول کر رقم خرچ کی اور خوب اثر ورسوخ استعمال کیا جس پر انگریز عدالت نے رتن سنگھ کو موت کی سزا سنادی۔ ٹھاکر رتن سنگھ کے رشتے داروں اور جاگیرداروں نے بھی اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے انگریز حکومت تک رسائی حاصل کی اور اپیل کی کہ رتن سنگھ کی سزائے موت معاف کر دی جائے جس پر اس کی پھانسی کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔

ٹھاکر رتن سنگھ کی سزا میں تخفیف پر مبنی برطانوی حکومت کا فرمان لندن سے سندھ پہنچا تو بنیوں نے مقامی پوسٹ ماسٹر سے ملی بھگت کر کے برقی تار کو اس وقت تک کے لئے رکوا دیا جب تک رتن سنگھ کو پھانسی نہ ہو جائے۔ حکومتی سطح پر موت کی سزا ٹلنے کے باوجود بالآخر رتن سنگھ پھانسی پا گیا۔ جب وہ پھندے پر جھول گیا تو سزائے موت سے عمر قید میں تبدیلی کا سرکاری پروانہ متعلقہ عدالت کو بھجوا دیا گیا۔ یہ سازش زیادہ دن تک چھپی نہ رہ سکی اور جلد سارے کردار بے نقاب ہو گئے۔ اس سازش کے پکڑے جانے پر پوسٹ ماسٹر اور سازش میں ملوث بنئے بھی سزا پا گئے۔ برطانیہ سرکار نے اس کے بدلے میں ٹھاکروں کو بڑی جاگیر عطا کی۔ یہ جاگیر آج بھی عمر کوٹ کے قریب رانا چندر سنگھ کی ملکیت ہے۔ رانا رتن سنگھ' رانا چندر سنگھ کے دادا کا بھائی تھا۔

ٹھاکر رانا رتن سنگھ کے پاس ایک سفید گھوڑی تھی جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنے مالک کی بے حد وفادار ہے۔ روایت ہے کہ جب رانا رتن سنگھ قتل کے مقدمے میں عمر کوٹ کے قلعے میں قید تھا تو اس کی وفادار گھوڑی نے اپنے مالک کے پاس جانے کے لئے کئی بار سر توڑ کوششیں کیں اور قلعے کا دیوہیکل دروازہ پھلانگنے کی کوششوں میں ہی اپنی جان ہار دی۔ اس وفادار گھوڑی کی ٹاپوں کے نشان آج بھی قلعہ عمر کوٹ کے دروازے پر موجود ہیں۔

روایت ہے کہ سکھوں کے خلاف علم جہاد اٹھائے سید احمد شہید بریلوی اور سید اسماعیل شہید بالاکوٹ جاتے ہوئے عمر کوٹ بھی آئے تھے' جہاں ٹھاکروں نے ان کی بڑی مہمان نوازی کی اور سکھوں سے جنگ کرنے کیلئے انہیں اسلحہ' گھوڑے اور افرادی قوت بھی مہیا کی تھی۔ سید احمد شہید اپنے مٹھی بھر جانثاروں کے ہمراہ حیدر آباد' پیر جو گوٹھ سے ہوتے ہوئے بالاکوٹ پہنچے' جو ان دنوں سکھوں کی عملداری میں تھا' جہاں پنجاب کے بادشاہ رنجیت سنگھ سے جنگ کرتے ہوئے اپنے

ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔

رانوں کے زیر تسلط علاقوں میں ڈھاٹکی اور پارکری زبانیں بولی جاتیں ہیں۔ مٹھی چھاچھرو اورڈیپلو میں ڈھاٹکی اورنگر پارکر میں پارکری زبان بولی جاتی ہے جو سندھی زبان کے تھری لہجے ہیں۔

رانوں کا ذکر چلا ہے تو تو ذرا ''اینمی پراپرٹی'' کے بارے میں بھی آپ کو بتا تا چلوں۔ دشمن کی زمین کی اصل حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ ۱۹۴۶ء میں تقسیم ہند کے معاملات طے کرتے ہوئے حق خود ارادیت کے تحت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ ہندو اکثریت والے علاقے بھارت کے ساتھ رہیں گے جبکہ مسلمان آبادی والے علاقے پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گے۔ تھر میں ۷۰ رفیصد آبادی ہندوؤں کی تھی مگر اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ اس لئے ہو گیا کہ یہ علاقہ صدیوں سے سندھ کا حصہ تھا۔ تقسیم ہند کے وقت بھارتی وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل اور پنڈت جواہر لعل نہرو نے تھر پارکر کو ہندوستان میں شامل کرانے کیلئے دعویٰ کیا تھا' مگر ان کی بات نہیں سنی گئی اور گاندھی جی نے بھی اس سلسلے میں کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا' اس لئے یہ علاقہ صدیوں سے سندھ کا جزو ہونے کی وجہ سے پاکستان کے حصہ میں آ گیا۔ اس علاقے میں ۱۹۶۲ء میں رن آف کچھ میں پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ بھی ہوئی تھی۔

۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران تعلقہ مٹھی تعلقہ ڈیپلو کا علاقہ اور آدھا چھاچھرو بھارت کے قبضے میں چلا گیا تھا۔ اس علاقے سے ہزاروں ہندو خاندان یہاں سے فرار ہو کر بھارت بھاگ گئے تھے۔ یہاں سے فرار ہو کر بھارت بھاگنے والے ہندوؤں میں بڑی تعداد رانوں (ٹھاکروں) کی تھی' جن کی عرصہ دراز سے یہاں بالادستی قائم تھی۔ دوسری جانب سرحد کے ساتھ راجستھان کے علاقے میں آباد مسلمانوں پر ہندوؤں نے ظلم وستم کا بازار گرم کیا تو ۵۰ ہزار کے قریب مسلمان ہجرت کر کے تھر پارکر آ گئے تھے۔

بعد ازاں شملہ معاہدے کے تحت بھارت کے قبضے میں تھر پارکر کے تمام علاقے واپس پاکستان کو مل گئے مگر تھر پارکر (پاکستان) چھوڑ کر بھارت جانے والا کوئی ہندو راجپوت پلٹ کر نہیں آیا' جس پر مقامی لوگ انہیں دشمن کہنے لگے اور ان کی چھوڑی ہوئی ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین ''دشمن کی زمین'' کہی جانے لگی۔ اس اراضی پر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھارتی علاقے سے ہجرت کر کے تھر پارکر پناہ لینے والے تباہ حال مسلمانوں نے رہنا شروع کر دیا اور وہ آج تک اسی ''اینمی پراپرٹی'' پر رہتے

اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

۱۹۶۴ء کے انتخابات میں چھاچھرو سے کامیاب ہوکر مغربی پاکستان اسمبلی کا رکن منتخب ہونے والا ٹھاکر لچھمن سنگھ (غالباً ٹھاکر رانا چندر سنگھ کا چچا) ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پارلیمانی سیکرٹری ہوتے ہوئے بھی بھارت فرار ہوگیا تھا اور آج کل راجستھان (بھارت) کے ضلع باڑھ میر کے ایک شہر چوٹن میں آباد ہے۔ جس ملک نے اسے عزت دی وہ اسے ٹھکرا کر رات کے اندھیرے میں دشمن ملک جا بسا۔ عمرکوٹ کے بے تاج بادشاہ رانا چندر سنگھ کے بڑے بیٹے کنور ہمیر سنگھ کا دعویٰ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں تھر کی ۷۰ رفیصد آبادی ہندو ہونے کے باوجود انہوں نے سندھ اور پاکستان کی محبت میں یہاں رہنا قبول کیا لیکن رانوں (ٹھاکروں) کے ناقدین کہتے ہیں کہ پاکستان میں رہنا ٹھاکروں کی مجبوری تھی کیونکہ انہوں نے انگریزوں سے بخشش میں ملی ہوئی اتنی بڑی جاگیر چھوڑنا گوارہ نہیں کی۔

مقامی مسلمان، ٹھاکروں کی مسلمانوں سے عصبیت کو بے نقاب کرنے کے لئے کئی قسم کی عجیب وغریب مثالیں دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ٹھاکروں کی پاکستان اور مسلمانوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سابق رکن قومی اسمبلی اور ٹھاکروں کا سردار رانا چندر سنگھ صبح اٹھتے وقت کسی مسلمان کا چہرہ دیکھنا گوارہ نہیں کرتا۔ اس کی اپنے ملازمین کو سختی سے ہدایت ہے کہ وہ جب اپنے دن کا آغاز کرے تو کوئی مسلمان ان کو اپنی شکل نہ دکھا سکے۔ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو حویلی کے ذمہ داروں کی شامت آجاتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۱۹۷۱ء میں بھارت سے ہجرت کر کے تھرپارکر آنے والے لگ بھگ ۵۰ رہزار مسلمان جو، ان ہندوؤں کی زمین پر آباد ہیں جو بھارتی فوج کی حفاظت میں فرار ہوکر سرحد پار چلے گئے تھے، انہیں تھری ۷۱ء کے مہاجر کہتے ہیں۔ ان لوگوں کا موقف ہے کہ وہ راجستھان میں اپنی لاکھوں ایکڑ آباد اراضی چھوڑ کر ہجرت پر مجبور ہوئے ہیں اور ۳۸ ربرسوں سے ان زمینوں (اینمی پراپرٹی) پر آباد ہیں اور ان کا مرنا جینا اس ملک اور اس دھرتی کے ساتھ ہے۔ ان کی ایک نسل اسی سرزمین پر پل کر جوان ہوئی اور ان کے کئی پیارے ان زمینوں میں دفن ہیں۔ یہ آبادکار کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنی راجستھان میں چھوڑی ہوئی زمینوں کا حکومت پاکستان سے کوئی کلیم بھی حاصل نہیں کیا اس لئے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تھرپارکر چھوڑ کر جانے والے، جو مستقل بھارتی شہریت اختیار کر چکے ہیں، کی

ان زمینوں پر اب انہی کا حق ہے۔

دوسری طرف ٹھاکر ہمیر سنگھ دعویٰ کرتے ہیں کہ چونکہ یہ اراضی ان کے خاندان اور قبیلے کے لوگ چھوڑ کر گئے ہیں اس لئے اس زمین پر پہلا حق ہندوؤں کا ہے۔ بھارت کو اپنی تقدیر بنانے والے ہندوؤں کی تھر میں چھوڑی ہوئی اڈھائی لاکھ ایکڑ زمین سرزمینِ امن تھر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نزاع کا باعث بنی ہوئی ہے۔ یہ معاملہ بتدریج سنگین ہوتا جا رہا ہے‘ حکومت نے اگر اس معاملے کی بروقت چھان بین نہ کرائی اور اس کا منصفانہ فیصلہ نہ کیا تو مستقبل میں تھر میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ سکتے ہیں۔



تھر پارکر کا سیاسی نقشہ

(۱۹۵۲ء سے ۲۰۰۲ء)

میں آپ کو تھر کے سفر پہ لے کر نکلا ہوں تو ضروری ہے کہ اس عظیم صحرا کے سیاسی اور انتخابی رنگ بھی آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا چلوں۔ آپ جانتے ہیں کہ پاکستان میں سیاسی رجحانات کافی متلون رہے ہیں۔ روز اول ہی سے مفاد پرستی اور غیر نظریاتی سیاست کی وجہ سے نت نئے اتحاد اور وفاداریاں وجود میں آتی رہتی ہیں۔ قبل از انتخابات اور بعد از انتخابات مخصوص حالات کے پیشِ نظر سیاست دانوں کی وفاداریاں اور وابستگیاں بدلتی رہتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں اور ان کے نظریات کے برعکس قومی سیاست پر شخصیات کا غلبہ رہتا ہے۔ اس سرطان کی وجہ سے ملک میں جمہوری تصورات جڑ نہیں پکڑ سکے اور انتخابات کی سیاست پر چند شخصیات اور خاندانوں کی گرفت رہتی ہے جو پیسے اور اپنی شخصیت کے بل بوتے پر ہر دور میں کامیابیاں سمیٹتے ہیں۔ انگریزی دور سے لے کر پرویزی دور تک کے انتخابات کا نتیجہ اٹھا کر دیکھ لیں، چند مخصوص شخصیات اور خاندان ہیں جو یہاں کی سیاست پر چھائے ہوئے ہیں۔

تھر پارکر کے سیاسی افق پر بھی سیاسی جماعتوں کے نعروں اور نظریات سے زیادہ ذات برادری، شخصیات اور چند خاندانوں کی بنیاد پر حمایت مخالفت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ یہاں کا ووٹر بھی قبائلی اور جاگیردارانہ سماج کی طرح بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جاتا ہے۔ صدیوں سے تھری وڈیرہ شاہی کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور حد درجہ پسماندگی کی وجہ سے ان کی ان جکڑ بندیوں سے نکلنے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ انتخابات کے دنوں میں وڈیروں اور قبائلی سرداروں کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ سیاسی جماعتوں سے سودے بازی کر کے جس کی جھولی میں چاہیں اپنے زیرِ تسلط

ووٹوں کی خیرات ڈال دیں۔آزادی سے پہلے بھی یہی ہوتا تھا' آزادی کے بعد بھی یہی ہورہا ہے۔کہنے کو ملک آزاد ہو گیا ہے لیکن تھرپارکر کے عوام آج بھی غلامی کی زندگی جی رہے ہیں۔

تھرپارکر کے بعض مسلمان قبائل ملک کی بڑی گدیوں کے زیراثر ہیں۔درگاہ عالیہ راشدیہ کنگری شریف' درگاہ مخدوم سرورنوح ہالا اور درگاہ غوثیہ حضرت بہاالدین ذکریا ملتانیؒ کے مریدین کی بڑی تعداد یہاں آباد ہے اوران گدیوں کے عقیدت مند سرحد پار بھارتی راجستھان میں بھی آباد ہیں۔تھرپارکر میں جب بھی انتخابات ہوتے ہیں ان درگاہوں کے نمائندے سجادہ نشینوں کے پیغام لے کرآتے ہیں اور پیر صاحبان کے حمایت یافتہ امیدواروں کی کامیابی کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ پیر صاحب پاگاڑو' مخدوم طالب المولیٰ' مخدوم امین فہیم اور مخدوم سجاد حسین قریشی' مخدوم شاہ محمود قریشی ہر انتخاب میں اپنے تھر میں موجود مریدوں کو چٹھیاں بھیج کران کے ووٹ اپنے من پسند امیدواروں کے حق میں ڈلواتے رہے ہیں۔بسااوقات پیر صاحبان خود یاان کے صاحب زادگان مریدین کو زیارت کا شرف بخشتے ہیں اوران کے ووٹ اپنے حمایت یافتہ امیدواروں کو دلواتے ہیں۔

۱۹۳۵ء تک سندھ صوبہ ممبئی (ہندوستان) کا حصہ تھا تو ڈاکٹرارباب غلام رحیم کے چچا' خان صاحب ارباب توگاچی ممبئی کی قانون ساز اسمبلی کے تھرپارکر سے رکن تھے۔ان کے ساتھ سندھ کے سابق وزیراعلیٰ ممتازعلی بھٹو کے والد نواب نبی بخش بھٹو' رکن قومی اسمبلی سید قربان علی شاہ کے والد سید غلام نبی شاہ' غلام محمد خان بھرگڑی (جن کے نام سے کوٹ غلام محمد شہر موسوم ہے) قومی اسمبلی کے سابق ڈپٹی اسپیکر سید ظفر علی شاہ کے والد سید الہڈنوشاہ' عبدالحفیظ پیرزادہ کے والد عبدالستار پیرزادہ بھی ممبر تھے۔۱۹۳۶ء میں ممبئی سے سندھ کی علیحدگی کے بعد ۱۹۳۷ء میں منعقد ہونے والے سندھ اسمبلی کے انتخابات میں ارباب توگاچی دوبارہ تھرپارکر سے کامیاب ہو گئے۔ ان انتخابات میں مغربی تھرپارکر سے میراللہ داد خان تالپور اور مشرقی تھرپارکر سے سید غلام نبی شاہ سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

قیام پاکستان سے ایک سال قبل ۱۹۴۶ء میں ہونے والے سندھ اسمبلی کے انتخابات میں تھرپارکر رسانگھڑ کی نشست پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر خان بہادر غلام محمد وسان' تھرپارکر کی دوسری نشست پر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر خان صاحب ارباب توگاچی اور تیسری نشست پر مسلم لیگ کے

ٹکٹ پر ہی میر احمد خان تالپور کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ ۱۹۴۶ء کے صوبائی انتخابات کی خاص بات یہ تھی کہ صرف تھرپارکر کی تینوں نشستوں ہی سے نہیں' سندھ کی ۳۳ میں سے ۳۲ نشستوں پر مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوگئے۔ مسلم لیگ کے ہاتھ نہ آنے والی جیکب آباد کی واحد نشست تھی جو سردار خان کھوسو نے آزاد حیثیت میں جیتی۔

تقسیمِ ہند کے بعد پاکستان میں جو پہلے انتخابات منعقد ہوئے وہ ۱۹۵۱ء کے پنجاب اسمبلی کے انتخابات تھے۔ مرحلہ وار ہونے والے یہ انتخابات صرف صوبائی اسمبلیوں کے لئے منعقد کئے گئے۔ اس مرحلہ وار منصوبہ کے تحت ۱۹۵۲ء میں سندھ میں ہونے والے انتخابات میں حاجی جان محمد وسائے پوٹو' خان صاحب ارباب توگاچی کو جو ناقابلِ شکست سمجھے جاتے تھے ہرانے میں کامیاب ہوگئے اور ون یونٹ کے قیام تک وہ تھر کی نمائندگی کرتے رہے۔ اس طرح خان صاحب ارباب توگاچی جو ۱۹۳۵ء سے پہلے تھرپارکر سے ممبئی اسمبلی ' ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء میں سندھ اسمبلی کے انتخابات میں جیت کر صوبائی اسمبلی تک پہنچنے کی ہیٹ ٹرک مکمل کر چکے تھے' مسلسل چوتھی بار جیتنے کا اعزاز حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ خان صاحب ارباب توگاچی کے صاحبزادے ارباب فیض اللہ تھے جو لاولد فوت ہوئے۔

۱۹۵۴ء میں پاکستان کے گورنر جنرل غلام محمد نے ۲۴ راکتوبر کو ایک فرمان کے ذریعے ملک بھر میں ہنگامی حالت نافذ کر کے مجلس قانون ساز کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد بھانپ گئے تھے کہ مجلس قانون سازان کے اسمبلی برطرف کرنے کے اختیار کو سلب کرنے اور پارلیمان کو بالادست ادارہ بنانے کی تیاریوں میں مصروف ہے تو انہوں نے پہل کرتے ہوئے قانون ساز پارلیمان پر شب خون مار دیا۔ اسپیکر مولوی تمیزالدین روپوش ہوگئے اور بھیس بدل کر سندھ چیف کورٹ پہنچے اور اس غیر آئینی اقدام کو چیلنج کر دیا۔ اس مقدمے کی پیروی کے لئے انہوں نے معروف برطانوی قانون دان ڈی این برٹ کی خدمات حاصل کیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک غلام محمد کی حکومت نے ڈی این برٹ کو اس مقدمے کی پیروی سے روکنے کے لئے انہیں گرفتار کرنے کی بھی کوشش کی لیکن غیر ملکی دباؤ پر برٹ پابند سلاسل ہونے سے بچ گئے۔

مولوی تمیزالدین نے عدالت کے روبرو یہ موقف اختیار کیا کہ آزادی ہند کے ایکٹ مجریہ ۱۹۴۷ء کی دفعہ ۸ کی ذیلی شق ۸ کے تحت قانون سازی کے لئے گورنر جنرل کی منظوری لازمی

نہیں چنانچہ مجلس قانون ساز توڑنے کا اقدام غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔ سندھ چیف کورٹ کے مکمل بنچ نے، جس کی سربراہی غیر مسلم جسٹس جناب کانسٹنٹائن کر رہے تھے، اسپیکر مولوی تمیز الدین کے موقف سے اتفاق کرتے ہوئے گورنر جنرل کے اسمبلی توڑے جانے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد نے اس فیصلے کے خلاف فیڈرل کورٹ سے رجوع کیا جس کے سربراہ جسٹس محمد منیر تھے۔ فیڈرل کورٹ میں مقدمے کی پیروی کے لئے مولوی تمیز الدین کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی، مجلس قانون ساز کی برطرفی یا بحالی کے کسی حامی رکن کو جرات نہیں ہوئی کہ وہ غیر ملکی وکیل کی فیس کا بندوبست کر سکے حالانکہ پوری اسمبلی مالدار وڈیروں اور ساہوکاروں سے بھری پڑی تھی لیکن کوئی بھی آمر ملک غلام محمد کی مخالفت مول لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ مولوی تمیز الدین بددل ہو گئے لیکن برطانوی وکیل ڈی این برٹ نے انہیں تسلی دی اپنی پیشہ ورانہ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مفت اس مقدمے کی پیروی کی۔

فیڈرل کورٹ نے اپیل کی سماعت کے بعد سندھ چیف کورٹ کا فیصلہ کالعدم قرار دیتے ہوئے گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دے دیا۔ یہی وہ پاکستان کی عدالتی تاریخ کا بدترین فیصلہ تھا جس نے پاکستان میں جمہوریت کو اشرافیہ کی لونڈی بنا کر رکھنے کی روایت کی بنیاد رکھ دی۔ ایک غیر مسلم جج نے جمہوریت اور انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا اور ایک مسلمان جج نے میرٹ اور انصاف کی دھجیاں بکھیر کر ملک کو آمریت کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا، جس کی سزا ملک اور عوام اب تک بھگت رہے ہیں۔

اسی اثنا میں یوسف پٹیل کے دائر کردہ ایک اور مقدمہ میں عدالتِ عالیہ نے حکومت کو پابند کیا کہ وہ فوری طور پر نمائندہ حیثیت کی حامل مجلس قانون ساز تشکیل دے۔ اس عدالتی حکم کے تناظر میں گورنر جنرل ملک غلام محمد کو دوسری مجلس قانون ساز کے انتخابات کروانا پڑے لیکن عدالتی حکم کے برعکس یہ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر کروانے کی بجائے ان کا انتخابی ادارہ صوبائی اسمبلیوں کے ارکان تک محدود کر کے انہیں اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے کوٹے کے مطابق مجلس قانون ساز کے ارکان منتخب کریں۔ یہ دستور ساز اسمبلی ۸۰/ارکان پر مشتمل تھی جس میں سندھ کے صرف ۶/ (پانچ مسلمان اور ایک اقلیتی رکن) ارکان موجود تھے۔ اس طرح قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد تھرپارکر کئی سال تک اسمبلیوں میں براہِ راست نمائندگی سے محروم رہا۔

۱۹۵۸ء میں اقتدار پر قبضہ جمانے کے بعد فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے جسٹس شہاب الدین کی سربراہی میں ایک آئینی کمشن مقرر کیا جسے پاکستان کے نئے آئین کے لئے سفارشات مرتب کرنے کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ ایوب خان اس سے پہلے ہی پاکستان کے دونوں مشرقی اور مغربی بازوؤں میں بنیادی جمہوریت کے تصور کے تحت اسی ہزار ارکان میں سے ۹۵ء۶ رفیصد کا ''اعتماد'' حاصل کر کے صدر منتخب ہو چکے تھے۔ ان کے صدر منتخب ہونے کے تقریباً سوا سال بعد ۶ ر مئی ۱۹۶۱ء کو جسٹس شہاب الدین کمشن نے اپنی رپورٹ صدر ایوب خان کو پیش کر دی جس میں نوزائیدہ مملکت میں مقبول اور مخلص سیاسی جماعتوں اور قیادت کے فقدان کو پارلیمانی نظام کی ناکامیوں کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ اس رپورٹ کا کئی مختلف کمیٹیوں نے جائزہ لیا اور صدر کے منظور نظر ایک غیر منتخب اور نااہل ٹولے کا خفیہ طریقے سے تیار کیا گیا نیا آئین یکم مارچ ۱۹۶۲ء کو ملک کے عوام پر مسلط کر دیا گیا۔

اس نئے آئین کے تحت ۲۸ را پریل ۱۹۶۲ء کو بالواسطہ انتخابات منعقد ہوئے۔ ان دنوں تھرپارکر (جو آج کے تھر، میر پور خاص اور عمر کوٹ اضلاع پر مشتمل تھا) کے لئے قومی اسمبلی کی ایک ہی نشست مختص تھی۔ اس معرکہ میں صدر محمد ایوب خان کی جماعت کنونشن لیگ کے امیدوار پیر غلام رسول شاہ جیلانی اور جام صادق علی، خان بہادر غلام محمد وسان سے شکست کھا گئے۔ ۱۶ ر جولائی ۱۹۶۲ء کو نو منتخب اسمبلی نے سیاسی جماعتوں کی بحالی کا بل کثرتِ رائے سے منظور کیا جس کی رو سے تمام سیاسی جماعتیں بحال ہو گئیں۔ اس نئی صورتِ حال میں مسلم لیگ دو دھڑوں کنونشن مسلم لیگ اور کونسل مسلم لیگ میں بٹ گئی۔ صدر ایوب خان کنونشن مسلم لیگ کی رکنیت لے کر اس کے بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے جبکہ کونسل مسلم لیگ کی صدارت خواجہ ناظم الدین نے سنبھال لی۔

۶۵-۱۹۶۴ء میں منعقد ہونے والے عام انتخابات چار مرحلوں میں منعقد ہوئے۔ سب سے پہلے اکتوبر نومبر ۱۹۶۴ء میں بنیادی جمہوریت کے ارکان چنے گئے۔ پھر ۲ ر جنوری ۱۹۶۵ء کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح اور صدر ایوب خان کے درمیان صدارتی انتخاب کا تاریخی معرکہ ہوا جس میں زبردست دھاندلی کے ذریعے مادرِ ملت کو شکست سے دوچار کیا گیا، پھر مارچ اور مئی ۱۹۶۵ء میں بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کرائے گئے۔ اس انتخاب میں تھرپارکر کی قومی اسمبلی کی واحد نشست این ڈبلیو ۴۷ ر سے خان بہادر غلام محمد وسان ایک بار پھر منتخب ہو

گئے۔انہوں نے غلام رسول شاہ جیلانی کو شکست دی تھی جو کنونشن لیگ کے امیدوار تھے۔

ایوب خان کی ۱۹۶۹ء میں رسوا ہو کر اقتدار سے علیحدگی کے بعد مارشل لا حکومت کے سربراہ جنرل یحییٰ خان نے ون یونٹ توڑنے اور شفاف انتخابات کرانے کا وعدہ کیا جس کے تحت ۱۹۷۰ء میں پہلی مرتبہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات کرائے جنہیں ملکی تاریخ کے سب سے زیادہ آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات قرار دیا گیا مگر یہ شفاف انتخابات پاکستان کو دولخت ہونے سے نہ بچا سکے۔ان عام انتخابات میں تھرپارکر کی قومی اسمبلی کی دو نشستوں میں سے ایک این اے ۱۲۲ ر تھرپارکر I پر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار میر علی بخش خان تالپور نے ۶۹,۴۲۷ ر ووٹ لے کر کونسل مسلم لیگ کے امیدوار خان بہادر غلام محمد وسان کو ۸۵۷,۱ ر ووٹوں کی برتری سے شکست دی۔ خان بہادر غلام محمد وسان کی شکست کا سبب جمعیت علمائے پاکستان' جماعت اسلامی' جمعیت علمائے اسلام کے امیدواروں کے علاوہ چار آزاد امیدوار بھی تھے' جن کے ووٹوں کی مجموعی تعداد ۲۴ ر ہزار سے زائد بنتی ہے۔یہ دینی ووٹ بینک تھا جو اس وقت کی فضا میں سوشلزم مخالف امیدوار خان بہادر غلام محمد وسان ہی کو ملنا تھا۔دوسری نشست این اے ۱۲۳ ر تھرپارکر II سے پاکستان پیپلز پارٹی ہی کے امیدوار پیر غلام رسول شاہ جیلانی نے ۷۵,۶۳۸ ر ووٹ لے کر جماعت اسلامی کے امیدوار محمد یوسف کو ۵۸,۲۲۴ ر ووٹوں کی بھاری اکثریت کے ساتھ شکست سے دوچار کیا' جماعتی امیدوار صرف ۱۷,۴۱۴ ر ووٹ حاصل کر سکا۔ گو کہ خان بہادر قومی اسمبلی کا انتخاب ہار گئے لیکن سندھ اسمبلی کے ضلع تھر کے دو حلقوں سے ان کے گروپ کے امیدوار ارباب امیر حسن ڈیپلو اور علی قطب شاہ میر پور خاص سے کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے اور پیپلز پارٹی کے امیدواروں کو شکست دی۔ واضح رہے کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے یہ انتخابات ایک ہی روز نہیں بلکہ وقفے سے منعقد ہوئے تھے۔

۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں میر علی بخش خان تالپور کے ہاتھوں شکست کے بعد خان بہادر غلام محمد وسان قانونی جنگ لڑنے کی تیاریوں میں تھے۔کہا جاتا ہے کہ انہوں نے شکست کا زیادہ اثر لے لیا تھا۔ وہ ۲۶ دسمبر ۱۹۷۰ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ ان کی نرینہ اولاد نہیں تھی' وسان خاندان نے ان کے متبنیٰ نیاز محمد خان وسان کو آگے بڑھایا اور ۱۹۷۷ء میں شہید ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں ہونے والے قبل از وقت انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار کی

حیثیت سے نیاز وسان نے قومی اسمبلی کے حلقہ این اے ۱۷۵ تھر پارکر III سے بلا مقابلہ کامیابی حاصل کی۔ وہ جنرل ضیاالحق کے ہاتھوں مارشل لا لگائے جانے تک سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے وفاقی وزیر بھی رہے۔ ان انتخابات میں تھر پارکر کی دیگر دو نشستوں این اے ۱۷۳ تھر پارکر I سے پیر غلام رسول شاہ جیلانی نے ۸۱,۷۰۰ ووٹ لے کر مدمقابل قومی اتحاد کے میر علی احمد خان تالپور (۳۸,۱۱۳) کو چت کیا اور این اے ۱۷۴ تھر پارکر II سے سید خادم علی شاہ نے ۹۸,۹۲۳ ووٹ لے کر قومی اتحاد کے امیدوار منظور حسین کو شکست دی، قومی اتحاد کا امیدوار صرف ۱۹,۹۰۳ ووٹ لے پایا۔ ان دونوں کامیاب امیدواروں کا تعلق بھی پاکستان پیپلز پارٹی سے تھا۔

تھر پارکر کا ارباب خاندان پاکستان بننے کے بعد بھی انتخابی سیاست میں کافی سرگرم رہا لیکن ۱۹۵۲ء میں ارباب توگاچی کی حاجی جان محمد وسائے پوٹو کے ہاتھوں شکست سے ارباب سیاست سے دلبرداشتہ ہو گئے اور کم وبیش ۳۳ سال تک اربابوں کی سیاسی سرگرمیاں ماند پڑ ی رہیں۔ اس عرصہ میں ارباب خاندان زیادہ تر مقامی سیاست میں غلطاں و پیچاں رہا۔ صرف ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں ارباب امیر حسن نے کونسل مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ڈیپلو کی نشست پر صوبائی انتخاب جیتا تھا لیکن جب جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کیا تو ارباب خاندان ایک بار پھر عام انتخابات کی سیاست میں کود پڑا۔

جنرل ضیاالحق نے جب ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی انتخابات کرائے تو پہلی بار ارباب خاندان نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا۔ اس سے قبل ارباب صوبائی اسمبلی اور ضلعی بلدیات کے انتخابات میں حصہ لیتے رہے تھے۔ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں ارباب امیر حسن نے این اے ۱۷۶ تھر پارکر III پر ۵۲,۵۲۶ ووٹ لے کر درپردہ پیپلز پارٹی کے حمایت یافتہ امیدوار حاجی غلام محمد لاٹ کو ۱۶,۵۳۳ کی سبقت سے شکست سے دوچار کیا جنہوں نے ۳۶,۸۹۳ ووٹ حاصل کئے۔ این اے ۱۷۴ تھر پارکر I پر میجر جنرل (ر) بشیر احمد خان قائم خانی نے ۴۸,۹۸۳ ووٹ لے کر مضبوط ترین امیدوار سید قربان علی شاہ کو شکست دی۔ سید قربان علی شاہ کو ۴۳,۱۹۹ ووٹ ملے جبکہ این اے ۱۷۵ تھر پارکر II پر یک طرفہ مقابلے میں خیر محمد بھرگڑی نے ۵۱,۷۳۱ ووٹ حاصل کر کے ۳۵,۶۱۵ ووٹوں کے فرق سے محمد شفیع کو ہرایا۔

۱۹۸۸ء کے جماعتی بنیادوں پر ہونے والے انتخابات میں ارباب خاندان کے سربراہ

ارباب امیر حسن نے اپنی آبائی نشست این اے ۱۷٦ تھرپارکر III سے آزاد حیثیت میں ۴۱,۲۷۹ ووٹ حاصل کر کے اپنے روایتی حریف حاجی غلام محمد لاٹ کے صاحبزادے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار گل محمد لاٹ (۳۸,۴٦۹) کو شکست دی۔ تھرپارکر کی قومی کی دیگر دو نشستوں پر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں نے کامیابی حاصل کر لی۔ این اے ۱۷۴ تھرپارکر I پر سید قربان علی شاہ نے ۳۹,۴۷۱ ووٹ لے کر ایم کیو ایم کے امیدوار انیس احمد خان (۳۰,۷۵۹) کو ہرایا۔ اس نشست پر آئی جے آئی کے پیر آفتاب شاہ جیلانی' آزاد امیدوار میجر جنرل (ر) بشیر احمد خان قائم خانی اور عوامی اتحاد کے امیدوار اشرف لیاقت علی خان (شہید وزیر اعظم لیاقت علی خان کے صاحبزادے) بھی پیپلز پارٹی کے امیدوار کے مدمقابل تھے لیکن وہ بھی ناکام رہے۔ یوں تو اس حلقے میں اٹھارہ امیدوار میدان میں تھے لیکن سید قربان علی شاہ کے مقابلے پر موجود ان قابل ذکر چار امیدواروں کے ووٹوں کی تعداد ان کے حاصل کردہ ووٹوں سے کہیں زیادہ تھی۔

اپنے انقلابی نظریات کی پاسداری کے لئے قید و بند کی صعوبتیں اور روپوشی کی اذیتیں جھیلنے والے تھر کے ایک سپوت کامریڈ جام ساقی بھی ۱۹۸۸ء کی نشست این اے ۱۷٦ تھرپارکر تین سے آزاد حیثیت سے میدان میں تھے لیکن ان کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ دھرتی کی جنگ میں زندگی بھینٹ کرنے والے اس عظیم سپاہی کو صرف ۱,۷۵۲ ووٹ مل سکے۔ پاکستان میں انتخابی سیاست کاروبار سے کم نہیں' یہ مہم انقلابی نظریات یا محض عوام سے دردمندی کے جذبوں سے سر نہیں کی جا سکتی۔ پاکستان میں انتخابی جنگ جیتنے کے لئے پس منظر' پیسہ اور پشت پناہی لازمی عنصر ہے جس کے پاس یہ سب کچھ نہیں ہے وہ عوام کی نمائندگی کا حق دار نہیں ہو سکتا۔

تھرپارکر میں دیوتا کی طرح چاہے جانے والے سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو بھی ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں این اے ۱۷۴ تھرپارکر I پر آزاد حیثیت میں انتخاب لڑے مگر وہ بھی روایتی وڈیرہ شاہی کی سیاست کا مقابلہ نہیں کر سکے اور شکست ان کا بھی مقدر بنی۔ یہی نہیں بلکہ وہ این اے ۱۸۱ سانگھڑ II پر آئی جے آئی کے ٹکٹ پر ایک اوسط درجے کے وڈیرے اور پیپلز پارٹی کے امیدوار شاہ نواز جونیجو سے لگ بھگ انیس ہزار ووٹوں کے فرق سے ہار گئے۔ ان کی شکست پیر صاحب پاگاڑو کی ان سے خفگی بتائی جاتی ہے۔ ان کی آبائی نشست پر شکست کا ایک اور سبب ایم کیو ایم کے امیدوار محمد ایوب شیخ کی موجودگی بھی تھی۔ محمد خان جونیجو نے ۳۰,۹۴۲ شاہ نواز

جونیجو نے ۴۹,۸۷۹ راور محمد ایوب شیخ نے ۲۴,۱۰۴ رووٹ لئے۔ محمد ایوب شیخ اگر میدان میں نہ ہوتے تو یہ ووٹ روایتی طور پر پیپلز پارٹی کے خلاف پڑتے اور محمد خان جونیجو جیت جاتے۔ بادشاہ گر پیر صاحب پاگاڑو نے ۱۹۸۵ء میں محمد خان جونیجو کو این اے ۱۸۰ رسانگھڑ I سے نہ صرف بلا مقابلہ منتخب کرایا تھا بلکہ جنرل ضیا الحق سے سفارش کر کے انہیں وزیر اعظم کے منصب تک پہنچایا لیکن ۱۹۸۸ء میں محمد خان جونیجو' بادشاہ گر پیر صاحب پاگاڑو کی تائید سے محروم ہونے کے باعث اپنی نشست بھی نہ بچا سکے۔

این اے ۱۷۵ تھر پارکر II پر سید علی نواز شاہ (۳۴,۳۲۳) نے آزاد امیدوار حاجی خیر محمد بھرگڑی (۱۸,۴۱۸) کو چت کیا۔ حاجی خیر محمد بھرگڑی ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی بنیادوں پر ہونے والے انتخابات میں کامیاب رہے تھے مگر اس بار جماعتی انتخابات میں وہ آزاد حیثیت میں انتخابی بازی ہار گئے۔ ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں عمر کوٹ کے رانا چندر سنگھ ہندو اور شیڈ ولڈ کاسٹس کی نشست پر ۵۵,۶۷۳ رووٹ لے کر کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

۱۹۸۸ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی سربراہی میں قائم ہونے والے سیاسی نظام کو ابتدا ہی سے مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ مرکز میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی لیکن ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں ان کے مخالف اتحاد آئی جے آئی کی حکومت تھی جو وفاقی حکومت کو نیچا دکھانے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دے رہی تھی۔ مبینہ طور پر افواج کے سربراہ اور صدرِ مملکت بھی در پردہ پیپلز پارٹی مخالف قوتوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی جو ناکام ہوئی لیکن حکومت مخالف قوتیں کھل کر سامنے آ گئیں اور بالآخر ۶ راگست ۱۹۹۰ء کو صدرِ مملکت غلام اسحٰق خان نے الزامات کی ایک طویل فہرست کے ساتھ بے نظیر حکومت برطرف کر دی۔ ۲۴ ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو قومی اور ۲۷ ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو صوبائی اسمبلی کے انتخابات ہوئے جس میں پاکستانی اشرافیہ کی خواہش اور کوشش کے مطابق اسلامی جمہوری اتحاد کامیاب رہا۔

۱۹۹۰ء کے ان عام انتخابات میں ارباب امیر حسن خود بھی امیدوار تھے لیکن وہ اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر ارباب غلام رحیم (جو جنرل پرویز مشرف کے دورِ حکومت میں سندھ کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے) کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے پہلی بار قومی اسمبلی کے

انتخابات میں آزاد حیثیت میں حصہ لیا' اس سے قبل وہ ضلع کونسل تھرپارکر کے چیئرمین رہے تھے۔ ان کے مدِ مقابل پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار پاکستانی نژاد امریکہ کے معروف صنعتکار ڈاکٹر فقیر محمد حفیظ ہالیپوتہ تھے۔ یہ حضرت روپے پیسے کے بل بوتے پر انتخاب جیت کر وزارت لینے کے چکر میں پاکستان آئے تھے۔ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ انتخاب پاکستان کی تاریخ کا سب سے مہنگا ترین انتخاب تھا۔ این اے ۱۷۶ تھرپارکر III کے اس انتخاب میں مہمان امیدوار فقیر ڈاکٹر محمد حفیظ ہالیپوتہ کا پیسہ اربابوں کے ڈنڈے کا مقابلہ نہ کرسکا۔ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے باوجود ڈاکٹر فقیر محمد حفیظ ہالیپوتہ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے مقابلہ پر کامیابی حاصل نہ کرسکے اور ان کے حاصل کردہ ۸۷,۷۴۴/ ووٹوں کے مقابلے میں صرف ۴۹,۵۵۵/ ووٹ حاصل کرسکے۔ ڈاکٹر ہالیپوتہ شکست کھا کر خاموشی سے دوبارہ امریکہ واپس چلے گئے۔

۱۹۹۰ء کے ان عام انتخابات میں این اے ۱۷۴ تھرپارکر I سے ایم کیو ایم کے انیس احمد خان نے ۴۴,۹۰۹/ ووٹ حاصل کرکے پیپلز ڈیموکریٹک الائنس کے امیدوار سید قربان علی شاہ (۴۴,۴۹۳) کو شکست دی۔ اس بار اس نشست پر کانٹے کا مقابلہ ہوا لیکن ۱۹۸۸ء میں تھرپارکر سے انیس احمد خان کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرنے والے سید قربان علی شاہ اس بار صرف ۴۱۶/ ووٹوں کے فرق سے یہ نشست کھو بیٹھے۔ اس نشست پر عبدالغفار قریشی آئی جے آئی کی طرف سے امیدوار تھے مگر وہ بھی ناکام ٹھہرے۔ این اے ۱۷۵ تھرپارکر II سے اس بار سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو نے آئی جے آئی کے ٹکٹ پر ۳۲,۰۱۹/ ووٹ لے کر پیپلز ڈیموکریٹک الائنس کے امیدوار سید علی نواز شاہ کو شکست دی جنہوں نے ۲۸,۹۳۰/ ووٹ لئے۔ سید علی نواز شاہ نے ۱۹۸۸ء کے عام انتخابات میں اسی نشست پر حاجی خیر محمد بھرگڑی کو شکست دی تھی مگر اس بار وہ سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو سے ہار گئے۔

۱۹۹۳ء کے عام انتخابات ۶/ اکتوبر کو منعقد ہوئے۔ اس بار ضلع تھر کو صرف ایک قومی کی نشست دی گئی کیونکہ میرپورخاص اور عمرکوٹ کو اضلاع کا درجہ مل چکا تھا اور ایک نشست عمرکوٹ' میرپورخاص اضلاع کو دی گئی۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر ارباب غلام رحیم پاکستان پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے اور اس کے ٹکٹ پر این اے ۱۷۶ سے ۶۳,۴۷۰/ ووٹ حاصل کرکے کامیابی حاصل کی۔ ان کے مدمقابل' پیر صاحب پاگاڑو کے دست راست اور پاکستان مسلم لیگ (ن) کے امیدوار

عبدالقدوس راجڑ صرف ۱۸,۲۴۲ ووٹ حاصل کر سکے۔ اس طرح ڈاکٹر ارباب غلام رحیم ۴۵,۱۶۵ ووٹوں سے کامیابی حاصل کر کے ایک بار پھر رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ قاضی عبدالقدوس راجڑ کا شمار بھی ملک کے ارب پتی افراد میں ہوتا ہے۔ کوئلے اور قیمتی پتھروں کے اربوں روپے کے ٹھیکے ان کے پاس لیز پر رہتے ہیں۔ اقلیتی نشست پر اس بار بھی عمر کوٹ کے ٹھاکر رانا چندر سنگھ کامیاب رہے۔

۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں ایک بار پھر تھر پارکر کی قومی اسمبلی کی تین نشستیں کر دی گئیں۔ اس بار این اے ۱۷۴ تھر پارکر I (میر پور خاص) پر گیارہ امیدواروں کے مابین مقابلہ تھا لیکن جن امیدواروں میں قریبی مقابلہ ہوا ان میں پیپلز پارٹی کے امیدوار پیر آفتاب شاہ جیلانی‘ پاکستان مسلم لیگ کے سید قربان علی شاہ اور ایم کیو ایم کے شبیر احمد قائم خانی شامل تھے۔ اس معرکے میں پیپلز پارٹی کے پیر آفتاب شاہ جیلانی نے ۳۴,۴۷۷ ووٹ لے کر قومی اسمبلی میں اپنی جگہ ایک بار پھر بنالی۔ ان کے قریبی حریف پاکستان مسلم لیگ کے سید قربان علی شاہ نے ۲۹,۴۱۸ اور ایم کیو ایم کے شبیر احمد قائم خانی نے ۲۸,۴۸۲ ووٹ حاصل کئے۔ اس نشست پر آزاد حیثیت میں اربابوں کے حمایت یافتہ امیدوار عبدالغفار قریشی نے بھی حصہ لیا لیکن وہ صرف ۱,۲۱۶ ووٹ حاصل کر سکے۔ این اے ۱۷۵ تھر پارکر II (عمر کوٹ) پر ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں درجن بھر امیدوار میدان میں اترے لیکن اصل مقابلہ پاکستان مسلم لیگ اور پیپلز پارٹی کے امیدواروں میں ہوا۔ یہ نشست ۲۸,۶۷۸ ووٹوں کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ کے امیدوار پیر نور محمد شاہ جیلانی کے ہاتھ رہی جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار نواب محمد یوسف تالپور ۲۲,۳۱۰ ووٹوں کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہے۔ آزاد امیدوار غلام مصطفٰے خاص خیلی نے ۵,۵۸۸ ووٹ حاصل کئے جبکہ سابق وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے صاحبزادے محمد اسد خان جونیجو بھی میدان میں تھے مگر صرف ۱,۶۰۰ ووٹ ہی لے سکے اور ان کی ضمانت ضبط ہو گئی۔

۱۹۹۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی نے این اے ۱۷۶ تھر پارکر III (تھر) پر ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے مقابلے میں مخدوم خاندان کے چشم و چراغ‘ مخدوم طالب المولیٰ کے صاحبزادے اور مخدوم امین فہیم کے چھوٹے بھائی مخدوم سعید الزمان عاطف المعروف مخدوم غلام حیدر کو لا کھڑا کیا لیکن وہ اربابوں کا پامردی سے مقابلہ نہ کر سکے۔ یہ مقابلہ خاصا دلچسپ رہا لیکن کامیابی اربابوں کا

مقدر رہی۔ مخدوم سعید الزمان عاطف' ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے ۳۵,۸۸۸ر ووٹوں کے مقابلے پر ۲۸,۸۶۰ر ووٹ حاصل کر سکے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے ۱۹۹۰ء ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۷ء کے عام انتخابات میں تھر سے مسلسل کامیابی حاصل کر کے قومی اسمبلی کی نشست جیتنے کی ہیٹ ٹرک مکمل کی۔

۲۰۰۲ء میں ہونے والے عام انتخابات سے ضلع تھر کے لئے قومی اسمبلی کی دو نشستیں کر دی گئیں۔ این اے ۲۲۹ ر تھر پارکر I پر ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے مدمقابل اربابوں کے روایتی حریف حاجی غلام محمد لاٹ کے صاحبزادے گل محمد لاٹ تھے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے امیدوار گل محمد لاٹ کو تقریباً ۵۰ر ہزار سے زائد ووٹوں کی واضح اکثریت سے شکست فاش دے کر قومی اسمبلی کی نشست پر ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۲ء تک مسلسل چوتھی بار کامیابی کا ریکارڈ قائم کیا۔ اس انتخاب میں نیشنل الائنس کے ٹکٹ پر ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے ۸۶,۱۹۶ر ووٹ حاصل کئے جبکہ گل محمد لاٹ ۳۴,۳۴۲ر ووٹ حاصل کر سکے۔ این اے ۲۳۰ ر تھر پارکر II پر بھی نیشنل الائنس اور پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدواروں میں مقابلہ یک طرفہ رہا۔ نیشنل الائنس کے امیدوار غلام حیدر سمیجو نے ۵۹,۶۳۹ر ووٹ لے کر پاکستان پیپلز پارٹی کے امیدوار پیر امداد علی شاہ جیلانی (۳۶,۷۸۵) کو ہرایا۔

۲۰۰۲ء میں ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے بیک وقت قومی نشست این اے ۲۲۹ ر تھر پارکر I اور صوبائی نشست پی ایس ۶۰ ر تھر پارکر I سے کامیابی حاصل کی۔ ڈاکٹر ارباب رحیم نے سندھ کی وزارتِ اعلیٰ کی آس میں قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ دی' ان کے استعفیٰ کے بعد اس خالی نشست پر ان کے بھتیجے ارباب ذکا اللہ بلامقابلہ کامیاب ہو گئے۔ ابتدا میں ڈاکٹر ارباب غلام رحیم' پیر صاحب پاگاڑو کی مخالفت کی وجہ سے سندھ کی وزارتِ اعلیٰ پانے میں ناکام رہے لیکن بعد میں ان کا صبر اور کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور وہ اپنی منزل حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کو "تھر کا کالا کوا" کی پھبتی کسنے والے سندھ کے بادشاہ گر پیر صاحب پاگاڑو نے بھی بالآخر ان کی خطائیں معاف کر دیں اور انہوں نے صحرائے تھر سے منتخب ہونے والے سندھ کے پہلے وزیرِ اعلیٰ ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

سندھ کی مشہور ڈیپلائی میمن برادری کا لاٹ خاندان اربابوں کا روایتی حریف سمجھا جاتا ہے۔ اس برادری کے سربراہ ارب پتی تاجر اور صنعت کار حاجی غلام محمد لاٹ ہیں جن کا دبئی'

سعودی عرب اور دیگر ممالک میں وسیع کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ حاجی غلام محمد لاٹ کیلئے مشہور ہے کہ وہ انتخابات کے دنوں میں صرف اس لئے پاکستان آتے ہیں کہ ارباب خاندان کا مقابلہ کریں۔ انتخابات ان کیلئے صرف ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارباب خاندان کو نیچا دکھانے کے لئے وہ ہر بار اس انتخابی کھیل میں کروڑوں روپے ہنسی خوشی خرچ کر کے ہار کر بیرونِ ملک چلے جاتے ہیں۔ حاجی غلام محمد لاٹ اب سیاست سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور اب ان کے صاحبزادے گل محمد لاٹ اربابوں کے مقابلے پر پاکستان پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم سے سرگرم عمل ہیں۔

تھر اپنے پرایوں سب کا زخم خوردہ ہے۔ انتخابات کے موسم میں ان کے ووٹوں کے لئے وڈیرے، جاگیردار، تاجر، صنعتکار، سیاست دان اور سیاسی جماعتیں ماروؤں کے گاؤں گوٹھوں کا طواف کر کے ان کی زندگیاں بدلنے کے وعدے کر کے کامیابیاں حاصل کرتے ہیں لیکن ماروؤں سے کیئے گئے وعدے کبھی پورے نہیں کرتے۔ تھر کا المیہ یہی ہے کہ اس کی نمائندگی کرنے کے دعویدار خود تو خاصے متمول اور موثر ہیں لیکن اس کے ماروؤں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان کی تقدیر بدلنے کے دعوے دار اسمبلیوں تک رسائی حاصل کرنے کے بعد اگلے انتخاب تک کہیں کھو جاتے ہیں۔ تھر کے ''مارو'' ان فصلی بٹیروں کے ہاتھوں ہمیشہ تماشا بنے رہتے ہیں۔



مسکین جہان خان کھوسو

صحرائے تھر میں لاتعداد یگانہ روزگار ہستیوں نے جنم لیا اور اپنے کردار اور کام کے باعث تاریخ میں امر ہو گئیں۔ کسی نے اپنی جنگجویانہ صلاحیتوں کی وجہ سے شہرت پائی تو کوئی اپنی حریت پسندی کی وجہ سے دلوں میں گھر کر گیا۔ کسی نے محبت کا میدان مار لیا تو کوئی سماجی خدمت کے شعبے میں مردِ میدان ٹھہرا۔ یہاں ہر شعبے میں ایک سے بڑھ کر ایک ہستی موجود ہے جسے تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ میں ننگر پارکر پہنچا تو اس شہرہ آفاق کردار کو نظر انداز نہیں کر سکا جو اپنی سماجی خدمات کے حوالے سے زندہ و جاوید کردار ہے۔ آج بھی تھر میں جب کوئی کسی کے ساتھ نا انصافی کرتا ہے تو لوگ اس دُرویش صفت انسان کی کمی شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کی بھی ملاقات سندھ کے ایک اور عظیم کردار سے کرواؤں۔

درمیانہ قد' مضبوط جسم' چوڑے اور معصوم چہرے کا مالک' سفید اور خوبصورت بھرپور داڑھی' ماتھا اکثر ننگا' کبھی کبھار سردیوں میں ملاؤں والی برقعے والی ٹوپی یا گرمیوں میں کھجور کی چھال سے بنی مولانا بھاشانی والی ٹوپی' ملیشیا کے کپڑے' بالکل میلے کچیلے' ایک مرتبہ پہننے کے بعد جب تک خود کپڑے گل سڑ نہ جائیں' نہیں اتارتا تھا۔ دائیں کندھے پر کتابوں' اخبارات کی گٹھڑی لادے' بائیں بازو کے نیچے دو چار کلو اخبارات کا پلندا اور اس کے ساتھ تھر پارکر کا معروف عصا ''باوری جو گیڈیو'' ہاتھ میں قلم دوات تھامے' ایڑیاں ٹوٹ کر سپاٹ ہو جانے والے سلیپر' کھڑس کھڑس کرتا' دھول مٹی اڑاتا' اپنے ساتھ تھری ''مارووں'' کا ہجوم لئے کسی دفتر کی طرف جاتا ہوا کوئی شخص نظر آئے تو یقیناً وہ

مسکین جہان خان کھوسو ہوگا!

''باوری جو گیڈیو'' نہ کوئی لکڑی ہے' نہ لاٹھی' ظاہری طور پر کسی کام کی چیز نہیں لگتی۔ یہ کوئی لاٹھی بھی نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی زہریلا سانپ' بچھو وغیرہ مارا جاسکے یا پھر سنتِ نبوی ﷺ ادا کرنے کی خاطر اٹھایا جائے کیوں کہ صرف تین فٹ کی اس لکڑی میں معشوق کی طبیعت کے بل کی طرح متعدد بل پڑے ہوتے ہیں۔ یہ تھر میں ہونے والے درخت ''باوری'' کی ایک ڈنڈی ہے۔ گردشِ ایام کی سختی سے بچانے کے لئے مسکین نے آٹھ کے قریب پیتل اور ایک لوہے کی پٹی اس لکڑی پر چڑھادی ہے۔ جب بھی مسکین کو کہیں سے اس کا ہمسفر ضعیف معلوم ہونے لگتا ہے تو وہ اس پر ایک اور لوہے یا پیتل کی پٹی لگوا دیتا ہے۔

مسکین کی گیڈیو کے لئے اتنی محبت کا راز اس وقت کی تھر کی تاریخ' جغرافیہ' تہذیب اور تمدن ہیں بلکہ حب الوطنی کے پرجوش جذبے اور سب سے بڑھ کر دُرویشوں کی داستانیں اور عقیدت کا اظہار بھی ہے۔ باوری کا درخت اتنا ہی قدیم ہے جتنا تھر' اس لئے مسکین سمجھتا ہے کہ وہ صحرا کی تاریخ اپنی مٹھی میں لئے پھرتا ہے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ مسکین کو یہ تبرک ''سو بھارے تڑ'' کی ایک بزرگ بی بی نے دعا کے طور پر دیا تھا۔ یہ گیڈیو مسکین جہان خان کھوسو کی خلوتوں اور جلوتوں کا ساتھی تھا۔ وہ لوگوں کے درمیان ہوتا تو اپنے اس دائمی رفیق سے مختلف معاملات پر مشاورت کرتا اور جب وہ گوشہ نشینی میں ہوتا تو بھی اس سے راز و نیاز کرتا' گپ شپ کرتا اور تھریوں کی تقدیر بدلنے کے منصوبوں پر صلاح مشورے کرتا۔

کھوسو اور مسکین' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کھوسو ملکیت کے معاملے میں تو مسکین ہوسکتا ہے لیکن طبیعت میں مسکین نہیں ہوسکتا۔ سندھ میں معروف کہاوت ہے کہ کھوسو جتنا بھی غریب ہو لیکن لوگوں کے سامنے خود کو ''خان'' اور ''وڈیرہ'' کی طرح ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے کھوسو اور مسکین دو متضاد چیزیں ہیں۔ لیکن قدرت نے مسکین جہان خان کھوسو کو نہ صرف مسکین بلکہ دُرویش صورت اور دُرویش سیرت بزرگ بنایا ہے لیکن وہ ایک بلند اخلاق اور نڈر بلوچ بھی ہے جو ناانصافی اور جبر کے خلاف سینہ سپر ہوگیا ہے۔ وہ تھر کے سرحدی شہر ننگر پارکر سے اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے اور راستے کے تمام گوٹھوں اور شہروں میں سائلوں کی فریادیں سنتا میرپور خاص اور کبھی کبھی حیدرآباد تک چلا جاتا ہے وہ حکومت کے نمائندوں سے تھریوں کو انصاف دلانے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ وہ جہاں

بھی جاتا ہے بھوک اور پیاس کے مارے تھری اس کے ارد گرد منڈلانے لگتے ہیں۔

مثل مشہور ہے کہ مسکین کے گاؤں ''سامی ویری''، تحصیل ننگر پارکر کے باشندے زیادہ تر دو کام کرتے ہیں ' ایک پولیس میں نوکری یا پھر چوری چکاری۔ مسکین ایک اعلیٰ بہادر بلوچ خاندان کا چشم و چراغ ہے۔ اس قبیلے کے لوگ تالپور میروں کے دور میں برسوں ان کی فوج میں فنِ سپہ گری کے جوہر دکھاتے رہے۔ وہ ڈیرہ غازی خان سے تھر میں آئے تو پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں تھر میں جاگیریں عطا کی گئیں اور اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ مسکین کے خاندان نے سندھ میں میروں کی بادشاہی کے تحت ''مارواڑ'' نام کے ایک بڑے علاقے پر برسوں تک حکومت کی۔ مسکین کے پڑ دادا خان بہادر رئیس سردار خان نے ٦ جولائی ١٨٩٦ء میں برطانوی حکومت کو اپنی جاگیر قائم رکھنے کے لئے درخواست کی تھی۔ رئیس سردار خان کا ایک بیٹا رئیس سمندر خان سات قبائل کا قومی سردار تھا۔ مسکین کے دادا مرحوم رئیس میر حسن خان سندھ پولیس میں انسپکٹر تھے اور لاڑکانہ میں شہید ہوئے۔ مسکین کے والد مرحوم رئیس بجار خان صوبیدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

مسکین کا مزاج پولیس کی نوکری کے لئے قطعی موزوں نہیں تھا لیکن خاندانی روایات کے مطابق مسکین جہان خان کھوسو کو بھی زبردستی پولیس میں بھرتی کرادیا گیا۔ اس کی آزاد طبیعت نوکری کے لئے شروع سے ہی آمادہ نہیں تھی مگر وہ والد صاحب کی حکم عدولی نہیں کر سکا۔ والد نے نوکری کے بعد ایک بہترین گھوڑا مسکین کو دلایا مگر وہ نمود و نمائش اور آسائشوں سے دور بھاگتا تھا۔ یہ گھوڑا زیادہ دنوں تک اس کے پاس رہ نہیں سکا۔ ایک دن ایک فقیر نے صدا کی، مسکین نے جیبیں ٹٹولیں تو خالی تھیں۔ اور کچھ دینے کو نہیں تھا تو گھوڑا اس کے حوالے کر دیا اور خود پیدل سمن کی تعمیل کراتا رہا۔

مسکین کا حساس اور دردمند دل' غریبوں پر پولیس کے مظالم برداشت نہیں کر سکا۔ وہ دن رات نوکری سے جان چھڑانے کے بہانے تلاش کرنے لگا لیکن اپنے والد کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن دیوان ''ٹھلر ام کمانی'' کی کسی لاچار تھری پر زیادتی برداشت نہیں کر سکا تو اس کے ساتھ زوردار لڑائی کر کے نوکری چھوڑ کر گاؤں لوٹ آیا۔ پولیس کی نوکری نے اس کی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اب اس نے اپنی زندگی ستم زدہ تھریوں کے لئے وقف کر دی۔ وہ غریبوں کے کاموں میں اس طرح مشغول ہو گیا کہ پھر کبھی کپڑوں کی پروا رہی' نہ کھانے پینے کی طلب۔ مسکین ١٩٣٧ء میں نوکری چھوڑ کر ٣٠ / برس سے زائد عرصے تک خدائی مددگار بنا رہا۔ مہینوں غریبوں کے کاموں کے

لئے گھر سے باہر رہتا۔ کسی رشتہ دار کی موت کی اطلاع پر گھر آ جاتا ورنہ نوکری چھوڑنے کے بعد زندگی بھر گھر دراور خاندان قبیلے کی فکر کبھی نہیں کی۔

ویسے تو مسکین جہان خان کھوسو عام دنوں میں بھی اپنے محبوب تھری ماروؤں کے لئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتا رہتا لیکن اگر کسی برس قحط پڑ جاتا یا فاقہ کشی کی صورتحال پیدا ہو جاتی تو وہ اخبار والوں اور سرکاری انتظامیہ کے پیچھے پڑ جاتا تھا۔ صحافیوں سے درخواست کرتا کہ وہ تھر کی صورتِ حال کو دنیا پر بے نقاب کریں اور انتظامیہ پر دباؤ ڈالتا کہ وہ تھریوں کے دکھوں کے مداوا کے لئے عملی اقدامات اٹھائیں۔ اخبار والے مسکین کے حسنِ اخلاق اور تھر اور اہلیانِ تھر کے ساتھ اخلاص کو دیکھ کر خبریں' تبصرے اور ادارتی نوٹ تک لکھ ڈالتے تھے جس کا وہ با قاعدہ ریکارڈ رکھتا تھا۔

قحط سالی کے زمانے میں مسکین جہان خان کھوسو میر پور خاص کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیتا' وہاں بیٹھ کر پورے تھر کی خبر گیری کرتا اور مسائل کا گہرائی سے جائزہ لے کر ان کے حل کے لئے عملی کوششیں بروئے کار لاتا رہتا۔ وہ اپنی ذات میں انجمن تھا۔ قحط سالی میں وہ انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ' پریس ڈیپارٹمنٹ' ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ اور سوشل ویلفیئر ڈیپارٹمنٹ چاروں ایک ساتھ لے کر چلتا تھا۔ مسکین جہان خان کھوسو ہر شام تازہ اطلاعات کے لئے میر پور خاص ریلوے اسٹیشن پر تھر سے آنے والے ہر آدمی سے گلے مل کر اس سے تمام خبریں حاصل کرتا۔ راستے میں نقل مکانی کرنے والے خاندانوں کی خیر و عافیت بھی معلوم کر لیتا۔ روزانہ صبح سویرے ریلوے اسٹیشن پر روڈ کے دونوں جانب ہوٹلوں پر بیٹھے تھر کے باشندے مسکین جہان خان کو دیکھتے ہی اس کی طرف دیوانہ وار کھنچے چلے آتے اور یہ جمِ غفیر کلیکٹر آفس تک پہنچتے پہنچتے ایک بڑے جلوس کی شکل اختیار کر لیتا۔ جس میں مسکین جہان خان کھوسو سپہ سالار کی طرح سب سے آگے رہتا تھا۔

کلیکٹری میں پہنچ کر مسکین تھری باشندوں کی مفت درخواستیں لکھتا' انہیں گندم کے پرمٹ جاری کراتا۔ جن دیہات میں سرکاری دکانیں نہیں ہوتی تھیں' وہاں کے لئے ارباب اختیار سے بات کرتا اور ان علاقے کے لوگوں کے لئے اشیائے خوردنی کی ترسیل یقینی بناتا۔ کلیکٹر آفس سے فارغ ہو کر انجینئرز کے دفاتر پر یلغار کر دیتا اور وہاں پر تھریوں کو مقدم' بیلداری یا کوئی بھی نوکری دلانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ اگر کوئی وزیر یا پھر بڑا افسر دورے پر آ گیا تو مسکین اور اس کی پوری جماعت وہاں پہنچ جاتی اور وہ ایک طویل درخواست لکھتا جس میں تھر کی تکالیف کا ذکر ہوتا جو دورے

پر آئے ہوئے حکام کو پیش کی جاتی۔ یہ الگ بات تھی کہ اس درخواست پر کوئی غور کرے یا نہ کرے۔ مگر مسکین اپنی طرف سے انتہا کر دیتا تھا۔

اتوار کے روز سرکاری دفاتر بند ہوتے تو وہ میرپورخاص میں اخبارات کے نمائندگان‘ مدیران اور مقامی رہنماؤں سے ملاقات کر کے تھر کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتا۔ وہ جہاں بھی جاتا اس کی مجلس کھلی کچہری کی شکل اختیار کر جاتی۔ مباحثہ ہو رہا ہے‘ مطالبہ ہو رہا ہے اور کہیں منصوبہ بندی کی جا رہی ہے لیکن موضوع اول و آخر تھر اور اہلیانِ تھر ہیں۔ اس کے باوجود اگر تھوڑا وقت مل جاتا تو وہ میڈیکل اسٹورز اور ڈاکٹر حضرات کے پاس تھری باشندوں کے لئے مفت دواؤں کے لئے پہنچ جاتا۔ ان میڈیکل اسٹورز اور ڈاکٹرز کو مسکین پر اتنا اعتبار تھا کہ وہ ہزاروں روپے کی دوائیں انہیں دے دیتے تھے کہ یہ یقیناً مستحقین تک پہنچ جائیں گی۔ چونکہ مسکین جہان خان نے صرف سات جماعتیں پاس کی ہوئی تھیں اس لئے میڈیکل اسٹور والے اور ڈاکٹر صاحبان گھنٹوں بیٹھ کر مسکین جہان خان کھوسو کو دواؤں کا استعمال لکھواتے اور سمجھاتے تھے۔ پھر وہ یہ دوائیں لے کر مستحقین تک بلا تاخیر پہنچاتا۔

مسکین جہان خان کھوسو نے خود کو ”فنا فی اللہ“ اگر نہیں کیا تھا تو ”فنا فی الغربا و المساکین“ ضرور کر دیا تھا۔ وہ بلا تخصیص مذہب لوگوں کی خدمت پر یقین رکھتا تھا۔ مسکین کا سب سے بڑا مشغلہ تھا‘ اخبارات جمع کرنا‘ چاہے ان میں مسکین کی تحریریں ہوں یا نہ ہوں۔ وہ خود ایک ”موبائل لائبریری“ تھا۔ مسکین جہان خان کھوسو اخبارات کو سنبھال کر رکھتا تھا۔ لاتعداد اخبارات اپنے ساتھ لئے پھرتا‘ وزن بڑھ جاتا تو پرانے اخبارات بوری میں ڈال دیتا اور اس کے بعد وہ بھاری بھرکم بوری کو حفاظت کے ساتھ بس میں ڈال کر اپنے گاؤں پہنچا دیتا۔ اخبارات ذخیرہ کرنے میں وہ احتیاط اور ترتیب کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھتا تھا۔ کسی کو اگر کوئی اخبار ریکارڈ میں دیکھنا ہوتا تھا تو وہ مسکین جہان خان کھوسو کی خدمات حاصل کرتا۔

ایک مرتبہ اخبار ”سچائی“ کے مدیر غلام محمد لغاری پر مقدمہ درج ہو گیا۔ دفاع کے لئے انہیں اخبار کے ۲ سال پُرانے پرچے چاہیئے تھے‘ اخبارات کے دفاتر‘ کتب خانوں اور دیگر کسی جگہ سے نہیں ملے تو سب کو مسکین کا خیال آیا۔ مسکین سے ذکر کیا گیا تو اس نے وہ پرچے لا کر سامنے رکھ دیئے۔ اس طرح کی خدمت وہ بلا معاوضہ انجام دیتا تھا۔ اس کے پاس اخبارات کا اتنا ذخیرہ تھا کہ اگر ردی میں بیچے جاتے تو اسے کئی

برسوں کا خرچہ مل جاتا لیکن اس کی زندگی میں یہ کام ممکن نہیں تھا۔ یہ ذخیرہ اسے جان سے زیادہ عزیز تھا۔

مسکین جہان خان کھوسو کا مرنا جینا ان مجبور اور بیکس تھریوں کے لئے وقف تھا۔ اسے ایک غیر مسلم قدر شناس دوست نے ''تھر کے گاندھی'' کا لقب دیا تھا۔ کیوں کہ وہ کولہی برادری کیلئے ''اوتار'' کی حیثیت رکھتا تھا۔ شب و روز ان کے ساتھ رہتا' ان کے مسائل کے حل کے لئے عملی اقدامات اٹھاتا۔ بس کھانا خود پکا کر کھاتا تھا۔ کولہی برادری اسے ''مہادیو'' جیسا اوتار سمجھتی تھی اور اسے اپنا ''بھگوان'' مانتی تھی۔ مسکین تھر کے کولہیوں پر ذرا برابر بھی ظلم زیادتی برداشت نہیں کرتا تھا۔ اگر کچھ ایسا ہو جائے تو مجرموں کو سزا دلائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھتا تھا۔

ایوب خان کے مارشل لا میں ایک مرتبہ مسکین جہان خان کھوسو کے سگے بھائی غلام حیدر کھوسو نے فوجی افسر کی وردی پہن کر کولہی برادری کے کچھ افراد کے ساتھ جعلسازی کی اور ان سے پیسے لے کر جعلی کاغذات پر انہیں تھر کی کچھ زمین الاٹ کر دی۔ کولہی برادری کے لوگ خوشی خوشی مسکین کے پاس پہنچے اور انہیں زمین کے کاغذات دکھائے اور زمین ملنے کی خوش خبری سنائی۔ اس نے کاغذات چیک کرائے تو وہ جعلی نکلے۔ مسکین جہان خان کھوسو نے رپورٹ درج کرا کے اپنے سگے بھائی غلام حیدر کو گرفتار کرایا۔ چالان کے بعد عدالت میں کولہی برادری کی جانب سے بھائی کے خلاف پیش ہوتا رہا اور بھائی کو سزا دلا کر ہی دم لیا۔

بے مروت سرمایہ دار اور راشی افسر مسکین جہان خان کھوسو سے خائف رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے سازش کی اور ۵۰۰ کے قریب سرکاری افسران' وڈیروں اور ان کے چمچوں نے مسکین کیخلاف ''غنڈہ ایکٹ'' کے تحت گواہی دیدی' جس پر مسکین کو ۲ برس قید بامشقت سزا ہو گئی۔ اس کی گرفتاری اور سزا پر عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی' بے بس تھری افسران اور وڈیروں سے اور زیادہ نفرت کرنے لگے۔ جب اسے رہائی ملی تو ہزاروں لاچار تھری اس کے استقبال کے لئے موجود تھے۔ ننگر پارکر میں اپنے استقبالیہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے مسکین جہان خان کھوسو نے کہا:

''مجھے معلوم ہے کہ جن لوگوں نے میرے خلاف گواہی دی۔ میری کسی کے ساتھ نہ پہلے دشمنی تھی نہ ہی آئندہ رہے گی۔ مجھے جو سزا ملی ہے ممکن ہے کہ وہ میرے اعمال کی شامت ہو اس میں ان لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ آج میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ میں نے دل سے ان سب کو معاف کیا اور یہ سب میرے بھائی ہیں''۔ یہ تھر کی تاریخ کا سب سے عظیم جلسہ تھا جس میں تھر کی تاریخ میں پہلی بار لاؤڈ اسپیکر استعمال ہوا۔

مسکین جہان خان کھوسو کے پاس ہمیشہ دو کتابیں رہتی تھیں۔ ایک ''قرآن شریف'' اور دوسری

''شاہ جورسالو''۔ وہ نماز پنجگانہ کا پابند تھا۔ ہر نماز خشوع وخضوع سے پڑھتا۔ کہتے ہیں کہ وہ آدھا آدھا گھنٹہ ایک نماز میں لگا دیتا تھا۔ طویل سجدے، لمبی دعائیں اس کی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ تھیں۔ وہ گڑگڑا کر تھر اور تھریوں کی تقدیر بدلنے کے لئے اپنے رب کے حضور دست بہ دعا رہتا۔ روزے تو اس نے کبھی نہیں چھوڑے بلکہ سارا سال اکثر روزے کی حالت میں رہتا۔ یہ شریعت کی پابندی تھی، کسمپرسی یا بھوکے تھریوں کی پیروی، مگر سانس کی آخری ڈور ٹوٹنے تک اس کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی اور یہ معمول جاری رہا۔ یہ تھا بے آب و گیاہ تھر کا مسیحا، مسکین جہان خان کھوسو!

نہ جانے کتنے سورج ہو گئے پیوندِ خاک اب تک
زمین کا دوسرا رخ آسماں معلوم ہوتا ہے



تھر اور غیر سرکاری نجی تنظیمیں

میں نے تھر میں چندروز قیام کے دوران اپنے میزبانوں کے طفیل ڈیپلو' چھاچھرو' چھور اور ننگر پارکر کا طول وعرض چھان مارا ہے۔ مجھے پورے صحرائے تھر میں زندگی نام کی چیز کہیں دکھائی نہیں دی۔ میں نے جہاں بھی قدم رکھا' مصائب میں مبتلا اور موت کے خوف سے ہم کنار فضا نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ میں جہاں بھی گیا اور جس سے بھی ملا ہوں' ہر موڑ پر ایک نئی کہانی ایک نیا زخم میرے انتظار میں تھا۔ مجھے اپنے رفقائے سفر کی کیفیت کا اندازہ نہیں ہے' میں اس مختصر عرصہ میں سرتاپا گھائل ہوگیا۔ مجھے ماروؤں سے دکھ سانجھا کر کے پتہ نہیں کیوں اچھا لگا ہے۔ میں نے جس تھری سے بات کی' اس کی داستاں نے مجھے اپنا درد بھلا دیا اور ایک نئے کرب میں مبتلا کر دیا۔

پاکستان کی ۴۰ فیصد آبادی غریب سے غریب تر ہے جبکہ تھر کی ۹۰ فیصد آبادی غربت کی لکیر سے بہت نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ صحرائے تھر جہاں ماروؤں کے لئے پیاس اور افلاس کا عنوان بنا ہوا ہے وہاں کچھ مفاد پرست عناصر اور غیر سرکاری فلاحی تنظیموں کی خوب بن آئی ہے۔ تھر کی قسمت بدلنے کی دعوے داران تنظیموں کے کارندوں کی اپنی قسمتیں بدل گئی ہیں مگر تھر اور اہلیانِ تھر وہیں ہیں جہاں انہیں ان کی تقدیر نے چھوڑا تھا۔ انسانیت کے یہ سوداگر۔ سادہ لوح تھریوں کی قسمت سے کھیل رہے ہیں اور تھر میں خدمت کے نام پر کروڑوں بٹور رہے ہیں۔ کہاں سے کتنا پیسہ آیا اور کہاں گیا' ان سے کوئی حساب کتاب لینے والا نہیں۔ نہ حکومت ان پر ہاتھ ڈال سکتی ہے نہ اس کا کوئی ادارہ۔ ان میں سے اکثر تنظیموں کو غیر ملکی سرپرستی حاصل ہے۔ بعض ملک

اور عالمی تنظیمیں اپنے مخصوص عزائم اور ایجنڈے کی تکمیل کے لئے تھریوں کے لئے خطیر رقوم فراہم کرتی ہیں۔ یہ اہداف کیا ہیں' خطیر رقوم کی فراہمی کے مقاصد کیا ہیں' اس پر کبھی کسی حکومت اور کسی ادارے نے مغز کھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ اس بہتی گنگا میں سب کے سب ہاتھ دھو رہے ہیں۔ تھر میں سرکاری عملدار ہوں یا ان نام نہاد فلاحی تنظیموں کے رضا کار' سب اپنا اپنا حصہ بقدرِ وقعت و اختیار سمیٹ رہے ہیں۔

صحرائے تھر کے اس سفر میں' دور دراز علاقوں میں ہمیں جا بہ جا انگریزی میں لکھے بورڈ ملے جو این جی اوز کے ہاتھوں مکمل ہونے والے منصوبوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ ان منصوبوں پر لاکھوں کروڑوں خرچ ہوئے ہیں۔ یہ اسکول ہیں' اسپتال ہیں یا پھر ہنر مندی کی تربیت دینے والے ادارے۔ ہم نے گھوم پھر کر ان منصوبوں کا خود جائزہ لیا' سب کے سب ویران پڑے ہیں۔ اب ان عمارتوں میں الو بول رہے ہیں۔ تھر میں "سرگرمِ عمل" غیر سرکاری تنظیموں نے غیر ملکی امداد سے یہ منصوبے تشکیل دیئے ہیں' ان کی مختلف اخبارات میں بڑی بڑی خبریں شائع کرائیں' ان خبروں میں معصوم تھریوں کو مژدے سنائے گئے اور فراڈ منصوبوں کی افتتاحی تقریبات منعقد کی گئیں۔ یہ ان تنظیموں کا معروف طریقہ واردات ہے۔

تھری غریب ضرور ہیں مگر بے غیرت اور بکاؤ مال نہیں۔ وہ عسرت کی زندگی گزار لیتے ہیں مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا ان کی غیرت گوارا نہیں کرتی۔ وہ بھیک قبول نہیں کرتے اس لئے یہ تنظیمیں ان کی سماجی زندگی بدلنے کی آڑ میں ان سے ہاتھ کرتی ہیں۔ ان کی پیاس اور افلاس کو' ان کی زندگی کو' ان کی ثقافت کو تصویری شکل دی جاتی ہے اور پھر وہ تصاویر بیرونِ ملک دکھا کر یہ تنظیمیں عالمی اداروں سے نام نہاد منصوبے منظور کراتی ہیں' خطیر رقوم وصول کرتی ہیں اور پھر اپنی تجوریاں بھرتی ہیں۔ یہ منصوبے اور انگریزی میں لکھے یہ بورڈ محض دکھاوا ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے منصوبے عارضی اور خانہ پری کے ہوتے ہیں۔ ان کے قائم کئے ہوئے اسکول' اسپتال اور دستکاری کے مراکز چند دن سے زیادہ نہیں چلتے مگر ان کا کاروبار عشروں سے چل رہا ہے۔ ان کی دکھ دہی کے نظارے میں نے یہاں آ کر خود دیکھے۔ "دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا"۔

ان تنظیموں کی حقیقت کیا ہے' ان تنظیموں کے گدھ کس طرح سے معصوم تھریوں کی لاشوں کو بھنبھوڑتے ہیں اور تھر کے نام پر کس طرح لوٹ مار کرتے ہیں اور ان کے بہ ظاہر اور بہ باطن

مقاصد کیا ہیں؟ اس کا احوال نرسنگھ سوڈھو کی زبانی سنتے ہیں۔ نرسنگھ سوڈھو تھر کے رہنے والے ہیں اور انہیں ان تنظیموں کی کارکردگی کا قریب سے جائزہ لینے کا موقع ملتا رہتا ہے' میں فتوے دینے کا اہل نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ نام نہاد تنظیموں کی کارکردگی جانچنے کے لئے تھر ہی سے تعلق رکھنے والے دانشور سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے:

''کسی بھی علاقے کے مسائل سے نبرد آزما ہونے میں وہاں کے حکومتی ادارے جب اپنے مقاصد میں پورے نہیں اتر سکتے تو وہاں کے کمزور ولاچار افراد کا سہارا بننے کیلئے غیر سرکاری تنظیمیں (این جی اوز) قائم کی جاتی ہیں۔ جو مکمل آزادی کے ساتھ' رضا کارانہ طور پر بغیر کسی غرض ولالچ کے کام کرتی ہیں۔ پاکستان میں این جی اوز ۵ قوانین کے تحت رجسٹرڈ ہو سکتی ہیں۔ سوسائٹیز ایکٹ ۱۹۶۰ء ٹرسٹ ایکٹ ۱۸۸۲ء کوآپریٹوا یکٹ ۱۹۵۲ء کے تحت رجسٹرڈ کروائی جاتی ہیں۔

دکھوں کی وادی اور مشکلات کی سرزمین ''تھر'' جہاں عوامی رابطوں میں تقریباً ۳۵؍این جی اوز شامل ہیں جو بلند بانگ دعوے کرتی ہیں کہ ہمارا وجود دیہات سے شروع ہوتا ہے اور ہر دیہات وگوٹھ میں ہماری شاخیں کام کر رہی ہیں۔

ان کے ایسے دعوؤں کو سن کر نہایت حیرت ہوتی ہے کیونکہ تھر میں حالیہ وبائی امراض اور بھوک کے سبب اندازاً ۴۰۰ دیہات میں تقریباً ۱۸۰۰ افراد کے جاں بحق ہونے کے باوجود کسی بھی این جی او نے آواز بلند کیوں نہ کی۔ یہ این جی اوز حرکت میں کیوں نہ آئیں؟ ان تمام تنظیموں نے چپ کی چادر کیوں اوڑھ رکھی تھی؟ مگر جب مقامی صحافیوں نے یہ نشاندہی کی کہ تھر میں لوگوں کی موت کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے تو تب خدمت خلق کا دعویٰ کرنے والی این جی اوز گہری نیند سے جاگ گئیں اور اپنی ''چاندی'' کیلئے موقع دیکھتے ہوئے اپنی ایئر کنڈیشنڈ پیجارو گاڑیوں کے رخ ان دیہاتوں کی طرف کر دیئے۔ وہاں کے کمزور جسموں کو اپنے کیمرے کی آنکھ میں بند کر کے بڑے بڑے منصوبے بناتے ہوئے اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کیلئے ڈونر ایجنسیز اور امدادی اداروں کو لیٹر لکھ کر اپیل کی کہ ہمیں تھر کے عوام کی خدمت کیلئے کچھ نہ کچھ دیا جائے۔ یہ این جی اوز دوسرے ممالک سے مانگنے کے بہت سے طریقے جانتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک این جی او نے تھر کے قدرتی پودے ''کھپ'' کی تصاویر بنا کر اسے کھپ ٹیکنالوجی جیسا مصنوعی نام دیکر جھوٹی رپورٹیں باہر سے آنے والے ڈونرز کو قدرتی ہرے پودے دکھا کر ان کی آنکھوں میں سرمہ ڈالتی رہی۔ جبکہ

سب جانتے ہیں کہ کھپ ایک ایسا قدرتی پودا ہے جو قحط اور خشک سالی کے باوجود بھی ہرا رہتا ہے۔
سے مویشی بھی بہت کم کھاتے ہیں اسی طرح ایک اور این جی او نے اپنی پانچوں گھی میں کرنے کیلئے
تھر کے قدرتی درخت کنڈی کی تصاویر بنا کر ''کنڈی ہے تو مویشی ہیں'' جیسے پمفلٹ چھاپے اور
ڈونرز کو بے وقوف بنا کر اپنے مقاصد حاصل کیے۔

اسی طرح ایک تنظیم نے ننگر پارکر کے گاؤں کاتو میں لگے ہوئے ٹیوب ویل جو لوگوں کی
نجی ملکیت تھے' کی تصاویر بنائیں اور انہیں اپنا کارنامہ دکھا کر اپنی ساکھ مضبوط کی۔ ایسی چالاکیوں
اور چکروں میں پھنسنے والے غیر ملکی جب یہاں امداد کرنے آتے ہیں تو این جی اوز کے افسر' ان
کے ساتھ کیے جانے والے اجلاسوں میں مقامی صحافیوں کو نہیں بلاتے کہ وہ کہیں ان کے کارنامے
ظاہر نہ کر دیں اور ان کا دانہ پانی بند نہ ہو جائے۔ یہ لوگ مسکینوں کے نام پر ملنے والی رقوم ہزاروں
حوالے دیکر ہڑپ کرتے ہیں۔ جس میں ورلڈ فوڈ کی جانب سے ایک تنظیم کو ملنے والے گھی کو آگ
لگا کر ضائع کرنے کا واقعہ ابھی تک معمہ بنا ہوا ہے اور اسی طرح ایک تنظیم کو باہر سے ملنے والی
سانپ کے ڈسنے کی ویکسین متاثرین کو مفت دینے کے بجائے فروخت کی جاتی ہے۔ جنگل میں
مویشی چرانے والے غریب چرواہے کو اگر سانپ ڈس لے تو جس کے پاس آٹا لینے کے پیسے نہیں
وہ اس تنظیم کی دوکان سے انجکشن کیسے خریدے گا' یوں وہ زخمی چرواہا تکلیف کی تاب نہ لاتے
ہوئے تڑپ تڑپ کے جان دے دیتا ہے' مگر ان بے رحم این جی اوز والوں کو کوئی احساس نہیں
ہوتا۔ انسانی درد رکھنے کا دعویٰ کرنے والی این جی اوز اور ایک بیوپاری میں پھر کیا فرق رہ جاتا ہے؟

مائیکرو کریڈٹ کے نام پر دیہاتیوں کو قرض دینے والی این جی اوز کا مکروہ دھندہ بھی عجیب
ہے۔ جس میں ڈیڑھ فیصد سود کے حساب سے دیا گیا قرض میعاد مکمل ہونے پر ادا نہ کرنے کی
صورت میں قرض لینے والوں کو سارے گاؤں کے سامنے تذلیل کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے
مویشی ضبط کر لئے جاتے ہیں۔ یہ رویہ بلاشبہ شرم آمیز ہے۔ ایسی این جی اوز' راشی افسروں اور
پولیس کے عملے یا سودخور مہاجن میں کیا فرق ہے؟

چند ماہ پہلے ایک این جی او کو کراچی کی ایک کمپنی کی طرف سے ملیریا اسپرے کرنے والی
ایک جرمن مشین' جس کی قیمت تین لاکھ پچاسی ہزار روپے بتائی جاتی ہے' دی گئی جس کو صرف
دکھاوے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے صرف ایک بار اسپرے کیا گیا اس کے بعد سے یہ مشین

لاپتہ ہے۔واضح رہے کہ یہ مشین اس تنظیم کو ملنے کی وجہ سے تھر میں حکومت کی طرف سے اسپرے کرنا بند کر دیا گیا ہے۔ایک سماج سدھارک تنظیم جس کی گیارہویں سالگرہ منائی جارہی تھی' کے صرف ایک رات کے کھانے کے اخراجات تقریباً ۱۲ رلاکھ روپے ہو سکتے ہیں مگر ان کو بھوکوں کی بھوک کا بالکل بھی خیال نہیں ہے۔

تھر میں حالیہ خشک سالی بھوک اور بیماری کے متاثرین کے لئے عالمی اداروں سے ملنے والی خطیر امداد نے ایک بار پھر بعض این جی اوز کے کارندوں کو امتحان میں ڈال دیا ہے کہ یہ رقم ہضم کیسے کی جائے کہ پھر کہیں ان ہی ڈونرز سے اینٹی ڈائریا نہ طلب کرنی پڑے۔ یہاں مجھے حکیم بوعلی سینا کا یہ قول یاد آرہا ہے کہ ''اتنا کھاؤ جتنا ہضم کرسکو۔'' ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر تھریوں سے محبت جتانے والو! تمہیں کیا پتہ کہ تھر کے عوام کے درد کیا ہیں۔تمہیں کیا پتہ کہ لُو اور گرمی میں تپتی ریت پر ننگے پاؤں چلنے والے پر کیا گزرتی ہے؟ غریبوں کو سکھ دینے کے جھوٹے دعویدارو تم نے کبھی اپنے گریبان میں جھانکا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو کیا تم کبھی اپنے بچوں کیلئے کھلونے خریدتے وقت یہ سوچتے ہو کہ بھوک اور بیماری میں مبتلا ہو کر مرنے والے تھریوں کے یتیم بچوں کو اپنا جسم ڈھانپنے کیلئے کپڑے کا ٹکڑا تک میسر نہیں ہے اور تھریوں کے واحد ذریعہ معاش مویشی بھی مر رہے ہیں ان کیلئے تم نے کبھی سوچا ہے! اے صاحب بہادرو! حکومت کے پاس تو پہلے ہی اندھیر نگری چوپٹ راج والا معاملہ ہے جس میں بہت سے ڈاکٹر تنخواہیں تو سرکاری خزانے سے لیتے ہیں مگر کام مختلف این جی اوز میں کر رہے ہیں۔مگر صاحبو تم نے کبھی یہ سوچا ہے کہ تھرواسیوں کو میسر صحت کی سہولیات جو بہت تھوڑی ہیں تم وہ بھی چھین رہے ہو۔اے منرل واٹر پینے والو پیاسے تھریوں کے بارے میں بھی سوچو۔این جی اوز کیا تھیں اور کیا بن گئی ہیں؟

انسانیت کا احساس رکھنے والے بے باک ہمدرد مرحوم عبدالرحمٰن نقاش کو این جی او سے صرف اس لئے نکالا گیا تھا کہ وہ اخبار کے ذریعے غریبوں کی آواز بن جاتا تھا۔اس وقت کا ایک واقعہ ہے کہ مرحوم نقاش جب ایک این جی او میں کام کرتا تھا تو ایک تھری نوجوان نے بھوک مٹانے کیلئے جوگیوں کی طرح بھیک مانگتے مانگتے مرحوم کے آگے ایک روپے کی صدا لگائی تو اس کی معصومیت اور مجبوری دیکھ کر نقاش کی آنکھوں سے زاروقطار آنسو برس پڑے اور اس نے نوجوان سے پوچھا' کیا تم کام کرو گے؟ نوجوان کے ہاں کرنے پر نقاش نے اپنی جیب سے پیسے خرچ

کر کے اسے بکریاں خرید کر دیں۔ نوجوان کی محنت اور مرحوم کی محبت سے آج وہی نوجوان تھر کے سات بڑے مویشی پالنے والوں میں سے ایک ہے۔ کتنا ہمدرد تھا وہ' ہے کوئی ایسا این جی او کا آفیسر جو دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھے۔ کچھ این جی اوز تو مذہب تبدیل کرنے میں بھی بڑی مہارت رکھتی ہیں اور ایسے کاموں میں ذرا دیر نہیں کرتیں۔

بہر حال میری این جی اوز والوں کے ساتھ ذاتی دشمنی نہیں۔ مگر ایک انسان ہونے کے ناطے فرض بنتا ہے کہ اگر کوئی جان بوجھ کر غلطی کرے اور وہ غلطی بار بار دہرائے تو اس کو آگاہ کیا جائے۔ اپنے کردار کا جائزہ لینا' نظر ثانی کرنا ان کا فرض ہے۔ خیر اب این جی اوز کو اپنے طویل تجربات اور غلطیوں سے بہت کچھ سیکھ لینا چاہئے۔''

نرسنگھ سوڈھو نے ایک تصویر ہمیں دکھائی ہے۔ یہ تصویر بڑی واضح ہے۔ اس میں تھر میں سر گرمِ عمل غیر سرکاری تنظیموں کا چہرہ کھل کر سامنے آ گیا ہے مگر میں وہ سارے منظر اور خیالات آپ کی نذر کروں گا جو میں نے اس سفر میں ان تنظیموں کے حوالے سے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اپنے کانوں سے سنے ہیں۔ نرسنگھ سوڈھو نے ۳۵ غیر سرکاری تنظیموں کا ہندسہ دیا ہے جو تھر میں ''مصروف عمل'' ہیں مگر میری اطلاعات کے مطابق ان چھوٹی بڑی تنظیموں کی تعداد ۷۰ سے بھی زائد ہے لیکن عملاً چند تنظیمیں ہیں جن کا اچھا برا کوئی کردار بنتا ہے۔ میری بھی نرسنگھ سوڈھو کی طرح' ان تنظیموں اور ان سے وابستہ افراد کے ساتھ کوئی ذاتی رنجش اور لڑائی نہیں ہے۔ میرا ان سے کیا لینا دینا' یہ تو محض انسانی مسئلہ ہے ' میرے تحفظات بھی میرے ذاتی مشاہدے اور انسانیت کے معروف تقاضوں تک محدود ہیں جس پر بہر حال مصلحت اختیار نہیں کی جا سکتی۔

میں نے اس سفر میں بے شمار لوگوں سے ان تنظیموں کے کردار پر تبادلۂ خیال کیا ہے۔ ان کے تاثرات ملے جلے ہیں۔ تفصیلی ملاقاتوں اور باتوں کے بعد میں نے اپنے تجزیئے کے لئے تین طرح کے طبقے منتخب کئے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ان تنظیموں کے کردار سے سخت نالاں ہے۔ اسلام کوٹ کے بہادر لال کا شمار انہی لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو ان تنظیموں اور ان کے رضا کاروں کو شک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

'' تھر میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیمیں خدمت اور انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں۔ انہوں نے ہماری مجبوریوں کو نیلام کیا ہے ' ہمارے نام پر کروڑوں کما کر اپنی تجوریاں بھری

ہیں۔ ان تنظیموں کے کارندے لکھ سے لکھ پتی ہو گئے ہیں' تھر اور تھری وہیں کے وہیں ہیں۔ یوں تو یہ سارا سال ہمارے نام کا کھاتے ہیں مگر جب بھی صحرا میں قحط سالی اور خشک سالی کے موسم آتے ہیں تو ان کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ دنیا جہان سے' ہماری زندگی کو تماشا بنا کر کروڑوں بٹورتے ہیں مگر ان کا ایک پیسہ ہمارے کام نہیں آتا۔ یہ پر تعیش زندگی گزارتے ہیں' بڑی بڑی ائر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں گھومتے ہیں' خوب صورت دفاتر میں بیٹھ کر فلسفے بگھارتے ہیں' انہیں ہمارے دکھ کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ ہم روز جیتے ہیں 'روز مرتے ہیں اور انہیں اپنے اللوں تللوں سے فرصت نہیں۔ یہ لوگ اپنے ضمیر پر ہی نہیں اس دھرتی پر بھی بوجھ ہیں۔''

بہادر لال کے ہم نواؤں کی تھر میں کمی نہیں ہے' یہاں کی اکثریت ان کی رائے جیسی رائے رکھتی ہے۔ یہ طبقہ ان تنظیموں کو دیمک کی طرح سمجھتا ہے جو دھیرے دھیرے تھر کو چاٹ رہے ہیں۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو ان تنظیموں کے کردار سے اتفاق کرتا ہے اور ان کی تعریف بھی کرتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ غیر سرکاری تنظیمیں ہیں' ان سے سرکار جتنی توقعات رکھنا عبث ہے۔ ان سے جو بن پاتا ہے وہ کر رہے ہیں۔ یہ لوگ تھر میں زندگی کے تحفظ اور ترویج کے لئے تمام تر ذمہ داری حکومت اور حکومتی اداروں پر ڈالتے ہیں۔ تھر کا ایک اور طبقہ ان غیر سرکاری تنظیموں اور ان کے کارندوں کی لوٹ مار سے واقف ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ ان کی وجہ سے تھر میں شعور کی بیداری میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں بلاشبہ وہ بدعنوان ہیں اور ان کی نیت بھی صاف نہیں مگر دنیا کو ان تنظیموں کے کاغذی پروپیگنڈے کی وجہ سے تھر کا دکھ جاننے میں مدد ملی ہے۔

مجھے وقتاً فوقتاً تھر کے سفروں میں کئی ایسے لوگ بھی ملے ہیں جنھوں نے ''تھر دیپ'' کی کارکردگی کو سراہا ہے خاص طور پر کول فیلڈ کے باشندوں کے لئے اس تنظیم نے بے پناہ خدمات انجام دی ہیں۔ اس تنظیم کے سربراہ ڈاکٹر سونو کھنگارانی ہیں جو خود بھی اسی صحرا کے ایک پسماندہ گوٹھ کے رہنے والے ہیں۔ اس تنظیم نے صحرائے تھر میں کوئلے کی صنعت کے نتیجے میں ماروؤں کے لئے پیدا ہونے والے روزگار کے مواقع اور فوائد کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے ساتھ اس نے مسائل سے آگاہی' تھر کے ماحول اور سماجی زندگی پر پڑنے والے منفی اثرات اور ان میں کمی لانے کی حکمتِ عملی بھی تجویز کی ہے۔ ''تھر دیپ'' نے سندھ کے ماہرین سے مل کر صحرائے تھر میں کوئلے کی صنعت کے بارے میں تفصیلی سروے کر کے تھر پارکر میں کوئلے کی کھدائی' فائدے' امکانات'

خدشات وخطرات اور احتیاطی تدابیر پر مبنی رپورٹ شائع کر کے عوام اور حکومت کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے جو بلاشبہ قابلِ ستائش ہے۔

اس رپورٹ کے مطابق کان کنی سے پہلے سروے کئے جانے والے چار بلاکوں میں ۵۲ر گاؤں' زرعی اراضی' کچے پکے مکانات' پانی کے وسائل' مال مویشی' نقل مکانی' دوبارہ آبادکاری' مقامی لوگوں کی مشترکہ ملکیت کی مالیت اور دیگر مسائل کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ان اخراجات کا تخمینہ ۲۵۴ء۲۷۴۱ملین روپے لگایا گیا ہے۔اس رپورٹ میں حکومت کو مشورہ دیا گیا ہے کہ آبادکاری کے لئے متاثرین کو مناسب معاوضہ دیا جائے اور تمام معاملات میں مقامی آبادی سے مشاورت کو یقینی بنایا جائے۔ رپورٹ میں خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ تھرپارکر کی معیشت کا ۵۰ فیصد سے زائد انحصار جانوروں اور مویشیوں پر ہے لیکن جب اتنے وسیع علاقے سے کوئلہ نکالا جائے گا اور آبادی کا انخلا ہوگا تو یقیناً اس کے منفی نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

تھر میں سرگرمِ عمل غیر سرکاری تنظیموں کے بارے میں ان تینوں طبقوں کی رائے سے قطع نظر میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ان تنظیموں کا کردار ان کے پروپیگنڈے کی نسبت بہت کم ہے اور یہ تنظیمیں تھر اور تھریوں کے مسائل سے کما حقہٗ آگاہ بھی نہیں ہیں۔ان تنظیموں کا کردار کاغذی ہے اور ان سے وابستہ افراد کی اکثریت سستی شہرت حاصل کرنے کی علت میں مبتلا اور بڑے پیمانے پر مالی بے ضابطگیوں میں ملوث ہے۔ان تنظیموں کے مابین ہم آہنگی کا فقدان ہے اور یہ زیادہ تر غیر ملکی ایجنڈے پر کاربند ہیں۔کوئی غریبوں کی مدد اور غربت کے خاتمے کے نام پر مال بٹور رہا ہے اور کوئی غریبوں کی مدد انہیں اپنے مذہب کی طرف راغب کرنے کے لئے کر رہا ہے۔

۱۹۹۹ء میں جنوبی ایشیا کے تین اہم ممالک پاکستان' بھارت اور افغانستان وسیع پیمانے پر خشک سالی سے متاثر ہوئے ہیں۔خشک سالی سے ان ملکوں کے بعض مخصوص علاقوں میں قحط پھوٹ پڑا ہے اور لوگ بڑی تعداد میں اپنے آبائی علاقوں سے نقل مکانی کر کے محفوظ مقامات پر منتقل ہو رہے ہیں۔اتنی بڑی سطح پر تباہی کی مثال پہلے نہیں ملتی۔صحرائے تھر گزشتہ تین برسوں سے خشک سالی سے دوچار ہے اور زندگی اس دشت میں پناہ مانگتی دکھائی دے رہی ہے۔

میں نے ۲۱ر نومبر ۱۹۹۹ء سے اپنے تھر کے سفر کا آغاز کیا ہے۔تھر میں اس قیامت کا آغاز جون سے ہوا ہے۔میرے مشاہدے کے مطابق اب تک تھر میں کل آبادی کا ستر فیصد اس آفت

سے متاثر ہوا ہے اور تھر کی اکثریت اپنے اسی فیصد مال مویشیوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ گو کہ اس آفت سے بروقت بچاؤ کا انتظام کرنے اور فوری امدادی سرگرمیاں بروئے کار لانے کی بنیادی ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے مگر اس حوالے سے این جی اوز سمیت شہری سماج کا کردار موثر بنا کر دکھوں کا بڑی حد تک مداوا کیا جا سکتا تھا جو نہیں کیا جا سکا۔ ان تنظیموں کو اپنے گریبانوں میں جھانکنا چاہئے اور اپنے کردار کا گہرا تجزیہ کرنا چاہئیے کہ ان سے کیا توقعات تھیں اور وہ کس حد تک پوری ہوئیں؟ اگر یہ تنظیمیں اپنے مقاصد سے مخلص ہیں تو انہیں اپنے اندر موجود کالی بھیڑوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہئیے تا کہ ان تنظیموں پر اٹھنے والے سوالوں کو جواب مل سکیں۔

پاکستان میں این جی او سیکٹر پچھلے دو عشروں میں بہت اہمیت اختیار کر چکا ہے اس لئے اس پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں کہ وہ اپنا کردار بہت زیادہ موثر اور انتہائی شفاف بنائے تا کہ لوگوں کا اس شعبے پر اعتماد بحال ہو۔ اس وقت تو یہ تاثر ابھر رہا ہے کہ پاکستان میں سرگرمِ عمل این جی اوز مافیا کا روپ دھار رہی ہیں۔ خاص طور پر تھر میں سرگرمِ عمل غیر سرکاری تنظیموں کے بارے میں تو ایک پختہ رائے قائم ہو چکی ہے کہ انسانیت اور انسانی حقوق کے نام پر کام کرنے والے یہ لوگ انسانیت کے نام پر دھبہ بن چکے ہیں۔ میں بھی ماضی میں ایک حد تک این جی اوز کے کردار کا معترف رہا ہوں مگر تھر کے اس سفر میں میرا ان تنظیموں پر سے اعتماد مکمل طور پر اٹھ گیا ہے۔ میرے اس سفر نے میری جھولی میں ایک اور دکھ ڈال دیا ہے۔ اب اگر کوئی مجھے اپنا تعارف کسی این جی او کے حوالے سے کرائے گا تو شاید میں اپنے مزاج کے برخلاف اسے قابلِ توقیر نہ سمجھوں۔ میرے تھر کے اس سفر میں مجھ پر این جی اوز کی جو ایک نئی پرت کھلی ہے اس نے میری سوچ کے دھارے بدل دیئے ہیں۔ ہم مدتوں اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں، روشنی کی ایک جھلک ہماری زندگی کے زاویئے تبدیل کر دیتی ہے۔ تھر کے اندھیروں میں بھٹکتے بھٹکتے مجھے بھی روشنی کی ایک لکیر ہاتھ آ گئی ہے جس نے مجھے زندگی کے ایک نئے رخ سے آشنا کر دیا ہے۔ نرسنگھ سوڈھو! میں بھی تمہاری آواز میں اپنی آواز شامل کرتا ہوں۔

''اے این جی اوز والو! خدارا اپنا قبلہ درست کر لو اب بھی وقت نہیں گیا۔''



آئے مست ڈیہاڑے ساون دے

اکیسویں صدی' سال ۲۰۰۸' جمعرات چودہ اگست بمطابق ۱۱ شعبان ۱۴۲۹ء ہجری کو پاکستان کے ۶۲ ویں یومِ آزادی پر کالی گھٹاؤں سے آنکھ مچولی کرتے سورج نے اپنی سنہری کرنیں زمین پر نچھاور کی ہیں تو میں ایک بار پھر عظیم صحرائے تھر کے عظیم ماضی ویراواہ کے اس بوڑھے مندر کے روبرو کھڑا ہوں جہاں ۳۱۸۲ روز قبل عین اسی جگہ غمزہ عشق کے شکار پریمی جوڑے سارنگا اور سدھونت سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ صحرا کے اس پر آشوب سفر میں بھٹکتے بھٹکتے ' میں خود بھی سدھونت ہو گیا ہوں ' سدھونت جو اپنی پریتم سارنگا کو پانے کے لئے جوگی کا روپ دھار لیتا ہے اور تپتے صحرا اور سلگتے ریت رستے اپنی رہ گزر بنا لیتا ہے۔ مجھے تھر کا سفر راس آ گیا ہے' میں نے بھی سدھونت کی طرح اپنے پاؤں ان ریگزاروں میں چھالے کر لئے ہیں۔

میری آشفتہ سری نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ اب تو میں اکثر اس سفر کی آبلہ پائی کے لئے بے چین رہتا ہوں۔ میں نے گزشتہ نو برسوں میں اس صحرا کے کئی سفر کئے ہیں۔ تھر پارکر کے سلگتے دن ہوں یا موسمِ بادوباراں' نوکوٹ سے نگر پارکر تک اب تو راہ میں آنے والا ایک ایک ٹیلہ ایک ایک بھٹ' ایک ایک شجر اور ایک ایک منظر میرا نورِ نظر ہو گیا ہے۔ رولر کوسٹر کی طرح سانسوں کو زیروبم کی لذتوں سے آشنا کرتی اس شاہراہ کا ایک ایک لمحہ میرے وجود میں بسیرا کر گیا ہے۔ تھر سے اس نو سالہ رفاقت اور مسلسل صحرا نوردی نے ماروی کے مارو اور سارنگا میری منظورِ نظر ٹھہرا دی ہے۔ اور یہ پیرن مندر تو میرے من میں بس گیا ہے جو دن بہ دن مزید بوڑھا ہو رہا ہے۔ میں یہاں

پہنچا ہوں تو اس بار سب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔ بارانی موسم نے صحرا کے زخم بھر دیئے ہیں۔ آسمان پر منڈلاتے کالے بادل' زمین پر اگنے والی گھاس' سبز پتوں میں گھرے درختوں میں چہکتے چہچہاتے پرندے اور ہر طرف پر پھیلائے ناچتے مور کسی نا آشنا سرزمین کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ یکبارگی مجھے لگتا ہے کہ میں بھٹک کر کہیں اجنبی راہوں کی طرف آنکلا ہوں لیکن نوکوٹ کا یہ بزرگ مندر میرے روبرو ہے تو مجھے تسلی ہے کہ میں ایک بار پھر سارنگا کے دیس میں ہوں۔ سارنگا جو اب میری بھی جستجو اور منزل ہے۔

میری آنکھوں میں وہی نقشہ بھر آیا ہے' آہو چشم سارنگا کو پانے کے لئے بے چین روح سدھونت تپتے صحراؤں اور تھر کے بیابانوں کے آزار جھیلتا پھر رہا ہے۔ یہ آزار جھیلنے کی مجھے بھی عادت سی پڑ گئی ہے۔ ایک چولستانی' تھر کی رومان پرور زندگی کی بھول بھلیوں میں خود کو گم کر کے یک گونہ خوشی محسوس کرتا پھر رہا ہے۔ ہزاروں برس پہلے کے اور اب کے سدھونت کے مابین ایک طویل مسافت تھی جو میں نے ایک جست میں طے کر لی ہے۔ ان فاصلوں کے چٹکی میں سمٹنے کا گواہ یہ بوڑھا مندر اور اس کے آدھوں آدھ ایستادہ سنگی ماتا دیوی بھی ہے جو وقت کے بے رحم تھپیڑوں کو سہتی سہتی خود بھی اپنے کئی اعضا سے محروم ہو گئی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ سارنگا اور سدھونت کی محبت کی یہ واحد شہادت اگلی بارشوں میں خاک ہو جائے گی۔

میں رات میر پور خاص میں تھا تو وہاں بڑی رونقیں تھیں' پورے شہر میں سبز ہلالی پرچموں کی بہار تھی۔ رات بھر ریلیاں نکلتی رہیں جن میں شریک منچلے اور جوشیلے نوجوان موٹر سائیکلوں کے سائلنسروں سے بانسریاں نکالے' جھنڈے لہراتے' موٹر سائیکلوں پر کرتب دکھاتے اندھیری اور تنگ سڑکوں پر برق رفتاری کے مظاہرے کرتے پھر رہے تھے۔ موٹر سائیکلوں کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ تاریکی میں یہ جشن خوف و ہراس پھیلانے کا سبب بن رہا تھا۔ مجھے اپنی حب الوطنی کے لئے کسی کے سامنے کسی قسم کے مظاہرے یا کسی پر کوئی سند ظاہر کرنے کی مجبوری نہیں ہے لیکن مجھے یہ سب جشن سے زیادہ اودھم محسوس ہوا۔ زندہ اور کامیاب قومیں اس طرح ہڑبونگ مچا کر آزادی کا جشن نہیں مناتیں' ان کا انداز اور ضابطہ ہی الگ ہوتا ہے جس سے ہم اب تک محروم ہیں۔ مجھے تو یہ سب کچھ ہماری اندر کی بے چینیوں اور ناکامیوں کا مظہر محسوس ہوا ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی شکست کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

ہم سارا سال دھڑلے سے ملک سے' ملکی عوام سے اور ملک کے قوانین سے کھلواڑ کرتے رہتے ہیں' ہر آدمی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں لگا رہتا ہے' یومِ آزادی جب بھی قریب آتا ہے تو اچانک ہم سب محبِ وطن بن جاتے ہیں' استحصال کرنے والا بھی اور پسنے والا بھی۔ گھروں' دکانوں' عمارتوں اور بازاروں کو خوب سجاتے ہیں' ہر طرف پاکستانی پرچم لہراتے ہیں۔ ریلیاں اور جلوس نکالے جاتے ہیں' تقریبات منعقد ہوتی ہیں جن میں مقررین گلا پھاڑ پھاڑ کر حب الوطنی اور پاکستانیت کا درس دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم پر جو سال بھر کا قرض تھا وہ بے باق ہو گیا' ہم پہ جو حق تھا وہ ادا ہو گیا۔ کیا یہ کر لینے سے دھرتی کے قرض سے چھٹکارا مل جاتا ہے؟ اس سوال کا جواب آپ پر میرا ادھار ہے۔

نوکوٹ سے نگر پارکر تک مجھے کسی قسم کا جشنِ آزادی کہیں دیکھنے کو نہیں ملا۔ اکا دکا سرکاری عمارتوں پر تبرکاً قومی پرچم پھڑ پھڑا رہے تھے' نہ کوئی جلوس' نہ کوئی ریلی' نہ کوئی جلسہ نہ پریڈ اور نہ کوئی نعرے بازی۔ کہیں بھی کچھ دیکھنے سننے کو نہیں ملا۔ یہ نہیں کہ تھری پاکستان سے محبت نہیں کرتے' یہاں جس قدر بھی تعلیمی وسائل دستیاب ہیں وہاں بھی وہی نصاب گھول کر پلایا جا رہا ہے جو پی کر ہم جوان ہوئے ہیں۔ پاکستان کی اشرافیہ کا تشکیل دیا ہوا یہ اجنبی نصاب' ہمیں دھیرے دھیرے اندر سے کھوکھلا کر رہا ہے اور ہم ہیں کہ اپنے آپ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ پاکستان ان تھریوں کے لئے بھی متاع ہے لیکن برہنہ پا اور برہنہ تن ان مسکینوں کو ایک وقت کی روٹی کے حصول کی تگ و دو ہی سے فرصت میسر نہیں کہ وہ حب الوطنی اور غداری کے معموں کے بارے میں سوچ سکیں۔

اس بار ۱۴ اگست (۲۰۰۸) کا سورج پیاسے اور ترستے تھریوں کے لئے خوشیوں کا پیامبر بن کر طلوع ہوا ہے۔ آج کی برسات اور چند روز پہلے ہونے والی دو بارشوں نے نہ صرف پورے صحرا میں کنوئیں اور تالاب لبالب بھر دیئے ہیں بلکہ یہ بارشیں تھر کی فصلوں کے لئے بھی رحمت بن کر آئی ہیں۔ مارو خوش ہیں کہ اب سارا سال ان کے مٹکے پانی اور اناج سے بھرے رہیں گے۔ اب انہیں کچھ عرصہ کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑنے کی اذیت سے نجات مل جائے گی۔ ساون کی ان بارشوں سے ان کے مایوس چہروں پر زندگی کی رونقیں لوٹ آئی ہیں۔ اب کے میں یہاں آیا ہوں تو تھر میں ساون کھل کر برسا ہے۔ آج بکرمی تقویم کے ۲۰۶۵ ویں سال کے ساون کی ۳۰ تاریخ ہے۔ جاتا ساون پیاسے صحرا کو روح کی گہرائیوں تک سیراب کر گیا ہے۔ ساون امیدوں اور امنگوں کے بر آنے کا موسم ہے۔ مرشد فرید اس موسم کا بڑا شیدائی ہے' ذرا یہ کافی ملاحظہ کیجئے اور اندازہ کیجئے یہ موسم روہی' ریگستان' تھر میں کیا کیا رنگ دکھاتا ہے:

آیٔے مست ڈیہاڑے ساون دے
واہ ساون دے من بھاون دے
بدلے پورب ماڑ ڈکھن دے
کجلے بھورے سوسو ون دے
چارے طرفوں زور پون دے
سارے جوڑ وساون دے

ترجمہ: ساون کے مست اور کیف آفریں دن آ گئے ہیں۔ ساون کیا خوب دل کو لبھانے والا موسم (مہینہ) ہے۔ اس (دلکش) موسم میں پورب' مارواڑ اور ڈکھن سے کالے' بھورے اور رنگا رنگ بادل امڈ آئے ہیں۔ چاروں جانب سے گھٹاؤں کا زور ہے۔ یہ سب بادو باراں کی نشانیاں ہیں۔

چکویاں چکوے اغن پپیہے
کوئل مور چچونے چیہے
سہنس چکور چنڈور بیہے
شاغل گیت سناون دے

ترجمہ: ریگستان کا موسم کیا بدلا' سارے صحرائی چرند پرند بھی موج میں آ گئے ہیں اور (مست ہو کر) گیت گانے میں مشغول ہیں۔

ڈینہاں پینگھاں ساویاں پیلیاں
راتیں کھمیاں کھمن رنگیلیاں
گج گج گاجاں گجن رسیلیاں
وقت سنگھار سہاون دے

ترجمہ: دن کے وقت رنگ برنگی قوس قزح اپنے رنگ دکھاتی ہے تو رات کو بجلی کوندنے سے کئی رنگ فضا کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ ایسے میں بجلی کڑکنے کی رسیلی آوازیں کانوں کو بھلی لگتی ہیں۔ سج دھج کا موسم ہے' ایسے میں سنگھار سہانے کا وقت ہے۔

روہی راوے تھیاں گلزاراں
تھل چترانگ وی باغ بہاراں

گھنڈ تنواراں بارش باراں
چچ چے دھاون گاون دے

ترجمہ: ساون کی بارش نے روہی ریگستان کو باغ و بہار کر دیا ہے' تھر میں جل تھل ایک ہو گیا ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھل اٹھے ہیں۔ بارش کے موسم میں مویشیوں کے گلے بھلے معلوم ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سے بارش میں نہانے اور خوشی کے گیت گانے کی خبریں مل رہی ہیں۔

چاندنی رات ملہاری ڈینہہ ہے
تھڈڑیاں ہیلاں رم جھم مینہہ ہے
سوہنی موسم لگڑا نینہہ ہے
گئے ویلے غم کھاون دے

ترجمہ: بارش کے موسم میں ریگستان کی چاندنی راتیں دل بستگی کا سبب بن رہی ہیں۔ کیا موسم ہے' ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں اور مینہ رم جھم برس رہا ہے۔ ایسے موسم میں من میں امنگیں جاگ اٹھی ہیں اور غم کھانے کے دن قصہ پارینہ ہو گئے۔

مُد مستانی تے خوش وڑے
سالھوں سوہے کیسر بھنڑے
سجوں مینہ برساتوں سنڑے
جھڑ گے لانگھے لانون دے

ترجمہ: ساون مستانا موسم ہے۔ (تھر) بارش ہوتے ہی بیابانوں میں زندگی لوٹ آئی ہے۔ ریگستانی حسن اپنے جوبن پر ہے' عروسی ملبوسات خوشبوؤں میں بسے ہوئے ہیں اور بھڑ کیلے لباس من میں آگ بھڑکا رہے ہیں۔

ویہنہہ فرید آباد تھیوسے
مال مویشی شاد تھیوسے
دل درددوں آزاد تھیوسے
چولے انگ ناں مانون دے

ترجمہ: اس موسم میں فرید دل کی دنیا آباد ہو گئی ہے۔ مال مویشی بھی خوش ہیں۔ دل کا درد

بھی جاتا رہا ہے۔اس مست موسم میں ہم (مارو) پھولے نہیں سما رہے۔

میں نے پچھلے کئی سفروں میں لاتعداد ماروؤں اور مارئیوں کو بیراجی علاقوں کی طرف نقل مکانی کرتے دیکھا تھا' اس بار آنکھوں میں آرزوئیں اور امنگیں سجائے خاندانوں کے خاندان واپس لوٹ رہے ہیں۔ رخصت ہوتے ساون کی آخری بارش نے صحرا کے ساتھ ساتھ میرے تن بدن میں سلگی آگ بھی ٹھنڈی کر دی ہے' میرے اندر بھی ماروؤں کی طرح جلترنگ بجنے لگے ہیں اور مرشد فرید کا یہ بند میرے لبوں پر مچل اٹھا ہے:

روہی وٹھڑی مینگھ ملہاراں
بوٹے بوٹے تھیاں گلزاراں
شالاموڑم دوست مہاراں
بھاگ سہاگ دی موسم آیم

اور بقول شاہ لطیف بھٹائی:

وہ اس برسات کے موسم میں شاید
کسی ڈھلوان پر جا کر رہیں گے
کنوئیں وہ کھارے پانی کے ہمیشہ
منقش لوحِ فطرت پر رہیں گے
نہ بھولوں گی سحر کی مشعلوں کو
تصور میں وہی منظر رہیں گے
مرے قلب ونظر میں پیارے مارو
بہر انداز جلوہ گر رہیں گے

اتوار ۲۱ رنومبر ۱۹۹۹ء بمطابق ۱۲ ارشعبان ۱۴۲۰ ہجری کو میں جب یہاں پہلی بار آیا تھا تو خشک سالی اور قحط نے ماروؤں کو اپنے عذابوں میں جکڑ رکھا تھا لیکن اس بار لق ودق صحرا کے سارے منظر بدل چکے ہیں۔ مون سون کی بارشوں نے صحرا کے عریاں بدن پر سبزے کی چادر ڈال دی ہے۔ میں جس طرف نگاہ دوڑاتا ہوں ہریالی ہی ہریالی مجھے خوش آمدید کہتی ہے۔ موسمِ گرما اور نصیب کی تلخیاں اپنی جگہ مگر حالیہ بارشوں نے ماروؤں کے لبوں پر مسکراہٹیں پھیلا دی ہیں۔ ایک

موسلا دھار بارش ازل کے مارے ماروؤں کی طبعیات بدل کر رکھ دیتی ہے' اس بار بھی یہی ہوا ہے۔ بارشیں کیا ہوئیں کہ ان ستم رسیدہ تھریوں کے چہرے کھل اٹھے ہیں اور خوشیاں ان کے تن بدن سے پھوٹ رہی ہیں۔ سندھ میں ایک مثل مشہور ہے:

''وسے تہ تھر نہ تہ بر''۔

اگر برکھا برسے گی تو یہ تھر ہے' نہیں تو یہ لق ودق صحرا ہے۔ ان دنوں ہونے والی بارشوں نے تھر میں جل تھل ایک کر دیا ہے۔ بے آب و گیاہ صحرا ایک سرسبز وادی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ دنیا کا نرالا ریگستان ہے' عام دنوں میں یہاں ریت اور دھول اڑتی ہے لیکن جب بادوباراں کا موسم تھر پر مہربان ہوتا ہے اور بارشیں برستی ہیں تو یہاں کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ شادابی سارا سال بلند درجہ حرارت میں جھلسے تھر کو اپنی پناہوں میں لے لیتی ہے۔ زمین پر خودرو سبز گھاس کے غلیچے بچھ جاتے ہیں' ٹنڈ منڈ صحرائی درختوں میں بھی پتے اگ آتے ہیں۔ ایسے موسم میں انسان تو انسان جانور بھی خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر قدرت کی ثنا کرتے ہیں۔

یہ تھری جہاں ساون کی سخاوت سے بہت خوش ہیں وہاں وہ بھادوں کی بھرن سے بھی سرگرداں ہیں۔ یہاں مشہور ہے کہ بھادوں کی بارش سے تالاب ہی نہیں کھیت بھی بھر جاتے ہیں جس سے ساون کی بارشوں سے تیار ہونے والی فصلیں تباہی سے دوچار ہو جاتی ہیں اور پورے صحرا میں وبائی امراض پھوٹ پڑتے ہیں اور زمین سے حشرات الارض نکل آتے ہیں' جن سے بڑے پیمانے پر ہلاکتوں کا خدشہ ہوتا ہے۔ تھر میں اگر بھادوں کی بارشیں زور پکڑ جائیں تو مارو ایک دوسرے کو کہتے ملیں گے:

''بھادوں سے بچے تو پھر ملیں گے''۔

میں جب بھی اس عظیم صحرا کا رخ کرتا ہوں ہر بار اس کا کوئی نیا پہلو ایک راز کی طرح مجھ پر فاش ہوتا ہے۔ میں نے ان طویل مسافتوں میں زندگی کے کئی نئے رنگ روپ دیکھے ہیں۔ ہر رنگ پہلے سے الگ' ہر روپ پہلے سے جدا۔ یہی تھر کی دوسرے صحراؤں سے انفرادیت ہے۔ یہ محض اتفاق ہے یا میری خوش نصیبی کہ جوں ہی میں نے صحرا میں قدم رکھا ہے' آسمان پر منڈلاتے گھرے بادلوں نے قیامت کی جھرجھری لی اور لمحوں میں منظر کیا سے کیا ہو گیا۔ جس موسم کے لئے مارو برسوں انتظار کی اذیت سے گزرتے ہیں وہ اس بار پل بھر میں میرا بھی نصیب بن گیا

ہے۔ مچلے ہوئے موسم نے تھوڑی ہی دیر میں تاحدِ نگاہ سیلِ آب کی کیفیت پیدا کردی ہے۔

کل جب میں میر پور خاص سے صحرائے تھر کے لئے روانہ ہوا تو رخصت کرتے ہوئے لالا عبدالخالق خان نے ہاتھ اٹھائے اور دعا دی:

''خاور جان! تم تھر جا رہے ہو تو خدا کرے کہ اس دوران بارش ہو جائے' تمہارا سفر شانت ہو جائے گا۔ خدائے پہ امان۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی' میں نے جونہی ٹنڈو جان محمد میں قدم رکھا' نہ جانے کب اور کہاں سے اچانک کالے بادل گھر آئے اور پل بھر میں موسلا دھار بارش نے ہمارے چلتے قدم تھام لئے' جونہی تھوڑی دیر کے لئے بارش رکتی ہم اگلے سفر کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن میرے پورے سفر میں بارش کا یہ سلسلہ رکا نہیں۔ بے چین اور برہم برستے بادلوں نے مائی مٹھاں کے شہر مٹھی اور پھر جین مندروں کے شہر نگر پارکر تک ہمارا تعاقب جاری رکھا۔

اس بار ساون کی بارش نے کارونجھر کا ملگجا سرخ بدن بھی دھو کر شفاف کر دیا ہے۔ شدید بارشوں کے طفیل اس پر جمی مٹی دھل جانے سے اس پر مزید نکھار آ گیا ہے۔ کارونجھر سے بہہ کر آنے والے پانی سے نگر پارکر کے شمال میں تین کلو میٹر پر واقع تاریخی بوڈھیسر کا تالاب منہ تک بھر گیا ہے۔ محمد خان جونیجو کے دورِ حکومت میں اس قدرتی تالاب کی لیپا پوتی کر کے اسے ڈیم کا نام دے دیا گیا تھا۔ میں یہاں اس سے پہلے بھی آیا ہوں' یہ مجھے ہمیشہ خالی کشکول کی مانند دکھائی دیا لیکن اس بار یہ غضب میں ہے۔ سانولے سلونے ساون نے اس کا خالی کشکول بھر دیا ہے۔ کارونجھر سے بہہ کر آنے والے ندی نالوں نے اسے تنگ دامنی کا احساس دلایا ہے۔ یہ پانی اب برسوں تک ارد گرد کی آبادی اور ان کے مویشیوں کے لئے کافی ہوگا۔ ایک مہرباں ساون انہیں برسوں کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ بوڈھیسر تالاب کے کنارے تاریخی مسجد عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتی ہے۔ اس پر لگا سنگی نقش اس کی تاریخِ تعمیر بیان کرتا ہے:

''سال ۱۵۰۵ء: اس مسجد کا سنگِ بنیاد سلطان محمود بیگڑا ابن سلطان مظفر شاہ بن غیاث الدین نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا۔'' یہ مسجد شکستہ حالی کا شکار ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا وجود مٹتا چلا جا رہا ہے۔ حالیہ بارشوں نے اسے اور بوسیدہ کر دیا ہے۔ میرے ہر سفر میں اس کا کچھ نہ کچھ حصہ زمین بوس ہو جاتا ہے۔ میں اس کی تاریخ جاننے کے لئے اس کے سنگِ بنیاد

پر درج تاریخ کا سہارا لیتا ہوں لیکن اس کے آثار میرے جیتے جی مٹتے چلے جا رہے ہیں۔ تھر میں اسلامی تاریخ کا یہ عظیم ورثہ صرف ۵۰۸ ربرسوں میں زمین کا اناج بنتا دکھائی دے رہا ہے۔ اربابِ بست وکشاد کو زمینی خزانوں سے بھرپور اس عظیم صحرا کی پروا نہیں ہے' اس تاریخی ورثے کو کون سنبھالتا پھرے۔ مجھے خدشہ ہے کہ یہ تاریخی شاہکار اب ایک آدھ طوفانِ بادوباراں کا مہمان ہے' پھر کبھی مضامین میں پڑھنے کو ملا کرے گا کہ کارونجھر کے دامن میں' بوڈھیسر کے مقام پر' تالاب کے کنارے کوئی تاریخی سلطان مسجد ہوا کرتی تھی۔

میں ''تھر۔ کے تاریخی مقامات ایک جھلک'' میں لکھ چکا ہوں کہ ننگر پارکر تھر پارکر کے پارکر حصے (پہاڑی علاقہ) کا صدر مقام اور تعلقہ ہیڈ کوارٹر ہے جو پاک بھارت سرحد پر واقع ہے۔ یہ ایک زمانے میں جین دھرم کا اہم مرکز تھا۔ یہاں جین دھرم سے متعلق کئی شالے اور تیرتھ ہیں جہاں جین مت کے بچے کھچے پیروکار اپنی روحانی تسکین کے لئے اکثر حاضری بھرتے ہیں۔ یہ جین مندر بوڈھیسر کی مسجد سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔ بوڈھیسر کی مسجد سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں تعمیر ہوئی تھی۔ چودہویں صدی عیسوی کے وسط میں تعمیر کئے گئے خوب صورت نقش ونگار اور مورتیوں سے سجے یہ مندر انسانی ہاتھوں کی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جین دھرم کے پیروکار زیادہ تر لوگ یہاں سے بھوک اور پیاس کے ہاتھوں بے بس ہو کر بھارت ہجرت کر چکے ہیں' آتما میں پڑے تو پرماتما کی سوجھے' جب کھانے کو کچھ نہیں تھا تو یہ عبادت گاہیں ان کے لئے کشش کھو بیٹھیں۔ اس دھرم کے ماننے والے لد گئے لیکن ان کے مذہبی مقامات کے خستہ آثار آج بھی موجود ہیں جن کی دیکھ بھال کا ذمہ محکمہ آثارِ قدیمہ نے اٹھالیا ہے۔ ان مندروں میں زیادہ تر برہنہ مورتیاں ایستادہ ہیں۔ یہ جین مندر اپنی تشکیل' طرزِ تعمیر اور سنگ تراشی کا اعلیٰ شاہکار ہیں۔

ننگر پارکر شہر سے ذرا سا ہٹ کر کاسبو گوٹھ میں مرکزی جین مندر بھی فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر آپ سرحدی تقسیم کا نظارہ کر سکتے ہیں جہاں چند سو قدموں پر پختہ برجیاں اور باڑھ پاکستان اور بھارت کے الگ الگ ملک ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ اس مندر کے قریب ہی میٹھے پانی کا ایک بڑا کنواں پیاسے تھر میں نعمت مترقبہ سے کم نہیں ہے' خشک سالی ہو یا برستا ساون' یہ کنواں سدا ابہار ہے۔

اس مندر کی دہلیز پر ملگجے زرد لباس میں ملبوس ایک بوڑھا پروہت اپنے نحیف ونزار ہاتھوں

میں اپنا سر دبوچے آبِ آتش رنگ روتا رہتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں یہ پروہت ایجنسیوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا' اس پر اتنا تشدد کیا گیا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا۔ سرحدی گوٹھ کے بوڑھے مندر کے اس ضعیف پروہت کا نصیب یہ ہے کہ پاکستانی اسے بھارت کا اور بھارتی اسے پاکستان کا جاسوس سمجھتے رہے ہیں۔ اپنی شناخت سے محروم یہ لاغر پروہت مندر میں ایک بے لباس شبیہہ کے سامنے نہ جانے کیا بڑبڑاتا اور روتا ہی رہتا ہے۔ اس کی قوتِ گویائی اور سماعت سلب ہو چکی ہے۔ نہ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے' بس آنکھوں سے ہر دم آنسوؤں کی ایک جھڑی سی لگی رہتی ہے۔ اس بار مجھے بوڑھے مندر کا یہ سن رسیدہ پروہت بھی چند دنوں کا مہمان لگا ہے۔

خون سے کھینچی گئی اس سرحدی لکیر اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت مڈبھیڑ کا ذکر آیا ہے تو تھر کے ایک منقسم سرحدی گاؤں سے متعلق دلچسپ حقیقت آپ کے ذوقِ مطالعہ کی نذر کرتا چلوں۔ بھارتی ریاست گجرات ہی سے متصل پاکستان کے ضلع تھرپارکر کے علاقے چھور میں ایک گاؤں ''وطے'' ہے جس کا آدھا حصہ بھارت اور آدھا پاکستان میں واقع ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ سے پہلے یہاں ایک ایسا کنواں تھا کہ جب بیل پانی نکالنے کے لئے اس کے گرد گھومتا تو بیل کا آدھا چکر بھارت اور آدھا پاکستان میں پڑتا تھا۔ جنگ کے بعد یہ گاؤں ''نو زون'' میں آ گیا تو استعمال میں نہ رہنے کی وجہ سے اس کنوئیں کا پانی بھی خشک ہو گیا۔

اب اس گاؤں کے آدھے لوگ بھارت اور آدھے پاکستان میں رہ گئے ہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اگر پاکستانی حصے کے کسی باشندے کو اپنے عزیزوں کی خوشی غمی میں شرکت کے لئے گاؤں کے بھارتی حصے میں جانا ہو تو اسلام آباد سے ویزا لے کر واہگہ لاہور کے راستے کم و بیش تین ہزار ۲۰۰ر کلومیٹر کا سفر طے کرنا پڑتا ہے جو پہلے صرف چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ اس نئی تقسیم کے بعد دونوں طرف کے رشتے داروں میں کوئی شادی بھی نہیں ہو سکی۔ اب اگر دونوں طرف کے باسیوں کو آپس میں بات کرنا ہو تو سرحدی باڑھ کے آر پار بیٹھ کر ''حال احوال'' کیا جاتا ہے۔

نگرپارکر شہر میں بھی کئی ایک جین مندر جن کا ذکر میں پچھلے صفحات میں کر چکا ہوں' یہ بھی بوڑھیسر کی مسجد کی طرح وقت کی بے نیازیوں کا شکار ہو کر ریزہ ریزہ ہو رہے ہیں۔ ان تازہ بارشوں میں جہاں تھر اور اہلیانِ تھر کے نصیب جاگ گئے ہیں' ان قدیم مندروں کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ ریاست اور ریاست کی اکثریت کی مذہبی وابستگی سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو یہ شاہکار

اس عظیم خطے کی تہذیب' تمدن اور تاریخ کی امانت ہیں۔ ہماری سرزمین پر قدیم مسجد ہو' مندر ہو' کوئی گردوارہ ہو یا کوئی گرجا' یہ ہمارا تاریخی ورثہ ہیں' ان کی حفاظت' ان کی بقا اور سلامتی ہمارا قومی فرض ہے جس سے کوتاہی تاریخی جرم گردانا جائے گا۔ صحرائے تھر میں ہمارے اس عظیم ورثے کو غفلت کا دیمک تیزی سے چاٹ رہا ہے۔ یہ قدیم تہذیب کی زندہ نشانیاں ہیں جو تیزی سے مٹتی چلی جارہی ہیں۔ ان آثار کو بچانا ہمارا قومی فریضہ ہے' کوئی تو ہو جو اس قومی فرض کو نبھانے کے لئے قدم بڑھائے۔ کوئی حکومت' کوئی حکمران' آثارِ قدیمہ کا کوئی دلدادہ' ہے کوئی تو خدا کے لئے سامنے آئے اور منہدم ہوتی ان مسجدوں اور ان مندروں کو اپنی امان میں لے لے اور انہیں تاریخی ورثہ کے طور پر محفوظ بنا کر قومی خدمت انجام دے۔



تھر پارکر شاہراہِ ترقی پر؟

اس بار جب میں میر پور خاص سے لالا عبدالخالق خان اور احمد سعید قائم خانی کی محبتوں سے اپنا دامن بھرے سخی مرد کے شہر ٹنڈو جان محمد پہنچا تو قاضی صاحبان' افتخار گاندھی اور دوسرے لوگوں کی مہمان نوازی نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ سخی مرد میر جان محمد تالپور کے شہر کے باسیوں کے بارے میں جو سنا تھا' انہیں ویسا ہی پایا۔ ملنسار' مہماندار اور دلدار۔ واقعی یہ لوگ چاہے جانے کے قابل ہیں۔ الحمدللہ میں جاہ پسند نہیں ہوں لیکن میرے جیسے تہی دست انسان کو جب کوئی تکریم دے کر شرمندہ کرتا ہے تو اس احسان مندی کے بدلے میں الفاظ کا تحفہ ان کی خدمت میں پیش کرنا میرا فرض بنتا ہے۔ مولا علی کے صدقے اس سفر میں کئی نئے دوست دریافت ہوئے ہیں۔ ان صفحات میں خاص طور پر ٹنڈو جان محمد کے قاضی رحیم بخش ساند اور بزرگ صحافی مظہر الحق مہر' مٹھی پریس کلب کے صدر کھٹو جانی اور نند لال لوہانہ کی محبتوں کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ کھٹو جانی دردمند انسان ہیں۔ تھر اور اہل تھر سے محبت ان کا عقیدہ ہے۔ تھر کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لئے وہ دن رات سرگرم رہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی معاونت سے مٹھی پریس کلب کی نئی عمارت لگ بھگ پینتیس لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کرائی ہے۔ اس عمارت نے میرا دل موہ لیا ہے۔ میرے اس تازہ سفر میں یہ خوب صورت عمارت مٹھی کی تاریخ میں اہم ترین اضافہ ہے۔

اب کے مٹھی آنا ہوا ہے تو یہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ پختہ سڑکوں' پکی گلیوں اور کئی ایک نئی عمارتوں نے اس شہر کی رنگا رنگی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس شہر پر بڑھاپا طاری تھا مگر پچھلے چند

برسوں میں مٹھی نے ترقی کی کئی اہم منازل طے کی ہیں جس نے اسے قدرے جدید شہروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔اس بار یہ شہر اجلا اجلا، نکھرا نکھرا اور سرسبز شہر لگا ہے۔نوکوٹ سے نگر پارکر تک تعمیر ہونے والی نئی پختہ سڑک سے تھریوں کو آمدورفت کی جدید سہولتیں میسر ہوگئی ہیں۔ یہ ترقی سابق وزیر اعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کی اپنے پسماندہ ترین آبائی ضلع کے مسائل حل کرنے کی کوششوں کا نتیجہ ہے یا سابق وزیر اعظم شوکت عزیز کے اعلان کردہ ''تھر پیکج'' کا کرشمہ، اس پر مقامی صحافیوں اور سیاسی کارکنوں میں اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔

تھر کا ایک غالب حلقہ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے دور کو مایوس کن قرار دیتا ہے۔ان لوگوں کا خیال ہے کہ اپنے ڈھائی سالہ دور میں وزیر اعلیٰ نے اپنے خاندانی فارم ڈوڈھارو اور آبائی گاؤں کھیتلاری اور گردونواح کے علاوہ کہیں زیادہ توجہ نہیں دی۔نوکوٹ، ڈوڈھارو تک مٹھراؤ نہر کی ری ماڈلنگ کی گئی ہے اور اسے پختہ کر دیا گیا ہے جبکہ اربابوں کے آبائی گاؤں کھیتلاری تک ۱۲ انچ قطر کی پینے کے پانی کے لئے بھی پائپ لائن بچھائی گئی ہے۔نوکوٹ، ڈوڈھارو اور ارباب رحیم کے گاؤں کھیتلاری تک تعمیر ہونے والی نئی سڑک اپنی مثال آپ ہے، لیکن نوکوٹ سے مٹھی، اسلام کوٹ اور نگر پارکر تک کی تعمیر کی جانے والی سڑک کی مضبوطی کا بھانڈا چند بارشوں ہی میں پھوٹ گیا ہے۔ ریگستان کے تعمیراتی تقاضے پورے کئے بغیر تعمیر کی جانے والی یہ طویل شاہراہ جابجا ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔لگتا ہے چند ایک ساون اور مہرباں ہوگئے تو یہ شاہراہ ریت اور مٹی میں دفن ہو جائے گی۔

میں ''تھر پارکر کا سیاسی نقشہ'' میں عرض کر چکا ہوں کہ ۲۰۰۲ء کے عام انتخابات میں ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے تھر سے این اے ۲۲۹ رتھر پارکر I اور پی ایس ۶۰ رتھر پارکر I سے کامیابی حاصل کی۔ وہ وزارتِ اعلیٰ کے مضبوط امیدوار تھے مگر ابتدائی دنوں میں پیر صاحب پاگارو کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے اس کے باوجود انہوں نے قومی اسمبلی کی نشست چھوڑ کر صوبائی اسمبلی کی نشست اپنے پاس رکھی اور پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے مصداق سندھ کابینہ میں وزارتِ تعمیرات، مواصلات، ورکس اینڈ سروسز قبول کر کے سندھ اسمبلی میں بیٹھ کر وزارتِ اعلیٰ کی کرسی پر نظریں جمائے رکھیں۔ان کی خالی کردہ قومی اسمبلی کی نشست پر ضمنی انتخاب میں ان کے بھتیجے ارباب ذکا اللہ نے کامیابی حاصل کی۔

۲۰۰۴ء میں جب اچانک وزیرِ اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی کو چلتا کیا گیا اور پاکستانی

سیاست کے مہمان اداکار اور غیر منتخب وزیرِ خزانہ شوکت عزیز کو وزیر اعظم بنانے کی ٹھانی گئی تو انہیں این اے ۲۲۹/تھرپارکر I اور فتح جنگ سے این اے ۵۹/اٹک III پر قاف لیگ کا ٹکٹ دیا گیا۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم نے ضمنی انتخاب میں کامیابی حاصل کرنے والے بھتیجے ارباب ذکا اللہ کو مستعفی کرا کے یہ نشست نامزد وزیر اعظم شوکت عزیز کی جھولی میں ڈال دی۔ انتخابی مہم میں شوکت عزیز نے معصوم تھریوں کو ۱۲/ارب روپے کی لاگت سے ''تھر پیکج'' مکمل کرنے کا مژدہ سنایا۔ انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اہلیانِ تھر کو باجرہ اور گوارے کا بیج نصف قیمت پر دیا جائے گا اور ڈھائی لاکھ ایکڑ زمین کے مالکانہ حقوق کسانوں میں تقسیم کئے جائیں گے۔ متوقع وزیر اعظم کے اس اعلان سے صحرائے تھر کے طول و عرض میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ماروؤں کو ڈاکٹر ارباب رحیم کی سیاسی بصیرت پر بھی رشک آیا کہ مستقبل کے وزیرِ اعظم کے تھر سے منتخب کرانے سے ان کے دیرینہ مسائل حل ہونے کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔

شوکت عزیز تھرپارکر اور اٹک کی دونوں نشستوں سے کامیاب ہو گئے لیکن انہوں نے تھرپارکر کی نشست کی بجائے پنجاب کی نشست برقرار رکھنے کو ترجیح دی۔ متوقع وزیر اعظم کے اس اقدام سے تھریوں کو خاصی مایوسی ہوئی بلکہ شوکت عزیز کا انتخابی وعدہ ''تھر پیکج'' بھی قصہ پارینہ بن گیا۔ ۲۰۰۲ء کے انتخابات میں دو برسوں میں ایک نرالی بات یہ ہوئی کہ اس نشست پر چوتھی مرتبہ انتخاب ہوا اور ایک بار پھر ارباب ذکا اللہ شوکت عزیز کی چھوڑی گئی نشست پر رکن قومی اسمبلی منتخب ہو گئے۔ شوکت عزیز کے تھرپارکر کی نشست چھوڑنے کے فیصلے سے ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کی سیاسی ساکھ کو بھی کافی دھچکہ لگا لیکن بعد ازاں انہوں نے سندھ کی وزارتِ اعلیٰ حاصل کر کے اپنی قربانی کی قیمت وصول کر لی۔

اس تازہ سفر میں مٹھی پریس کلب کے صدر اور تھرپارکر کے معروف صحافی کھٹو جانی نے بتایا ہے کہ تھر میں ہونے والی تھوڑی بہت ترقی تھر کے سپوت سابق وزیرِ اعلیٰ سندھ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کی ذاتی توجہ یا سابق وزیر اعظم شوکت عزیز کے ''تھر پیکج'' کی رہین منت نہیں ہے بلکہ اس کا سہرا صدر پرویز مشرف کے سر بندھتا ہے۔ ''تھر پیکج'' کی اصل حقیقت تو یہ ہے کہ ۲۰۰۴ء میں ۱۲/ارب روپے کے منصوبوں کی نوید سنائی گئی تھی، چار سال بعد صورتِ حال یہ ہے کہ اب تک تھرپارکر کو پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملی۔ اس پیکج کی مد میں سندھ حکومت کو ۷۰ کروڑ روپے دیئے گئے جو بھی

تک آگے نہیں بڑھائے گئے۔ پیپلز پارٹی نے تو آتے ہی وار کیا ہے کہ تھر پارکر ہی نہیں تمام ضلعی حکومتوں کے فنڈز میں ٦ کروڑ روپے کی کمی کردی ہے اور اب تو یہ حال ہے کہ یونین' تعلقہ اور ضلعی حکومتوں کو اپنے ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

اپنی منفرد زندگی کی وجہ سے اس عظیم ترین صحرا نے پچھلے کچھ عشروں میں دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ اب آئے دن کوئی نہ کوئی میری طرح اس کی کھوج میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔ ١٩٩٩ء میں تھر پارکر میں بڑے پیمانے پر خشک سالی سے قحط پھوٹ پڑا تو ذرائع ابلاغ نے اسے بڑی اہمیت دی۔ اس مہم میں مقامی صحافیوں کا کردار بہت اہم ہے جنہوں نے اپنی جنم بھومی پر ٹوٹنے والی اس قیامت کی تباہ کاریوں سے مہذب دنیا کو خبردار کیا۔ جون ١٩٩٩ء میں خشک سالی نے یہاں قدم رکھے تو اخبارات وجرائد نے صورتِ حال کی حقیقی تصویر کشی کرتے ہوئے تھر اور اس کے ماروؤں کے مسائل لوگوں کے سامنے رکھے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں صدر پاکستان جنرل پرویز مشرف قدرے دیر ہی سے سہی' تھر پہنچے اور چھاچھرو میں ایک بڑے اجتماع سے خطاب کر کے تھر پارکر اور کاچھو کوہستان کے لئے ایک ارب کے امدادی منصوبے کا اعلان کیا۔ انہوں نے یہ رقم اس وقت کے گورنر سندھ ائیر مارشل (ر) عظیم داؤد پوتہ کو خشک سالی کے متاثرہ علاقوں اور آبادیوں کی بحالی کے لئے خرچ کرنے کی ہدایت کی۔ صدر مشرف کی طرف سے فنڈز کی فراہمی کے بعد اس منصوبے کے تحت تھر پارکر میں کچھ سڑکیں بنیں اور دریائے سندھ سے مٹھڑاؤ کینال کے ذریعے پینے کے پانی کی فراہمی کے لئے اسکیم جوڑی گئی۔

صحرائے تھر میں لوگوں کو آمدورفت کی سہولتوں کی فراہمی اور اسے ملک کے باقی علاقوں سے مربوط کرنے کے لئے سڑکوں کا جال بچھانے کے جامع منصوبے کی منظوری دی گئی جس کے تحت ٨/ارب کی لاگت سے ٧٠٠ کلومیٹر سڑکیں تعمیر کی جانی تھیں۔ ان اسکیموں میں سے کتنی مکمل ہوئیں اور کتنی سرخ فیتے کا شکار ہو گئیں یہ تصویر واضح نہیں ہو سکی۔

١٩٨٨ء میں پبلک ہیلتھ ورکس ڈیپارٹمنٹ سندھ نے نوکوٹ سے مٹھی تک پینے کا نہری پانی پہنچانے کے لئے ایک کمپنی کی خدمات حاصل کی تھیں جس نے ٧٠/لاکھ معاوضہ حاصل کرنے کے بعد جو منصوبہ دیا اس پر ٧٥/کروڑ روپے کی لاگت کا تخمینہ تھا۔ چونکہ اس علاقے میں ٹیلے' بھٹ اور ریت کی بہتات ہے اس لئے تیکنیکی طور پر یہ کام مشکل اور مہنگا تھا۔ تھر میں عام علاقوں کی نسبت

سڑکوں کی تعمیر پر ۲۵ سے ۳۰ فیصد زیادہ لاگت آتی ہے۔ یوں یہ منصوبہ کثیر لاگت کی وجہ سے کھٹائی میں پڑ گیا لیکن جب ۱۹۹۹ء میں صدر پرویز مشرف نے قحط کے عالم میں تھر کا دورہ کیا اور کثیر رقم فراہم کی تو یہ منصوبہ دوبارہ زندہ ہو گیا۔ اس بار یہ کام فوجی انجینئروں کے سپرد کیا گیا جنہوں نے یہ کام ۲۰۰۲ء میں لگ بھگ ۲۲ کروڑ میں مکمل کر دیا۔ اس منصوبے کے تحت نوکوٹ سے مٹھی تک پانی کی پائپ لائن بچھائی گئی ہے جس سے نہ صرف ان شہروں بلکہ راستے میں آنے والے تمام گوٹھوں میں مقیم لوگوں، ان کے جانوروں اور مویشیوں کو پینے کے پانی کی سہولتیں دستیاب ہو گئی ہیں۔

مقامی صحافی بتاتے ہیں، گو کہ مشرف دور میں تھر پارکر کو توجہ نصیب ہوئی مگر اس کے زیادہ تر فوائد نوکوٹ سے مٹھی اور زیادہ سے زیادہ اسلام کوٹ، نگر پارکر شاہراہ کے اردگرد آباد تھر پارکر کی صرف ۱۰ فیصد آبادی ہی کو حاصل ہو سکے۔ ان علاقوں اور مرکزی شاہراہ سے کوسوں دور بسنے والی ۹۰ ر فیصد آبادی اس ترقی سے بالکل محروم رہی۔ یہ لوگ آج بھی روٹی روزی اور پینے کے پانی کے لئے اللہ کی آس پر زندہ ہیں۔ تھر پارکر میں ۲۳۰۰ گاؤں ہیں۔ آبادی ۱۳ ر لاکھ سے بھی بڑھ چکی ہے اور ۹۰ ر فیصد سے زائد آبادی دیہات میں رہائش پذیر ہے۔

تھر پارکر میں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۰۳ء تک چار برسوں میں ہونے والی ترقی کا عقدہ یہ کھلا ہے کہ اس وقت ۲۱ ر ہزار سے زائد مربع کلومیٹر پر محیط صحرائے تھر کے ۲۳۰۰ ر گاؤں میں ۱۰۰ ر سے زائد گاؤں میں بجلی کی سہولت مہیا نہیں ہے، دو ہزار کے قریب گاؤں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہیں۔ صرف ۱۰۰ ر سے زائد گوٹھوں کے علاوہ پینے کا پانی دستیاب نہیں اور صرف ۲۰۰ ر سے زائد علاقوں کے لوگوں کو آمد و رفت کے لئے پختہ سڑکیں میسر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بھوک اور پیاس کے ستائے ہوئے کم و بیش ۴۰ ر فیصد تھری دانے پانی کی تلاش میں ہر سال بیراجی (نہری) علاقوں کی طرف عارضی ہجرت پر مجبور ہو جاتے ہیں جہاں وہ کھیت مزدور کی حیثیت سے کام کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ نوکوٹ سے ننگر پارکر یا ڈیپلو، چھور، چھاچھرو تک سڑکوں کی تعمیر کی وجہ سے رسائی آسان ہو گئی ہے لیکن ان شاہراہوں سے کوسوں دور آباد گوٹھوں تک کا سفر اب بھی خواب کی مانند ہے اور اس کے لئے عہدِ جدید میں بھی جان جوکھوں میں ڈالنا پڑتی ہے۔

میں پہلے بھی کہیں لکھ چکا ہوں کہ محمد خان جونیجو نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں تھر پارکر میں کافی ترقیاتی منصوبے دیئے جس کی وجہ سے انہیں آج بھی تھری اچھے لفظوں سے یاد کرتے

ہیں۔انہوں نے غالباً ۱۹۸۶ء میں ننگر پارکر میں گرڈ اسٹیشن کا منصوبہ دیا لیکن ان کی برطرفی کے بعد اس پر کام جاری نہ رہ سکا۔اس منصوبے پر بھی ۱۹۹۹ء میں صدر جنرل مشرف کی تھر آمد کے بعد ۲۰۰۱ء میں دوبارہ کام شروع ہوا اور جلد ہی اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ننگر پارکر کو بجلی فراہم کر دی گئی۔جین مندروں میں گھرا یہ پراسرار شہر رات کو جگ مگ کرتا دکھائی دیتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو نے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے دور میں تھر کول فیلڈ تھاریو ہالیپوتہ میں بجلی گھر کا افتتاح کیا۔غالباً برطانوی کمپنی سے معاہدہ طے پایا۔گولڈن وو نے صرف ۴ سینٹ میں بجلی واپڈا کو دینے کی حامی بھری تھی لیکن جب میاں نواز شریف برسرِ اقتدار آئے تو یہ معاہدہ بیوروکریسی نے ختم کرا دیا۔میاں نواز شریف کے دور میں یہاں مکمل طور پر کام بند رہا۔صدر جنرل مشرف کے دور میں تھر کول پراجیکٹ پر کام کی امیدیں جاگیں۔چینی کمپنی شنوا گروپ نے یہ کام کرنے کی پیشکش کی مگر اس کے ۶ سینٹ کے نرخوں کو واپڈا اور نیپرا نے شرفِ قبولیت نہیں بخشا تو یہ کمپنی بھی پیچھے ہٹ گئی۔ملکی بیوروکریسی کی طرف سے ہر قدم پر رکاوٹ' ہر قدم پر ذاتی مفادات کی کوشش نے اس منصوبے کی تکمیلات کو معمہ بنا دیا ہے۔تھری شاکی ہیں کہ اگر محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورِ اقتدار ۱۹۹۴ء ہی میں بجلی پیدا کرنے کے اس منصوبے پر عملدرآمد کر دیا جاتا اور معاہدہ بروئے عمل ہو جاتا تو آج نہ صرف تھر کی تقدیر بدل گئی ہوتی بلکہ ملک اور قوم کو اربوں کھربوں کی بچت ہو چکی ہوتی۔آسٹریلیا اور انڈونیشیا میں ۱۲۰۰ رفٹ گہرائی سے کوئلہ نکالا جا رہا ہے' تھر میں یہ نعمت ۲۰۰ رسے ۴۰۰ رفٹ گہرائی میں دستیاب ہے لیکن اس کی دریافت کے برسوں بعد بھی حکمرانوں کی غفلت کے سبب یہ ''کالا سونا'' کام میں نہیں لایا جا سکا۔

تھر میں کوئلہ کے ذخائر کو کارآمد بنانے کے لئے وزیر اعظم شوکت عزیز اور سابق وزیر اعلیٰ سندھ ارباب غلام رحیم کے دور میں بڑے وعدے کئے گئے مگر ان کے لگ بھگ تین برسوں میں بھی کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہو سکا' جس کی توقع یا دعوے کئے جا رہے تھے۔پاکستان پیپلز پارٹی پھر برسر اقتدار آ چکی ہے۔تھر کول کی ملکیت پر وفاق اور حکومت سندھ میں شدید اختلافات تھے۔اس حکومت نے تھر کول اینڈ انرجی بورڈ تشکیل دینے کا نوٹیفکیشن جاری کیا ہے۔اس بورڈ میں وفاق اور صوبے کو مساوی نمائندگی دی گئی ہے۔بورڈ میں چار چار اراکین وفاق اور صوبے سے لئے گئے ہیں جبکہ ایک ممبر کا وفاق اور صوبے دونوں سے تعلق بنتا ہے۔بورڈ کا چیئرمین

وزیراعلیٰ سندھ کو بنایا گیا ہے۔ کوئلہ سے متعلق کوئی بھی معاہدہ کرنے کے اختیارات وفاقی سیکرٹری پانی وبجلی اور چیف سیکرٹری سندھ کو دیئے گئے ہیں۔

سندھ کی ملکیت اس بلیک گولڈ کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے پیپلز پارٹی کی موجودہ حکومت نے تھر کے کوئلے کو استعمال میں لاکر توانائی کے بحران پر قابو پانے کی کوششوں کا ایک بار پھر آغاز کر دیا ہے۔ تھرکول توانائی میں سرمایہ کاری کرنے والوں کو ترغیب دینے کے لئے سندھ حکومت نے کلفٹن کراچی میں ایک لائبریری بھی قائم کی ہے جس میں تھر کے کوئلے کے مختلف بلاکوں کی سروے رپورٹس، اسٹڈی رپورٹس، فزیبلٹی رپورٹس اور دیگر مواد موجود ہے۔ تھرکول سے متعلق رپورٹس کی تیاری میں حکومت نے خطیر رقم خرچ کی ہے۔ فزیبلٹی یا اسٹڈی رپورٹ کی تیاری میں طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ لائبریری میں ان رپورٹوں کی دستیابی سے سرمایہ کاروں کا وقت اور پیسہ دونوں بچ جائیں گے۔ تھرکول توانائی سے زیادہ سستی بجلی کے حصول کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ تھرکول منصوبے پر عملدرآمد سے پاکستان میں پانچ سالوں میں معاشی انقلاب آسکتا ہے۔ لیکن بات پھر وہی آجاتی ہے کہ نیت ٹھیک ہو اور منصوبہ بندی میں کوئی جھول نہ ہو اور مسلسل کام جاری رکھا جائے تو منزل زیادہ دور نہیں۔

مٹھی پریس کلب میں دوستوں سے تعلیم وصحت کے شعبے میں ترقی کے حوالے سے بات ہوئی تو بتایا گیا کہ ان شعبوں میں تھر کا بیڑہ غرق کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کے وزیراعلیٰ سندھ بننے سے توقعات بندھی تھیں کہ شاید وہ تھری ہونے کے ناطے ماروؤں کے زخموں پر مرہم رکھیں گے لیکن تھر کا یہ مسیحا ان کے زخموں کے اندمال کا سبب نہ بن سکا۔ وہ ڈھائی برس مسندِ اقتدار پر متمکن رہے، اس مختصر مدت میں وہ تھریوں کے لئے کیا کرتے انہیں اپنے آقاؤں کو خوش رکھنے اور مخالفین کو نیچا دکھانے سے ہی فرصت نہیں ملی۔ اس عرصے میں وہ کبھی کراچی، کبھی اسلام آباد اور کبھی عمرے کے لئے عازمِ سفر رہے۔ ان کی کارکردگی کا محور ڈوڈھار و اور کھیتلاری کی تعمیر وترقی، ایم کیو ایم سے صدقے میں ملی وزارتِ اعلیٰ بچانے اور اپنے گناہ بخشوانے کے لئے سعودی عرب کے درجنوں دوروں تک محدود رہی۔ ان کے اس دور میں تھری باشندوں کا تو کیا بھلا ہونا تھا، ان کے حامی تھری وڈیروں کی خوب بن آئی اور انہوں نے ناظموں کو ملنے والے فنڈز سے اپنی تجوریوں کے منہ بھر لئے، عام تھری اب بھی مسائل کی دلدل میں دھنسا ہے۔

تھر پارکر میں اب بھی سرکاری اسپتالوں کا یہ حال ہے کہ وہاں کوئی طبی عملہ کام کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اگر کہیں علاج معالجے کی تھوڑی بہت سہولتیں میسر ہیں تو وہاں ادویہ ناپید ہیں۔ یہاں آنکھوں‘ پیٹ‘ گلے‘ تپ دق‘ ہیپاٹائٹس کی بیماریاں عام ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق تھر کی ۲۰ ر فیصد آبادی تپ دق کی مریض ہے۔ یہ بیماری بچوں تک عام ہے۔ اوسطاً ہر دوسرا تھری کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہے مگر تھری اتنی بساط نہیں رکھتے کہ اسپتالوں تک رسائی حاصل کر کے اپنا علاج کرواسکیں۔ وہ مرض سے نجات کے لئے زیادہ تر دیسی طریقوں اور ٹونوں ٹوٹکوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور تو اور سانپ سے ڈسے جانے کی صورت میں بھی دم درود اور زہر چوسنے والے جوگیوں اور سپیروں کی مہارت پر تکیہ کیا جاتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب صحرائے تھر میں سانپ کے ڈسنے ہونے والی شرحِ اموات میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کی وجہ اے ایس وی (اینٹی اسنیک وینم) کی فراہمی ہے جو پاکستان میں صرف ایک ہی ادارہ این آئی ایچ (نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ہیلتھ) اسلام آباد تیار کر رہا ہے۔ یہ تریاق ایک خاص قسم کے سانپ کے زہر ہی سے حاصل کیا جاتا ہے‘ اگر اس ادارے کی استعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو تھر میں سانپوں کے ڈسنے سے ہونے والی اموات میں مزید کمی واقع ہو سکتی ہے۔ فی الحال پورا ملک تو ایک طرف رہا یہ ادارہ صرف تھر پارکر کی ضرورتیں بھی پوری کرنے سے قاصر ہے۔ اے ایس وی کا ایک ہی انجکشن سانپ کے ڈنک میں امرت ثابت ہوتا ہے‘ اے ایس وی کی دریافت سے پہلے مریض کو کئی انجکشن لگانا پڑتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق پورے تھر پارکر میں سانپ کے ڈسنے کے کم و بیش ۳۰۰۰ ر واقعات سالانہ رونما ہوتے ہیں۔



یارب چمنِ نظم کو گلزارِ ارم کر

صحرائے تھر دنیا کا نرالا اور دل فریب صحرا ہے یہ تاریخ' تہذیب' تمدن' ثقافت' سیاحت' معدنیات اور زندگی کا ہر رنگ اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسے خدا تعالیٰ نے اتنی نعمتوں سے نوازا ہے کہ ایک اچھی منصوبہ بندی اور مناسب سرمایہ کاری سے اسے چند برسوں میں صرف مقامی آبادی ہی کے لئے ہی نہیں ملک اور قوم کے لئے ایک غیر معمولی معیشت کا وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم من حیث القوم بڑے عاجل' سطحی سوچ رکھنے والے اور راتوں رات سب کچھ پالینے کے خوفناک مرض میں مبتلا ہیں۔ سرطان سے زیادہ خطرناک یہ بیماری عام آدمی سے حکمرانوں تک سب میں مشترک ہے۔ قومی زندگی اور منصوبہ بندی میں بھی ہم عارضی اور عبوری حکمتِ عملی پر اکتفا کرتے ہیں۔ میری تجویز ہے کہ تھر کو ایک پرکشش اور اہم سماجی مرکز کی شکل دینے کے لئے جنگی بنیادوں پر ترقیاتی منصوبے تشکیل دیئے جائیں۔

فوری طور پر با اختیار ادارہ ''تھر ڈویلپمنٹ اتھارٹی'' قائم کی جائے۔

''تھر ڈویلپمنٹ اتھارٹی'' کے ذریعے تھر کے وسائل کو بروئے کار لانے کے لئے جامع منصوبہ بندی اور حکمتِ عملی تیار کی جائے۔ پہلے مرحلے میں فوری طور پر تھر پارکر کے طول و عرض میں مختلف شہروں اور اہم ترین گوٹھوں کو مربوط کرنے کے لئے ۲۰۰۰ کلومیٹر طویل موٹر وے اور ۳۰۰۰ کلو میٹر طویل معیاری پختہ سڑکیں تعمیر کی جائیں۔

تھر کول منصوبے کو ترجیحی بنیادوں پر پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔

تھرپارکر کے طول وعرض میں بجلی کی فراہمی دنیا کے اس تیسرے بڑے صحرا میں انقلاب کا نقطہ آغاز بن سکتی ہے۔

میرپورخاص سے کارونجھراور تھرکول فیلڈ تک ریلوے لائن بچھائی جائے تاکہ مقامی لوگوں کو نہ صرف آمدورفت کی سہولتیں میسر ہوں بلکہ گرینائیٹ اور کوئلہ کی ترسیل ملک کے اہم شہروں اور دیگر ملکوں تک ممکن ہو۔

دھوپ اور تیز ہوائیں بھی تھر کیلئے قدرت کا عظیم عطیہ ہیں۔اس لئے تھرپارکر کے طول وعرض میں شمسی توانائی کے منصوبے' ہوائی چکیاں اور پانی کو میٹھا کرنے کے چھوٹے چھوٹے منصوبے قائم کردیئے جائیں تو توانائی کے ان قدرتی منصوبوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

تھر میں منتخب مقامات پر مویشیوں کے وسیع ترین جدید فارم قائم کرکے جانوروں کی افزائش کا منصوبہ بروئے کار لاکر تھر اور اہلیانِ تھر کی تقدیر بدلی جاسکتی ہے۔اس حوالے سے کئی ملک تھر میں سرمایہ کاری کرسکتے ہیں۔سرمایہ کاروں کو ''تھرڈویلپمنٹ اتھارٹی'' اور دیگر اداروں کے توسط سے ترغیبات اور بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

تھر میں چینی طرز کے جدید ترین ذبیحہ خانے چاروں تعلقوں میں قائم کئے جائیں تاکہ گوشت محفوظ بناکر بیرونِ ملک برآمد کیا جاسکے۔

جہاں جہاں مویشیوں کے فارم قائم کئے جائیں وہاں ملک پلانٹ نصب کئے جائیں تاکہ دودھ برآمد کرکے کثیر زرِمبادلہ کماکر قومی وسائل میں اضافہ کیا جاسکے۔

مویشیوں کی خوراک کے لئے ''فیڈ انڈسٹری'' قائم کی جائے۔

تھرپارکر کے طول وعرض میں منتخب مقامات پر جانوروں کے علاج کے لئے جدید ترین ''وٹرنری اسپتال'' قائم کئے جائیں اور مویشیوں کے علاج کے لئے گشتی یونٹ بھی تشکیل دیئے جائیں تاکہ دوردراز علاقوں میں بھی بیمار جانوروں کے علاج کی سہولتیں میسر ہوں۔

تھر میں پولٹری کی صنعت کے قیام اور فروغ کے لئے منصوبہ بندی کرکے نہ صرف قومی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں بلکہ یہاں سے لاکھوں ڈالرز زرِمبادلہ کمایا جاسکتا ہے۔

تھرپارکر کے اہم شہروں میں انڈسٹریل زون قائم کئے جائیں۔قالین بافی' دستکاری اور دوسرے اہم مقامی پیشوں کی چھوٹی بڑی صنعتیں قائم کرکے عام تھری خواتین اور مردوں کو روزگار

کے وسیع مواقع فراہم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ کام اس وقت بھی تھر میں غیر منظم انداز میں محدود پیمانے پر جاری ہے' اسے بڑے پیمانے پر ضابطے میں لاکر کروڑوں ڈالر کا زرِ مبادلہ کما کر ملک کو خوشحالی کی راہ پر گامزن کیا جاسکتا ہے۔

کارونجھر کے گرینائیٹ کو جدید طریقوں سے کام میں لانے اور اس کی برآمد کو یقینی بنانے کے لئے بوڈھیسر کے مقام پر جدید ترین پلانٹ نصب کیا جائے۔ کارونجھر کے پہاڑی سلسلے تک ریلوے اور مضبوط سڑک تعمیر کی جائے۔

مختلف ملکوں سے سفاری پارک کے تصورات لے کر تھر پارکر کی چاروں تحصیلوں مٹھی' ڈیپلو' چھاچھرو اور نگر پارکر میں ہزاروں ایکڑ رقبے پر سفاری پارک قائم کئے جائیں۔ ان پارکوں میں جھیلیں' ہٹس اور مہمان خانے تعمیر کئے جائیں تاکہ سیاحوں کو قیام کی سہولتیں حاصل ہوں۔ ان سفاری پارکوں کے ذریعے غیر ملکی اور ملکی سیاحوں کے لئے کشش پیدا کی جائے۔ ان پارکوں تک جدید ترین سڑکیں تعمیر کی جائیں تاکہ سیاحوں کو آمد و رفت میں دقت نہ ہو۔

مٹھی میں عالمی سطح کا ''تھر میوزیم'' ''تھر آڈیٹوریم'' قائم کیا جائے جس میں صحرائے تھر کی تاریخ' تمدن' تہذیب اور ثقافت سے متعلق مواد' نوادرات' تاریخی آثار کے ماڈلز' جین اور بدھ مت سے متعلق مجسم' مورتیاں اور دیگر شاہکار' تھر کی دستکاری کے نمونے اور ہنرمندوں کے شہ پارے نمائش کے لئے رکھے جائیں۔

تھر کی زبان وادب کے تحفظ' ترویج و اشاعت کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

جنگلی حیات اور ماحولیات کے تحفظ کے لئے ادارے کو موثر کیا جائے۔

اس وقت نہر کے ذریعے دریائے سندھ سے تھر پارکر کو محدود پیمانے پر آب پاشی اور آب نوشی کے لئے پانی فراہم کیا جارہا ہے لیکن تھر پارکر میں میگا پراجیکٹس کے لئے سمندری پانی کو میٹھا کر کے تھر تک پہنچانے کے لئے بڑے منصوبے کی تکمیل اہمیت کی حامل ہوگی۔

برساتی اور سیلابی پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے کارونجھر کے اردگرد ڈیم بنائے جائیں اور مختلف علاقوں کے نشیب میں بھی پانی ذخیرہ کرنے کے انتظامات کئے جائیں۔

اسی طرح تمام مجوزہ منصوبوں تک گیس کی فراہمی یقینی بنائی جائے' اس کے لئے ضلع بدین سے جو قریب ہی واقع ہے' یہ سہولت بطریقِ احسن حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس وقت تو یہ حال ہے

کہ تھر کول کو گیس فراہم کرنے کے جس منصوبے کی منظوری دی گئی تھی ' تا دمِ تحریر اس کی جائزہ رپورٹ ہی پیش نہیں کی جا سکی۔ اس منصوبے پر ۱۲ کروڑ روپے لاگت کا تخمینہ لگایا گیا تھا جو اب یقیناً اور زیادہ لاگت ہی سے پایہ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا۔

صحرائے تھر پاکستان کے لئے قدرت کی طرف سے عظیم عطیہ سے کم نہیں ہے۔ معقول منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری سے اسے ملک اور قوم کے لئے زرِمبادلہ کمانے کا ایک مستقل ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ میں اقتصادیات کا آدمی نہیں ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ قومی بجٹ کا پانچ دس فیصد بھی اگر پانچ دس برسوں تک تھر کے لئے میرے ان مجوزہ منصوبوں پر خرچ کر دیا جائے تو اگلے پانچ برسوں میں ملک قرضے کی لعنت سے چھٹکارا پا کر خود کفالت کی منزل سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ لیکن ترجیحات کا قبلہ درست کئے اور انتہائی سنجیدگی اختیار کئے بغیر ان اہداف تک پہنچنا محال ہے۔ یہ جو ہم کشکول لئے در بہ در بھٹکتے اور خیرات کے لئے کبھی امریکہ ' کبھی چین اور کبھی سعودی عرب کی طرف دیکھتے رہتے ہیں' صرف اس ایک ہمہ جہت منصوبے کی تکمیل سے ہم باوقار قوموں کی صف میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے جرات مندانہ فیصلوں اور ثابت قدمی کی ضرورت ہے۔ جب تک ملک اور عوام کو مخلص اور محبِ وطن قیادت نصیب نہیں ہوتی اس وقت تک یہ سارے خواب بے تعبیر اور منصوبے نا تمام رہیں گے۔



معاون حوالہ جات

صحرائے تھر کے طول و عرض میں تفصیلی دورے

مختلف الخیال مقامی لوگوں سے تفصیلی مکالمے

روزنامہ نوائے وقت کراچی: سعید خاور / الطاف مجاہد / اسلم قائم خانی

روزنامہ جنگ کراچی: غلام محی الدین / غلام حسین محمدانی

روزنامہ خبریں کراچی

ٹی وی ون / عزیز سنگورو

''کالاباغ ڈیم حقائق کے آئینے میں'' (جنگ) ڈاکٹر پروفیسر جاوید چانڈیو

''تھر'' عبدالقادر منگی

''حیدرآباد'' عشرت علی خان

''شیر دریا'' جین فیرلی

''تاریخ ریگستان'' رائے چند ہریجن

''تھر مسلن جو گھر'' پروفیسر پی اے ٹیکمانی

''تحریک آزادی میں سندھ کا کردار'' عبدالجبار عابد لغاری

''شاہ جو رسالو'' ترجمہ: شیخ ایاز

''پاکستان کی انتخابی سیاست'' عقیل عباس جعفری

الیکشن کمشن آف پاکستان

''مسکین جہان خان کھوسو'' محمد بخش بلوچ مجنوں

تصاویر: سہیل عاصم / ساجد علی

''پیاس اور افلاس کا صحرا''

ادیبوں' دانشوروں اور صحافیوں کا تحفہ نقد و نظر

۲۰۱۰ء

سعید خاور: صحرا سے ساحل تک

خورشید انجم

سعید احمد خان خاور المعروف سعید خاور 24 رفروری 1962ء کو ضلع بہاول پور کے ایک صحرائی گاؤں محراب والا میں ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ان کے اجداد عباسی نوابوں کے محکمہ شکاریات کے نگران تھے اور ان کے والد حاجی امیر بخش خان المعروف ''میرن خان'' بھی شکاریات کے ماہر مانے جاتے تھے اور ان ہی محاسن کی وجہ سے انہیں ہر قسم کے طبقے کی نمائندہ شخصیات تک رسائی حاصل تھی۔سعید خاور کی تعلیم و تربیت اور جہد مسلسل ان کے والد اور والدہ ''بڑی اماں'' کی ترقی پسندانہ سوچ اور روشن خیالی سے لیس تربیت کی رہین منت ہے۔انہوں نے ابتدائی تعلیم ڈیرہ نواب صاحب کے مڈل اسکول سے حاصل کی اور میٹرک کا امتحان 1977ء میں گورنمنٹ صادق عباس ہائی اسکول احمد پور شرقیہ سے پاس کیا۔ 1980ء میں گورنمنٹ صادق عباس انٹر کالج سے انٹر اور 1983ء میں بہاول پور کی معروف درس گاہ صادق ایجرٹن ڈگری کالج سے بی اے کیا۔ 1980ء میں وہ صادق عباس کالج طلبہ یونین کے صدر منتخب ہوگئے۔80ء کی دہائی میں سعید خاور بطور طالب علم رہنما ضیا آمریت کے خلاف برسرِ پیکار رہے' آمریت مخالف سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا نام ''انتہائی مطلوب افراد'' کی فہرست میں شامل رہا اور ان پر 1981ء میں ڈیرہ نواب صاحب کے عید گاہ گراؤنڈ میں عید کے ایک بڑے اجتماع سے پرجوش خطاب کی پاداش میں مارشل لائی ضابطوں کے تحت مقدمہ بھی قائم ہوا اور وہ ایک عرصے تک روپوش رہے۔ سعید خاور طلبہ سیاست میں سرگرم ہونے کے علاوہ کالج کے مجلّہ ''العباس'' کے مدیر بھی رہے۔

اسی کالج سے انہوں نے بہترین سماجی کارکن، بہترین مقرر اور نیشنل کیڈٹ کور کے بہترین کیڈٹ کے اعزازات حاصل کئے اور سال کے بہترین طالب علم کی حیثیت سے اپنی ساکھ بنائی۔

1983ء میں بہاول پور سے گریجویشن کے بعد مالی مسائل کے باعث وہ سلسلہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکے اور تلاش معاش کے سلسلے میں دربدری سعید خاور کا مقدر ہوگئی۔ محراب والا سے لاہور، ملتان، کوئٹہ اور نجانے کہاں کہاں سفر در سفر طے کر کے انہوں نے اپنے پاؤں چھالے کئے۔ طبقاتی تفریق، سماجی ناہمواری کے خلاف اپنے باغیانہ تصورات کی پاداش میں درپیش ناموافق حالات کے پیش نظر سعید خاور نے 1986ء میں صحرا سے ساحل کا رخ کیا اور محراب والا سے کراچی چلے آئے اور دسمبر 1987ء میں ایک عام کارکن کی حیثیت سے نوائے وقت کراچی میں ملازمت اختیار کر لی۔ کراچی آمد کے بعد سعید خاور نے اعلیٰ تعلیم کے لئے اپنے ادھورے خوابوں کی تعبیر کا سفر دوبارہ شروع کیا۔ صحافتی پیشہ ورانہ مصروفیات اور مارچ 1994ء میں شادی کے باوجود 1994ء ہی میں وفاقی اردو کالج کے طالب علم کی حیثیت سے ''صحافت'' میں ماسٹرز کیا اور 1996ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور اپنی تعلیم مکمل کر کے والد کے خواب کی تعبیر ان کی زندگی میں پوری کی جو مالی وسائل کی عدم دستیابی کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ سعید خاور نے اپنی مدد آپ کے تحت اپنی کامیابی کی راہیں کسی ڈھارس کے بغیر خود تراشیں۔

مائی کلاچی کے شہر کراچی میں اپنی دریافت کے طویل سفر میں سعید خاور نے بے پناہ محنت کی اور خود کو انسانوں کے اس عظیم ہجوم میں گم ہونے سے بچالیا۔ اپنے صحافتی کیریئر میں انہوں نے کئی اہم کامیابیاں سمیٹیں اور ایک خوددار صحافی اور ذمہ دار مدیر کے طور پر اپنی شناخت بنائی۔ مسلسل ذہنی ریاضت کے طفیل سعید خاور نے زندگی کو جھیلنے کی بجائے اسے ڈھنگ سے برتنے اور اسے دوسروں کے لئے ایک مثال بنانے کے گر سیکھ لئے ہیں۔ کراچی میں اپنے دو ڈھائی عشروں پر محیط قیام کے دوران وہ برسوں خواجہ غلام فرید کانفرنس کے سیکرٹری رہے اور وسیب کے درماندہ لوگوں کی بیداری کے لئے اپنے مہربان دوستوں کے ہمراہ خدمات انجام دیتے رہے۔ سعید خاور کی زندگی کے کئی روپ ہیں لیکن انہوں نے اپنی زندگی میں توازن قائم کر کے جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔

سعید خاور نے زمانہ طالب علمی میں ''پاکستان کا نظریاتی تشخص'' لکھی جو منظر عام پر نہ آسکی۔ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' سعید خاور کی تیسری مطبوعہ کتاب ہے، اس سے پہلے 1987ء

میں ان کی سرائیکی لوک صنف پر کتاب ''ساون چارڑ یہاڑے'' اور 1998ء میں بزرگ سیاست دان سردار شیر باز خان مزاری کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب ''ایک عہد گم گشتہ کی کہانی'' منظرعام پر آ چکی ہے۔سعید خاور اپنی ٹی وی اور اخبار کی مصروفیات کی وجہ سے برسوں کوئی کتاب نہیں دے سکے لیکن دس برسوں کے وقفے کے بعد شائع ہونے والی ان کی تازہ تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی تخلیق نے انہیں لکھنے والوں کے ہراوّل دستے میں لا کھڑا کیا ہے۔ یہ کتاب ایک بے چین مسافر اور فرض شناس صحافی کے لق ودق صحرا کے طویل سفروں کی کتھا کہانی' ایک محقق کی کھوج در کھوج مشقت اور ایک روشن خیال اور دردمند ادیب کے مصلحت سے بے نیاز قلم کی شب وروز ریاضت کا نتیجہ ہے۔ان کی مسلسل صحرانوردی سے ایک نیا سعید خاور دریافت ہوا ہے۔جس نے صحرا کی وسعتوں کو''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی مٹھی میں بند کر دیا ہے۔اس کتاب کی تصنیف کے بعد سعید خاور سے پڑھنے والوں کی توقعات بڑھ گئی ہیں۔اللہ کرے زور قلم اور زیادہ.....



بندۂ صحرائی' سعید خاور

فرہاد زیدی

علامہ اقبال نے کہا تھا:

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندہ صحرائی یا مرد کہستانی

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس شعر کا صحیح مفہوم مجھ پر سعید خاور کی تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' پڑھنے کے بعد ہی پوری طرح روشن ہوا۔ یہ بندہ صحرائی تھر کا باشندہ نہیں لیکن وہ دنیا کے اس تیسرے بڑے صحرا سے جڑے ہوئے ایک اور صحرا چولستان کا باسی ضرور ہے۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ صحرا کی محبت اس کی رگ و پے میں خون کی طرح دوڑ رہی ہے۔ تھر پر سندھی' اردو اور انگریزی میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں' لیکن پیاس اور افلاس کے اس صحرا کی زندگی' تہذیب اور تاریخ پر دلوں کو چھو لینے والی ایسی دستاویز شاید ہی کسی نے مرتب کی ہو اور یوں سعید خاور اپنے محدود وسائل کے سبب فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کا دعویٰ تو ممکن ہے نہ کریں' لیکن انہوں نے اکیس ہزار مربع کلومیٹر میں بکھرے ہوئے تیرہ لاکھ سے زائد صحرائی بندوں کی ترجمانی کا حق ضرور ادا کر دیا ہے۔

سعید خاور کی اس کتاب کا سب سے بڑا احسن یہ ہے کہ انہوں نے خشک اور بے جان لفظوں کو قوت گویائی عطا کی اور اس کا سہرا ان کی تخلیقی چابکدستی کے سر جاتا ہے' وہ اپنے اخبار کے غیر ادارتی شعبے سے وابستہ ہوئے تھے' پھر صحافی بن گئے اور بقول خود اس صحافی نے ان کے اندر کے لکھاری کو قابو کر لیا' پندرہ سال کی جدوجہد کے بعد وہ ریذیڈنٹ ایڈیٹر بنا دیئے گئے اور یوں صحافی ایک منتظم کے ہتھے چڑھ

گیا ہے۔ انہوں نے پہلے تو منتظم کے ہاتھ سے صحافی چھڑایا اور پھر صحافی کے چنگل سے اپنے اندر کے لکھاری کو بازیاب کرانے کی کوشش کی۔ "پیاس اور افلاس کا صحرا" ان کی اسی جہد مسلسل کا ایک شاندار نتیجہ ہے لیکن میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صحافی سعید خاور لکھاری سعید خاور سے کہیں بھی متصادم نہیں بلکہ صحافی نے لکھاری کے فن کو جلا بخشی ہے اور ان کے امتزاج نے "پیاس اور افلاس کے صحرا" کو تحقیق، مشاہدے اور صحرا سے محبت کے ایک ایسے شاہ کار میں ڈھال دیا ہے جو بیک وقت ایک رپورتاژ بھی ہے، تھر کے ماضی اور حال کا نوحہ بھی ہے اور اس علاقے کی پسماندگی کے ذمہ دار مقتدر افراد کے منہ پر طمانچہ بھی۔

خواجہ فریدؒ اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام سے مزین اس تحریر میں عمر ماروی، سارنگا اور سدھونت، سسی پنوں اور کھڈی کے کمسن مزدوروں سے لی جانے والی جبری مشقت کی کہانیاں بھی۔ ایک باب تھر پارکر کی سیاسی صورت حال کے لئے مخصوص ہے تو تھر کی زندگی اور تاریخ اور تاریخی مقامات کے علاوہ مغل، سندھی اور انگریزوں کے دور حکمرانی کا اجمالی جائزہ بھی موجود ہے۔

لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ سعید خاور نے بڑی دلسوزی کے ساتھ اس مجرمانہ غفلت کی طرف توجہ دلائی ہے جو بالعموم پاکستان اور بالخصوص تھر کے معدنی وسائل سے استفادہ نہ کر کے برتی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے تھر کے کوئلے کے ذخائر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جنوری 1993ء میں ملک کے صدر سردار فاروق لغاری نے تھر کا دورہ کر کے قوم کو نوید سنائی تھی کہ اس علاقے میں ملنے والا "کالا سونا" تھر اور پاکستان کی تقدیر بدل دے گا اور اس سے بالواسطہ طور پر پانچ لاکھ افراد مستفید ہو سکیں گے۔

دو سال بعد 1995ء میں وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو (شہید) نے بھی تھر کا دورہ کیا، جس میں راقم الحروف بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس وقت تک ہانگ کانگ کی ایک کمپنی سے تھر کے کوئلے سے بجلی کی تیاری کا معاہدہ بھی ہو چکا تھا اور محترمہ نے بتایا تھا کہ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے تھر میں بڑے پیمانے پر سڑکیں تعمیر کی جائیں گی اور نہر نکالی جائے گی لیکن پھر ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور تھر کے کوئلے سے بجلی حاصل کرنے کا منصوبہ خواب ہی رہ گیا۔ ہاں تھر کول ڈیولپمنٹ اتھارٹی کا دفتر آج بھی کلفٹن کراچی میں موجود ہے جبکہ تھر بدستور پیاس اور افلاس کا صحرا بنا ہوا ہے۔

سعید خاور کے مطابق اس وقت پاکستان کے پاس دنیا کا گیارہواں اور بعض اطلاعات کی رو

سے کوئلے کا ساتواں بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن ہم بجلی کے سنگین بحران کے باوجود اس شعبے میں کوئی قابل ذکر پیش رفت نہیں کر سکے ہیں' ان کا کہنا " نہ جانے کیا مصلحتیں اور کیا غفلتیں ہیں کہ ہر دور میں اور ہر حکومت میں نئی شکلوں اور نئے روپ میں وعدے اور دعوے کئے جاتے ہیں لیکن کوئی وعدہ پورا نہیں ہوتا' کوئی دعویٰ حقیقت نہیں بنتا"۔

مصنف کے بقول تھر پار کے 2300 گاؤں اور اس کے 13 لاکھ باشندے محرومی' پیاس اور افلاس کی ایک ایسی تاریک رات میں زندگی گزار رہے ہیں جس کی کوئی سحر نہیں۔ بھوک اور پیاس کے ستائے ہوئے کم و بیش 40 فیصد تھری دانے پانی کی تلاش میں ہر سال بیراجی (نہری) علاقوں کی طرف عارضی ہجرت پر مجبور ہوتے ہیں اور ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر سال تھر پارکر میں سانپ کے ڈسنے کے کم و بیش تین ہزار واقعات ہوتے ہیں۔ یہاں کی تیس فیصد آبادی تپ دق کی مریض ہے اور اوسطاً ہر دوسرا تھری کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہے۔ مگر سرکاری ہسپتالوں کا یہ حال ہے کہ وہاں کوئی طبی عملہ کام کرنے کو تیار نہیں کہیں تھوڑی بہت سہولتیں ہیں بھی تو دوائیں ناپید ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں سعید خاور نے تھر کی ترقی کے لئے کئی اہم تجاویز پیش کی ہیں جن میں قدرتی وسائل سے استفادے کے علاوہ سیاحت کے فروغ اور اس مقصد کے لئے سیاحوں کے لئے مہمان خانے 'تھر میوزیم اور سفاری پارک وغیرہ کے قیام کے منصوبے شامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ صحرائے تھر پاکستان کے لئے قدرت کی طرف سے ایک عظیم عطیے سے کم نہیں۔ معقول منصوبہ بندی اور سرمایہ کاری سے اس علاقے کو ملک و قوم کے لئے زرمبادلہ کمانے کا ایک مستقل ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کے قارئین سے میری درخواست ہے کہ وہ تھر کے مطالعے سے پہلے سعید خاور کا مطالعہ ضرور کریں جس میں انہوں نے اپنی شخصیت کی اٹھان اور اپنی فکری نشو و نما کا تمام پس منظر بڑی بے باکی سے بیان کر دیا ہے۔ کتاب کی ابتدا میں ان کا بارہ صفحات پر مشتمل "پیش لفظ" ایک کھرے پاکستانی کا ایسا ذہن سامنے لاتا ہے جو پوری کتاب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے "پیاس اور افلاس کا صحرا" پڑھ کر رشک ہوا کہ یہ کتاب میں نے کیوں نہیں لکھی......!



خواجہ کا سچا عاشق

احفاظ الرحمٰن

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ایک ایسے دردمند آدمی کے احساسات کا عکس پیش کرتا ہے' جس کا وجود دُکھوں کی بھٹی میں سُلگ کر کُندن کے مانند دمک رہا ہے' جس نے بلند منصب پر فائز ہونے کے باوجود خاک نشینوں کے غموں کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ ہمارے خود غرض معاشرے میں بامِ بلند پر پہنچنے والے لوگ پستیوں کی ذلتوں کے احساس سے محروم ہو جاتے ہیں۔ آسودہ حالی کی چھاؤں پانے کے بعد ناداروں کے خوابوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سعید خاور کی اس کتاب کے ہر صفحے پر ان کے خواب پستیوں میں پلنے والے بے آسرا لوگوں کے خوابوں کی پیاس کا ذائقہ چکھتے ہیں' اُن کے آنسوؤں کی روح میں جھانکتے ہیں' اور پڑھنے والے کے سینے میں خراشیں کھینچتے چلے جاتے ہیں۔

ایسی سچی تصویر کشی کے لیے حساس دل کے ساتھ اظہار کی جان دار قوت بھی درکار ہوتی ہے۔ سعید خاور دونوں اعتبار سے ثروت مند ہیں۔ دُکھوں کی پرچھائیاں دیکھ کر ان کا دل موم کی طرح پگھلتا ہے' اور زبان و ادب کا گہرا مطالعہ ان کی تحریر میں سحر انگیز پیکر تراشتا جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں خوبیوں نے اس کتاب میں کشش کے امکانات کا افق وسیع کر دیا ہے۔ سعید خاور دھرتی پر چلتے نظر آتے ہیں' دھرتی کی خوشبو سے توانائی کشید کرتے ہیں اور بے نام و نشاں' بے کس کرداروں کو' ماضی کے بھولے بسرے قصوں کو' مُدام آگ میں جلنے والے مجبوروں کو' سندھ کی رنگا رنگ ثقافت کو' صحرائے تھر کے بے زبان ذرّوں کو جیتی جاگتی تصویروں کے مانند قاری کی چشمِ تصور پر محیط کر دیتے

ہیں۔ سعید خاور کے اسلوب بیان میں مہکتی میٹھی سرائیکی کی گنگناہٹ بھی ہے اور تھر کے سخت جان' سرکش کیکروں کے کانٹوں کی پیاس کا منظر بھی وہ بڑی دردمندی سے پینٹ کرتے ہیں۔

سعید خاور روہی کے عاشق ہیں۔ وہ خواجہ فرید کے عاشق ہیں' جن کی شاعری میں اُن کی دھرتی کے سارے روپ' الم وطرب کے سارے رنگ کچھ ایسے سحر انگیز انداز میں طلوع ہوتے ہیں کہ اس کی کیفیت دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی لیے سعید خاور کہتے ہیں:

''صحرا کی ریت میری روح میں رچی ہوئی ہے!''

چولستان اور تھر ایک دوسرے سے یوں چمٹے ہوئے ہیں' جیسے گوشت سے ناخن چمٹے ہوتے ہیں۔ خاور بار بار تھر کا سفر کرتے ہیں' ان کے بچے پوچھتے ہیں ''اُن ویرانوں میں کیا رکھا ہے؟'' وہ جواب دیتے ہیں'' ریت..... اُن ویرانوں کی ریت مجھے آواز دیتی ہے' اور میں اس کی طرف لپکا چلا جاتا ہوں۔''

چولستان اور تھر کے اسی ملاپ کے باعث سعید خاور کے اس ''سفرنامے (یا تاریخ نامے؟)'' میں سرائیکی ثقافت اور سندھی ثقافت کے تاریخی سلسلوں کی کڑیاں ایک دوسری سے لپٹتے ہوئے بار بار اپنی جھلکیاں دکھاتی ہیں۔ فلیش بیک میں ماضی کی تلخ وشیریں داستانیں سر اٹھاتی ہیں' پھر حال اپنا سینہ کھول کر نئی کہانیوں کے راز اگلنے لگتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کتاب میں واقعاتی تسلسل داستان در داستان مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ ایک قصے کے بطن سے دوسرا قصہ جنم لیتا ہے' یوں اس کی شاخیں ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ تاہم' بعض شاخوں کو تراش دیا جاتا تو شاید اس کا حسن دوآتشہ ہو جاتا۔

اس کتاب کے اس وصف کے طفیل تھر کی ثقافت اور چولستان کی ثقافت کے بارے میں' ان کے ماضی اور حال کے بارے میں' رنگ رنگ کی معلومات کے پُرکشش در کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے' یہ کوئی مبسوط تاریخی کتاب نہیں' ایک سفرنامہ ہے۔ اس میں سارے قصے تفصیل سے بیان نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اس کے باوجود نہ جاننے والوں کے لیے اس کے اوراق پر معلومات کا بیش قیمت خزانہ موجود ہے۔ ایک اچھے قصہ گو کی طرح خاور آپ کو اپنے ساتھ لگا رکھتے ہیں۔ کراچی سے تھرپارکر پہنچتے پہنچتے اپنی ساری یادیں کھرچ کھرچ کر سمیٹتے جاتے ہیں۔ سعید خاور دریائے سندھ کا نوحہ سنانے کے بعد تھر کی پیاس کا المیہ سناتے ہیں' تو صاحبِ دل قاری

تڑپ اٹھتا ہے۔

بہ ہر حال' کتاب کے عنوان یا موضوع سے قطع نظر' جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں' یہ ایک ''عشق بیتی'' ہے' انسان سے محبت کا افسانہ۔ اور سعید خاور نے انسان سے عشق کرنے کا جذبہ اپنے مُرشد' عظیم صوفی شاعر' خواجہ فرید کے بولوں سے کشید کیا ہے۔ شروع سے آخر تک' مرشد فرید سعید خاور کی سانسوں میں بسے ہوئے ہیں۔ خواجہ فرید اس کتاب کی ایک ایک سطر میں سانس لے رہے ہیں' جب ہی تو سعید خاور جگہ جگہ گھومتے گھامتے وقفے وقفے سے ہمیں خواجہ کے اشعار (ترجمے کے ساتھ) سُناتے جاتے ہیں۔ سچا عشق جس کے نصیب میں آ جائے' اُس سے بڑا دولت مند کون ہو سکتا ہے؟

بڑھتی عمر' تھکاوٹ کے آثار' سرہانے کتابوں کا ڈھیر.... اب ہر کتاب پڑھنے کا جی نہیں چاہتا۔ دو چار صفحوں پر نظر ڈالتے ہی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے' اس میں کچھ نیا نہیں ہے۔ سعید خاور کا بیانیہ پُر اثر محسوس ہوا۔ اس کتاب نے مجھے پکڑ لیا' اور میں صرف تین نشستوں میں اس کے آخری صفحے تک جا پہنچا۔

میں اس دردمند اور باصلاحیت آدمی کی مزید کامیابیوں کا منتظر رہوں گا.....



سعید خاور صحرائے تھر کا نوحہ گر

یوسف خان

سعید خاور کو دیکھ کر پہلی نظر میں یہ گمان ہوتا ہے کہ سڑک پر چلنے والے کسی عام آدمی سے ملاقات ہوگئی ہے جو محنت و مشقت سے ابھی فارغ ہوا ہے۔ چہرے پر خفیف سی مستقل مسکراہٹ' کھچڑی بالوں میں سفیدی کی چمک' پیشانی سے سخت محنت عیاں' یہ تاثر اس وقت تک رہتا ہے جب تک وہ گفتگو شروع نہیں کرتا۔ سعید خاور کے منہ سے الفاظ ادا ہوتے ہی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی مفکر' دانشور' ادیب سے بات ہو رہی ہے۔ ایک ایسا شخص جو حساس ہے سچا ہے۔ نہ اپنے احساسات دبانے پر یقین رکھتا ہے نہ اپنے جذبات کو پوشیدہ رکھنے پر' نہ اپنے بالوں کی جزوی سفیدی مکمل اور مصنوعی سیاہی میں چھپاتا ہے۔ سعید خاور کی جو بات مجھے ذاتی طور پر سب سے اچھی لگی وہ یہ ہے کہ اسے اپنے ماضی پر' اپنی غربت پر فخر ہے۔ وہ آج جہاں ہے' یہ اس کی محنت' والدین کی دعاؤں' بزرگوں کی شفقت کا نتیجہ ہے۔

محراب والا (ڈیرہ نواب) کے ایک متوسط طبقہ کا فرد کراچی کی سرگرم صحافت کا نواب ہے' ایک ایسا نواب جس میں کروفر نام کو نہیں جو کراچی میں صحافیوں کا افسوسناک طرہ امتیاز بن گیا ہے' جو جتنا جونیئر ہوگا اتنا ہی بد اخلاق ہوگا۔ سعید خاور میں انکساری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ وہ سر عام اعتراف کرتا ہے کہ "صحافت میں مجھ سے سنیئر اور قابل لوگ ہیں' میں نے ان سے سیکھا ہے' سیکھ رہا ہوں اور سیکھتا رہوں گا" یہ ہے اس کی عظمت جس کا میں دل سے معترف ہوں۔ سعید خاور نے ڈیرہ نواب صاحب ضلع بہاول پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں محراب والا سے ملک کے کمرشل کیپیٹل

کراچی کا رخ کیا تو اس کا ایک خواب تھا کہ کراچی میں صحافت جوائن کروں، صحافت کا اعلیٰ ترین مقام ایڈیٹری حاصل کروں۔ بیس سال کے عرصہ میں سعید خاور نے اپنا خواب پورا کر دکھایا۔ قسمت نے ساتھ دیا مگر محنت میں اس نے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ پھر جو ایک سال بھی سنئیر تھا اس کو استاد کے لقب سے نوازتا۔ سعید خاور میں اپنی صلاحیتوں کو چھپانے کی صلاحیت ہے، یہ شخص اتنا قابل نظر نہیں آتا جتنا وہ ہے۔ میری نظر میں وہ غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل عام آدمی ہے جس نے صحافت کی پہلی سیڑھی سے، حتمی سیڑھی تک قدم رکھا تو اپنے دوستوں بہی خواہوں کو ششدر کر دیا۔ مجال ہے کسی کے احترام میں کبھی کمی آنے دی ہو۔ شاید اس کی یہی خوبی اللہ کو پسند آئی ہے۔

سعید خاور نے تھر پر اپنی کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' مجھے دی تو میری ملی جلی کیفیت تھی۔ ایک طرف خوشی تھی کہ سندھ کے صحرا کا کسی کو خیال آیا۔ سیدھی بات تھی یہ دکھ بھی تھا کہ پنجاب کے صحرا چولستان سے آ کر سعید خاور نے سندھ کے صحرا کو اپنے قلم سے مسخر کر لیا۔ یہ اس کی زیادتی ہے، ناانصافی ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ کراچی کے ایک سیاستدان نے جسے پیر صاحب پگاڑو، پرویز مشرف کا ''گلاس فیلو'' کے ٹائٹل سے پکارتے تھے، تھر کو اس قدر ایکسپولائٹ کیا کہ ان کو ان کی سینیٹری کے دور میں سینیٹھر کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ سعید خاور نے تھر کے صحرا کو خود ایک پیاسے کی نظر سے دیکھا۔ تھر کی پیاس نے اس کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ایک مستند صحرا نورد سعید خاور کی بہترین کاوش ہے جس نے بے شمار جغادریوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، ایک دستاویز مرتب کر دی ہے جو ہر دور میں رہنمائی کرتی رہے گی۔ یہ سعید خاور کی عظمت ہے کہ وہ تسلیم کرتا ہے کہ میں خالی ہاتھ کراچی آیا تھا اب بھی خالی ہاتھ ہوں، ایسی انکساری کم لوگوں میں ہوگی۔ کراچی جیسے شہر میں جہاں اس وقت صرف افراتفری کا راج ہے، دو دہائیاں گزارنے والے نے خود کو تبدیل نہیں کیا۔ اس کے حالات ضرور بدل گئے مگر سعید خاور وہی ہے جو محراب والا سے چلا تھا، اس کے ہاتھ ہوسکتا ہے بدستور خالی ہوں مگر وہ دوستوں کے دلوں میں دن رات دھڑکتا ہے۔ کراچی میں جہاں دوستی کے رشتے کانچ کی طرح ناپائیدار ہوتے ہیں اس نے دوستوں کے دل جیتے ہیں، ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔ بہاول پور کے ایک پسماندہ گاؤں محراب والا کے سعید خاور کا ڈیرہ دوستوں کے دلوں میں ہے، اس لحاظ سے اسے نرم الفاظ میں دوستوں کی ''لینڈ مافیا'' ہی کہا جاسکتا ہے جو اہل کراچی کے دلوں پر ایسا

قابض ہوا ہے کہ قبضہ ختم کرنے کو تیار نہیں۔ مگر اس ''قبضہ'' کے اہل کراچی خلاف نہیں' ان کو اس ''قبضہ'' سے پیار ہے' یہی سعید خاور کی فتح ہے' وہ دلوں کا فاتح ہے۔ سعید خاور 304 رصفحات کی اپنی کتاب میں آپ کو ہر لفظ میں ہر سطر میں ہر پیرا گراف میں ملے گا۔ نہ اس کی کتاب پڑھنا مشکل ہے' نہ اسے پڑھنا مشکل ہے۔ خوابوں کا مسافر جو منزل پر پہنچ کر منزل کی تلاش میں ہے' ایسے جنونی صحافت اور ادب میں بہت ہی کم ہیں۔

سعید خاور کی یہ ہمت ہے کہ ایک ایسے موضوع کو چھیڑا جس میں چارم کم ہے۔ تھر پارکر میں تو خود تھر پارکر کے منتخب نمائندوں کی دلچسپی نہیں ہے' باہر کے لوگ کیا فکر مند ہوں گے۔ مگر سعید خاور کے جنون کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ پاکستان کو ایسے جنونیوں کی ضرورت ہے جو تھر پارکر کو قومی افق پر' عالمی منظر پر اجاگر کریں۔ اس لحاظ سے وہ کریڈٹ کا مستحق ہے۔ جس کا اعتراف مجھ جیسا کم علم اور تھر پارکر کے معاملہ میں جاہل ہی نہیں کر رہا' ایسے اکابرین بھی کر رہے ہیں جو صحرائے تھر' اس کی زندگی اور اس کی ثقافت پر اتھارٹی تصور کئے جاتے ہیں۔ یہ اس معاشرہ کی بدقسمتی ہے کہ جو جنونی اپنے جنون کا مظاہرہ کرنے نکلتا ہے اس کی تعریف کم ہوتی ہے۔ کوئی اس میں کاروباری مفاد تلاش کرتا ہے' کوئی اس میں سیاسی فائدے کی جستجو میں رہتا ہے۔ سعید خاور کو ان عوامل سے معاف کیا جا سکتا ہے۔ وہ صرف اور صرف تھر پارکر کی بھوک' پیاس اور افلاس کو اجاگر کرنا چاہتا ہے' جس میں اس کی صحافت اور ادب نوازی سے زیادہ انسانیت دوستی اور انسانیت نوازی کا دخل ہے۔

میں نے سعید خاور کو اس کی انسانی خوبیوں کی بنا پر ہمیشہ بڑا انسان پایا ہے۔ ایک ایسا انسان جو غریبوں کے دکھ پر تڑپ اٹھتا ہے' جو بھوک اور افلاس کو دیکھ کر اپنا دل مسوس کر کے رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کئی بڑے بڑے نامور اور حساس سمجھے جانے والے لوگوں کی تھر پارکر سے دلچسپی زیادہ تر لمحاتی ہوتی ہے یا وقتی یا سیاسی یا انتخابی' سعید خاور کو اس کیٹگری میں کبھی نہیں رکھ سکتے۔ اس کا کوئی مفاد نہیں ہے اور اسے تھر پارکر کا کراچی سے نمائندہ منتخب ہونا ہے نہ ہی تھر پر انٹرنیشنل کانفرنسوں میں شرکت کیلئے نیویارک' لندن اور پیرس جانا ہے۔ اس کا واحد مقصد تھر پارکر کے مصائب کو اجاگر کرنا ہے' لوگوں کو جھنجھوڑنا ہے۔ میری رائے میں سعید خاور نے اپنی کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ اس کی کاوش کوئی سیاسی اسکینڈل ہے نہ مالیاتی فراڈ کی داستان' یہ تو تھر پارکر کے تنگ اور خاک آلود گلی کوچوں کی کہانی ہے' اس صحرا کی اسٹوری

ہے جہاں کبھی کبھی سبزہ نظر آتا ہے، کبھی کبھی پھول کھلتے ہیں۔

سعید خاور کی کتاب صحرائے تھر کیلئے بارش کا پہلا جینوئن قطرہ ہے جس میں اس کا کوئی مفاد نہیں ہے۔ اس قطرہ کی سچائی ہے' ٹرانسپیرنسی ہے۔ جنوبی پنجاب کے گرد آلود صحرا سے ساحلی شہر کراچی کو اپنا مسکن بنانے والا سعید خاور ملک کے کمرشل کیپٹل دنیا کے ساتویں بڑے شہر کی دھما چوکڑی، شوروغوغا، ہلچل، گڑبڑ اور ہنگامہ آرائی میں کھویا نہیں ہے 'اس نے اپنا وجود برقرار رکھا ہے' اپنے نظریہ کو قائم رکھا ہے۔ صحافی کی حیثیت سے وہ ایک جمہوریت پسند ' آزادی پسند صحافی ہے۔ ادیب کے طور پر نہایت حساس ادیب ہے اور اس کی تحریروں میں اس کی شخصیت کے یہ عناصر نمایاں ہیں۔ سعید خاور ایک ٹرانسپیرنٹ انسان ہے' وہ اختلاف رائے کو ناپسند نہیں کرتا اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ دنیا میں نہ سارے درخت ایک جیسے ہیں نہ پتے نہ پھول نہ کانٹے۔ پھر انسان کیسے ایک ہو سکتے ہیں یہی سوچ اگر پاکستان کے حکمران' سیاستدان' جرنلز' جرنلسٹس اور ججز اپنالیں تو کوئی مسئلہ حل سے محروم نہ رہے گا' کوئی پیاسا پیاسا اور کوئی بھوکا بھوکا نہ رہے گا۔ میری آرزو ہے کہ آنے والے دنوں میں صحرائے تھر میں خوشحالی کا ایسا دور آئے کہ پھر کبھی کسی سعید خاور کو صحرائے تھر کا نوحہ نہ لکھنا پڑے۔



تھر کی کہانی

ڈاکٹر توصیف احمد خان

سعید خاور صحافت کا ایک نامور ستارہ ہیں۔ یوں ملک کے ایک معروف اخبار میں راتیں کالی کرنے کے باوجود مطالعے کی عادت کو برقرار رکھا اور کئی کتابیں تحریر کیں۔ ان کی ایک شہرت یافتہ کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' جو عظیم صحرائے تھر کی زندگی کی تہذیب اور تاریخ پر دستاویز ہے۔ سعید خاور کی یہ کتاب 300 سے زائد صفحات پر محیط ہے۔ دریائے سندھ کی صورتحال اور کالا باغ ڈیم کے ممکنہ اثرات جیسے اہم موضوعات پر پر مغز معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں شہروں کی تاریخ اور تھر کے کلچر پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ سندھ کے اہم تاریخی واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ کتاب دلچسپ واقعات سے بھی پر ہے۔ '' پیاس اور افلاس کا صحرا'' میں نذیر لغاری نے تحریر کیا ہے کہ نوکوٹ سے دائیں جانب ایک خاتون پیر کی خانقاہ ہے' اس درسگاہ میں سجادہ نشین ہمیشہ خاتون ہوتی ہے' انہوں نے تحریر کیا ہے کہ اس خاتون کو بچپن میں ہی سجادگی کے لیے نامزد کر دیا جاتا ہے اور وہ خاتون اپنی نامزدگی کے بعد ہر محرم کے لیے غیر محرم ہو جاتی ہے' سجادہ نشین خاتون کی جانشیں بھی خاتون ہوتی ہے' اس طرح وہ دونوں تنہا زندگی بسر کرتی ہیں۔ عورت پر ظلم اور اس کو زندگی کی آسائشوں سے محروم کرنے کی اس داستان کو اس کتاب میں یوں تو ایک پیراگراف میں بیان کیا گیا ہے مگر یہ پیراگراف سندھ کی ایک مظلوم عورت کی کہانی کی مکمل عکاسی کر رہا ہے۔

سعید خاور نے اپنی کتاب کے دوسرے باب میں لکھا ہے کہ انہیں دریائے سندھ کے

کنارے جی ایم سید کے گاؤں ''سن'' میں سندھ نیشنل الائنس کے تاسیسی اجلاس میں مبصر کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا۔ اس اجلاس میں انہیں سازش کی بو محسوس ہوئی۔ پھر سندھ کے تیسرے وزیراعظم کو برطرفی کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر کچھ عرصے بعد بے نظیر بھٹو کی برطرفی سے یہ تعداد 4 ہوگئی۔ اس کتاب میں تحریر ہے کہ ماہرین کہتے ہیں کہ ساحلی زرعی زمینوں کو سمندری نمکیات سے بچانے کے لیے 35/ ہزار کیوسک پانی زیریں دھارے کے لیے ناگزیر ہے مگر دریائے سندھ ایک نالا سا بن رہا ہے' یہی وجہ ہے کہ سندھ کے ساحلی علاقوں میں پیداواری صلاحیت کم سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ سعید خاور نے دریائے سندھ کا نوحہ لکھ کر پانی کی کمی کے نقصانات اور کالا باغ ڈیم کی مخالفت کے محرکات کو اس طرح پیش کر دیا کہ حقائق سے منہ موڑنے والوں کو کوئی راستہ نہ ملے۔ سعید خاور نے پروفیسر جاوید چانڈیو کی تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تقسیم ہند سے قبل جب سندھ بمبئی کا حصہ تھا تو اگست 1919ء میں حکومت بمبئی نے حکومت ہند کو آگاہ کیا کہ دریائے سندھ سے پانی کے حصول کے لیے حکومت پنجاب کے ارادے نیک نظر نہیں آ رہے ہیں اور اگر حکومت پنجاب کے ذہن میں کوئی منصوبہ ہے تو اس سے حکومت بمبئی کو آگاہ کیا جائے' یوں تاریخ نے یہ خدشات درست ثابت کیے۔ پاکستان بننے کے بعد پانی کا مسئلہ ایک سیاسی مسئلہ بن گیا۔

انہوں نے حیدرآباد کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سر چارلس نیپیئر کے 1843ء میں سندھ پر مکمل قبضے کے بعد انگریزوں نے ابتدائی کچھ برسوں میں تو حیدرآباد کی سماجی ترقی پر خاص توجہ دی اور یہاں اسکول' شفا خانے' مسافر خانے اور کئی اہم تعمیرات کو وجود دیا۔ حیدرآباد میں بلدیاتی اور ریلوے کا نظام قائم ہوا۔ عدالتی اور پولیس کا نظام بنایا گیا' پھر انگریزوں کی توجہ کراچی کی طرف ہوگئی۔ اس معرکے میں سندھ کے عظیم حریت پسند ہوشو شیدی نے غیر ملکی طالع آزماؤں کے خلاف داد شجاعت دیتے ہوئے جام شہادت نوش کر کے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کتاب میں شیر محمد تالپور اور سردار نواب احمد خان لغاری کی انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے ان کے انگریزوں سے سمجھوتے کا ذکر ہے۔ سعید خاور نے سندھی ادب کے ممتاز کردار وتایو

فقیر کا ذکر بھی یوں کیا ہے' وہ کہتے ہیں کہ وتایو فقیر کون تھے' کہاں پیدا ہوئے اور کب پیدا ہوئے' تاریخ اس بارے میں خاموش ہے۔ سعید خاور نے سید احمد بریلوی اور شاہ محمد اسماعیل کی سکھوں کے خلاف مہم جوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ دو رہنما اپنی مہم کی مدد کے لیے سندھ آ گئے۔ ان کا کہنا ہے کہ سید برادران انگریزوں کی ترغیب میں آ گئے۔ وہ یہ دونوں مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف لڑائی پر اکساتے پھر رہے تھے۔ مگر سندھ کے لوگ ان کی مدد کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ پھر نادر شاہ اور راور مدد خان پٹھان کا ذکر ہے۔ ان لوگوں نے یکے بعد دیگرے عمر کوٹ کے قلعہ پر دھاوا بول دیا۔ ان دونوں نے ہر طرف تباہی پھیلا کر رکھ دی۔ پھر 1783ء کی کہانی ہے۔ سندھ پر قبضے کے خواہش مند دو مقامی خاندان عباسی کلہوڑے اور میر تالپور تلواریں سونتے آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ہالانی کے مقام پر خونریزی کے بعد میر تالپوروں نے کلہوڑوں کو ہزیمت سے دوچار کر کے سندھ کے اقتدار پر ایک بار پھر قبضہ جما لیا ہے۔ میروں کے دور میں سندھ کو تین حصوں میں تقسیم کر کے اقتدار اعلیٰ کو اپنے خاندان میں تقسیم کرنے کا ذکر ہے۔ اس تقسیم کے بعد سندھ میں تعمیر و ترقی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔

سعید خاور ''وڈیروں کی نجی جیلیں'' کے عنوان پر مبنی باب میں لکھتے ہیں کہ سندھ میں پہلی نجی جیل کا انکشاف نواز شریف کے دوسرے دور 1992ء میں ہوا جب ٹنڈو اللہ یار کے علاقے شیخ بھرکیو کے معروف زمیندار غلام حسین کھوکھر کے قلعہ نما کوٹ میں نجی جیل دریافت ہوئی۔ سندھ کے ایک زمیندار کی جاگیر پر نجی جیل سے ہاریوں کی بازیابی کے بعد نجی جیلوں کے انکشافات کا تانتا بندھ گیا۔ پاکستان کی انسانی حقوق کے معاملے پر دنیا بھر میں کافی رسوائی ہوئی مگر فائدہ یہ ہوا کہ وڈیرے محتاط ہو گئے اور ہاریوں کے حوالے سے اپنی روایتی پالیسیاں بدلنے لگے۔ مگر وہ اس ضمن میں غیر سرکاری تنظیموں کے کردار پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ بعض افراد اور تنظیموں نے اپنے مفادات کے لیے اس معاملے کو استعمال کیا۔

کتاب کے باب ''تھر کی زندگی اور تاریخ مختصر مطالعہ'' میں تھر پارکر کا جغرافیائی محل وقوع

بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے تھر میں آباد ہندوؤں اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کا خوب ذکر کیا ہے۔ دونوں مذاہب کے ماننے والے ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا دل سے احترام کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ تھری عورتیں محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں، مسلمان آبادیوں میں ملاں بانگ (مولوی کی فجر کی اذان) اور غیر مسلم گوٹھوں میں ککڑ بانگ (مرغ سحر کی اذان) پر بیدار ہوتی ہیں۔ سارا دن محنت مشقت کرتی ہیں، غربت اور ناداری کے باوجود اپنے مردوں کو ٹوٹ کر چاہتی ہیں۔ تھر کی عورت مر جائے گی مگر جب تک اس کا مرد کھانا نہیں کھائے گا وہ اپنے لیے ایک نوالہ بھی حرام سمجھتی ہے۔ تھری عورتیں اپنے مردوں سے آنکھیں چار نہیں کرتیں نہ ان کے سامنے کھانا کھاتی ہیں۔ تھر میں تمام فیصلے مرد کرتا ہے، وہاں طلاق کا رواج صرف مسلمانوں میں ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے بعض مقامات پر سعید خاور کی تحریر میں جانبداری جھلکنے لگتی ہے جو ان جیسے دانشور کے شایانِ شان نہیں ہے۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ایسے کئی وڈیرے ہیں جو ایک قطعہ اراضی حکومت کو اسکول کے لیے دان کرتے ہیں۔ حکومت لاکھوں روپے خرچ کر کے اسکول کی پختہ عمارت تعمیر کراتی ہے۔ آغاز میں اسکول بھی کھلتا ہے، پھر وہ عمارت دیکھتے ہی دیکھتے وڈیرے کی اوطاق بن جاتی ہے۔

مصنف نے تھر میں پائی جانے والی معدنیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور تھر کی غربت اور قحط کے اسباب پر بھی خوب روشنی ڈالی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں کہ بھارت کے نوبل انعام یافتہ ماہر اقتصادیات پروفیسر امریتا سین کا کہنا ہے کہ قحط کا باعث قدرتی عوامل نہیں بلکہ انسان ہیں۔ اس طرح 1971ء کی جنگ کے اثرات بھی مصنف نے یوں بیان کیے ہیں۔ بھارتی ریاست گجرات سے متصل تھرپارکر کے علاقے چھور میں ایک گاؤں وطے ہے جس کا آدھا حصہ بھارت اور آدھا پاکستان میں ہے۔ 1971ء کی جنگ سے پہلے یہاں ایک ایسا کنواں تھا کہ جب بیل پانی نکالنے کے لیے اس کے گرد گھومتا تھا تو بیل کا آدھا چکر بھارت اور آدھا پاکستان میں پڑتا تھا۔ جنگ کے بعد یہ گاؤں نوزون میں آ گیا۔ اس گاؤں کے آدھے لوگ بھارت اور آدھے پاکستان میں رہ گئے اور کنویں کا پانی خشک ہو گیا۔ چند میٹر جانے کے لیے اسلام آباد اور دہلی سے ویزا لازمی

ہو گیا' یوں سارے رشتے منجمد ہو گئے۔ سعید خاور کی اس کتاب میں تھر کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ سعید خاور اپنی مادری زبان سرائیکی کے علاوہ سندھی پر بھی عبور رکھتے ہیں اور اردو زبان پر تو مہارت بے مثال ہے۔ سعید خواجہ غلام فرید اور شاہ لطیف کی شاعری کے عاشق ہیں' ان کا یہ پس منظر کتاب میں بھی جھلکتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب معلومات سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت تحریر کا مرقع بھی ہے' جن لوگوں کو سندھ سے دلچسپی ہے انہیں ضرور اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔



''پیاس اور افلاس کا صحرا''

ہشت پہلو تحریر

سید ادیب حسین

(مصنف' کراچی اور اس کی بندرگاہ)

قلمی دنیا کی نیرنگیاں دیکھتے ہوئے چالیس سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا اس دوران کیسے کیسے انشاء پردازوں کو ادب کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے بھی دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ایک غریب قلمکار جس کے پاس پیسہ نہ تھا اس کے مسودے کو ایک سرمایہ دار نے دو ہزار روپوں میں خرید کرلیا' اپنے نام سے چھپوالیا۔۔۔۔اس کتاب کو بے انتہا پذیرائی ملی اور سرمایہ دار کو اتنی اچھی کتاب لکھنے پر ایک اچھا ادیب بھی تسلیم کرتے ہوئے ''آدمجی ایوارڈ'' کی ۲۵ ہزار کی رقم سے بھی نوازا گیا' اس کے بعد اسی کتاب کے متعدد ایڈیشنوں سے بھی اسے خوب آمدنی ہوئی جبکہ وہ شخص جس نے ایک بڑی جدو جہد کے بعد ہمارے پیغمبر ﷺ پر اتنا اچھا مواد' اکٹھا کیا تھا اس کے گھر کا چولہا دو ہزار روپوں سے کتنے دن تک جلتا رہا ہوگا یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ساحر لدھیانوی کا یہ شعر گونجنے لگا:

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

ایسے منافقت سے بھرے دور ہی میں میرے سامنے سعید خاور کی کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' آگئی۔ میں اسے جوں جوں پڑھتا جاتا تھا مجھے ایک نئی ہی دنیا نظر آتی گئی' کتاب کا نام

پڑھ کر میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ یہ ایک نیم تاریخی مسودہ ہوگا' معلوم ہوا جس مقام کے بارے میں سعید خاور صاحب اظہارِ خیال کر رہے ہیں اس کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ آپ اس بظاہر بنجر ریت اور ٹیلوں سے بھرے ہوئے ایک نہ ختم ہونے والے صحرائی سلسلہ کا' موازنہ دنیا کے کسی بھی زندگی سے بھرپور حصے سے کر سکتے ہیں۔

دراصل جب ایک حساس دل ادیب کچھ تخلیقی کام کرنا چاہتا ہے تو وہ اس کردار کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوا کہ جب ایک جذباتی شخص کا تھرپارکر کے صحرائی مقام سے گزر ہوا تو اس کی رگِ لطافت جاگ اٹھی اور اس نے چولستان ہی کو اپنی محبوبہ بنالیا اس نے اپنے آپ کو شہر کے ہنگاموں سے جدا کرتے ہوئے خود کو ریگزار وادیوں کے لئے وقف کر دیا۔ یہ اپنے محبوب کے ایک ایک روپ کو ہر زاویے سے دیکھنا چاہتا تھا' تمام موسموں میں اس کی تبدیل ہوتی ہوئی رنگینیوں میں کھو جانا چاہتا تھا۔ یہ ایک جذباتی قلمکار ''روہی'' کے حسین وجود کو نچوڑ کر اس میں اپنے ذہن کو ڈبونے کے لئے بے چین تھا۔ دن مہینے اور سال بیت رہے تھے لیکن اس کی پیاس بجھنے ہی کو نہ آتی تھی اور جب بھی اسے فرصت ملتی وہ حضرت شاہ لطیف یا حضرت خواجہ فرید کے کلام کا مطالعہ بھی کرتا رہتا۔ مطالعے کے دوران بھی اس کا ذہن ''چولستان'' کی فضاؤں ہی میں بھٹکتا رہتا' کوشش کے باوجود بھی وہاں کے تصورات کو اپنے ذہن سے جھٹک نہیں پاتا اور پھر ان پر یہ عجیب اور حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ حضرت شاہ لطیف اور حضرت خواجہ فرید جیسی بزرگ ہستیاں بھی اسی ماحول کی اسیر رہ چکی ہیں اور انہوں نے اپنی شاعری میں یہاں کے مختلف مقامات کے مناظر کو ایسی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ جیسے ریگستان پر منڈلانے والے بادلوں کے ٹکڑے پیاسی زمین کو سیراب کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔ تھرپارکر کے ماحول کی منظر کشی کرتے ہوئے سعید خاور نے جس طرح قدیم دور کے ان عظیم صوفی بزرگوں کے کلام کو پیش کیا ہے یہ بھی انہی کا حصہ ہے۔ اسے پڑھنے والا اس لئے حیرت میں ڈوب جاتا ہے۔

اور پھر گردش حالات نے سعید خاور کو دوبارہ شہر کے ہنگاموں میں دھکیل دیا لیکن یہ

''صحرائے تھر'' کے بدلتے ہوئے موسموں کے نظاروں کو فراموش نہ کر پائے اور ذہن کو ماؤف کر دینے والے شہری لمحات بھی انہیں ان یادوں سے چھٹکارا نہ دلا سکے اور صحرائے تھر کی زندگی نے ان پر جو گہرے نقوش چھوڑے تھے ان ہی کے سبب انہوں نے اپنے قلم کے لئے ایک نئی سمت کا تعین کیا اور تھر پارکر ہی کو اپنا محور بناتے ہوئے یہاں کے بیتے دنوں کو کاغذ پر منتقل کر دیا۔ انہوں نے جس طرح ''روہی'' کے بے آب و گیاہ خطے میں سادہ لوح افراد پر' زمینی خداؤں کے مظالم دیکھے اس سے وہ خود ہی پریشان نہیں ہوتے بلکہ اپنے قاری کو بھی مضطرب کر دیتے ہیں' اس کے ساتھ ہی ان کی تحریر حکمرانوں سے بھی فریاد کرتی نظر آتی ہے۔ ان کے اسی جنون نے چولستان کی جزویات تک کو ایک کتابی شکل میں اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ ایک مکمل دستاویز کی شکل اختیار کر گئی۔ مصنف نے اس علاقے کے معاشرتی پہلوؤں کو شامل کرتے ہوئے تاریخی پس منظر کو بھی نظر انداز نہیں کیا' اس کے علاوہ' اس خطے کے تمدنی عروج و زوال کے مناظر کو پیش کرتے ہوئے اور لوک داستانوں کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ یہ ادب کا ایک شاہکار نظر آنے لگا اور اسے پڑھنے والا خود کو بھی اسی زمانے میں محسوس کرنے لگتا ہے جبکہ اس کے اکثر کردار رومانوی نظر آنے لگتے ہیں۔

سعید خاور نے ایک مدت تک سندھ کے سنگلاخ اور ریگستانی علاقوں کی خاک چھاننے کے بعد وہاں سے ہیرے اور موتی ہی تلاش نہیں کئے بلکہ معاشرے کو اس کی بے حسی' انسانیت پر ہونے والے مظالم' جابروں کا جبر اور یہ سب کچھ کرنے والوں کے چہرے بھی بے نقاب کئے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی ناہمواریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انکا ممکنہ حل بھی پیش کرنا چاہا ہے جس کی بدولت یہ کتاب ایک ایسی خصوصیت اختیار کر گئی کہ اس کے مطالعہ سے آپ کو چولستان پر کی گئی ایک سچی تحقیقاتی تحریر حاصل ہو جائے گی جس کی روشنی میں آج ہی کے نہیں آنے والے ادوار میں بھی ''تھر'' اور اس پورے خطے کی فلاح کے لئے جب بھی کوئی قدم اٹھانا چاہے گا تو یہ کتاب اس کی بھرپور رہبری کر سکے گی۔ ان تمام خصوصیات کے ساتھ ہی سعید خاور صاحب' قاری کو اپنے قلم کے ساتھ رکھنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان ہی تمام اوصاف کی وجہ سے یہ کتاب ''ہشت پہلو تحریر'' کا روپ دھارتی نظر آتی ہے اور یہی اسلوب سعید خاور کو دیگر مصنفین سے منفرد مقام دلواتا نظر آتا ہے۔

مجھ پر بھی ایک زمانے میں کچھ تحقیقی کام کرنے کا دورہ پڑا تھا اور اس جنون میں بارہ سال تک مبتلا رہتے ہوئے کچھ کام کیا تھا' وہ اپنی جگہ لیکن سعید خاور کی کتاب (پیاس اور افلاس کا صحرا)

پڑھنے کے بعداندازہ ہوا کہ میری عرق ریزی توان کے کام کے آگے کچھ بھی نہیں اس لئے کہ ''صبح وشام تپتے ہوئے صحرائی ماحول میں تحقیقات کرنے اور پرُسکون ماحول میں کتابیں کھنگالنے'' کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال سعید خاور کا مشن تکمیل کو پہنچا۔ میری دلی تمنا ہے کہ اس پرآشوب دور میں لوگ کچھ وقت نکال کر اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں تا کہ انہیں بھی وہ تمام محرکات نظر آجائیں جنہوں نے ہماری روایات، تہذیب وتمدن کو مکمل طور سے مسخ کر ڈالا ہے اور حیرت انگیز طور سے یہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہیں یا خود ہم ان سے آنکھیں ملانا نہیں چاہتے۔ جبکہ مجھے یقین ہے کہ ایک حساس دل انسان، قدرت کی اتنی حسین کاریگری کے باوجود معاشرے کی بے حسی پر ماتم کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد میں یقین سے کہ سکتا ہوں کہ سعید خاور اپنے ہم عصروں سے قطعی مختلف ہونے کے ناطے سراہے جانے کے مستحق ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی بھرپور پذیرائی بھی کی جانی چاہئے:

اللہ کرے زورِقلم اورزیادہ۔



روہ، جبل کا روحانی سفر

علامہ محمد اعظم سعیدی

تاریخ بتاتی ہے کہ سرسوتی (ہاکڑا) اور تھر (پُران) ایک ہی دریا کے دو نام ہیں، جیسے تھر اور روہی ایک ہی صحرا کے دو نام ہیں۔ سرسوتی نے اپنے مقدس پانی میں، جابروں اور حملہ آوروں کی خون آشامیوں سے شرمندہ ہوکر ایسے منہ چھپایا کہ پھر کبھی چہرے سے نقاب اتاری ہی نہیں، یہ دریا خشک نہیں بلکہ چھپ گیا تھا، اسی لئے اسے (Un Seen River) کہتے ہیں، جہاں موجیں مستی میں اٹھکھیلیاں کرتی تھیں، آج وہاں وہی کھیل سوکھی ریت کھیل رہی ہے۔ ممکن ہے ہاکڑا کی آتما پُرسکون ہو، لیکن اس کے Delta کی ریت اور ریگستان کے باسیوں کی آتما صدیوں بعد بھی لذتِ سکون سے محروم ہے۔ ریت بھی خانہ بدوش اور ریتیلے صحرا کے باسی روہیلے بھی خانہ بدوش، کہ کہیں ہاکڑا کا رخ زیبا نظر آجائے۔ اسی خانہ بدوش صحرا کی وسعتوں میں ایک صحرائی سعید خاور، ہیر کی مانند جھنگ بار کی مسافرت میں کہیں خیالوں میں گم نظر آتا ہے تو کہیں مشاہدہ میں محو نظر آتا ہے، کہیں تاریخ کو کریدتا ہے تو کہیں نقش حال کے اسکیچ بناتا چلا جاتا ہے۔

روہی اور تھر ایک ہی مسمّی کے دو نام ہیں یا دونوں ایک دوسرے کے ہمزاد و عکس ہیں، یعنی ایک کے وجود میں دوسرا موجود (حق موجود) بھٹ، ٹیلے، دڑے، ڈہر، سراب، ایک جیسے اعضا و جوارح، بس روہی تھر اور تھر روہی...... روہی سعید خاور کی جنم بھومی ہے، جس کی گود میں پلے، بڑھے کھیلے کودے ہیں، جس کی ریت کو آنکھوں میں بسایا ہے، جس کے سینے پر لیٹ کر ٹھنڈی چاندنی میں اختر شماری کی ہے اور آسمان پر قندیلوں کا حسین منظر دیکھا ہے، پھر بدلے میں روہی نے بھی انہیں

ماں کا پیار اور تحفظ دیا ہے۔ جبھی تو وہ ماں کی گود کے بعد روہی کو ہی اپنی دوسری پناہ گاہ قرار دیتے ہیں۔ سعید خاور اسی صحرا کا باسی ہے۔ تب ہی اپنے من مندر میں صحرا جیسی وسعت رکھتا ہے۔ روہ و جبل کے سفر کو اپنا من پسند اور روحانی سفر گردانتا ہے۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کلک قلم سے نہیں بلکہ انگلیوں کو قلم کر کے براہ راست کمپوز کی گئی عظیم صحرائے تھر کی زندگی' تہذیب اور تاریخ کی دستاویز ہے۔ بظاہر تو یہ سعید خاور کا سفرنامہ ہے' مگر دیگر سفرناموں کی پیروی میں محض عہد حاضر کی نقاب کشائی کے بجائے صحرائے تھر کی دھندلی تاریخ اور تہہ در تہہ پوشیدہ ماضی کو بھی اوراق کے کینوس پر اس طرح نقش کیا ہے کہ تھر کا ماضی اور حال پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ سعید خاور نے عشق کا یہ سفر' سلطان العاشقین پیر خواجہ غلام فرید کی معیت میں کیا ہے۔

کراچی سے پُران (صحرا کا گمشدہ دریا) تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے سعید خاور کی روح کے کتنے زخم ہرے ہوئے ہوں گے' دل میں درد کی کتنی ٹیسیں اٹھی ہوں گی' سات پانیوں (سپت سندھو) کا باسی جب برہنہ دامن دریائے مہران سے گزرتا ہے تو اسے حالت سکرات میں دیکھ کر اپنی جنم بھومی کے تین دریا یاد آ جاتے ہیں۔ ہاکڑا (سرسوتی) جو Un Seen ہو گیا' بیاس اور ستلج جو فروخت کر دیئے گئے۔ کسی دانشور کا قول ہے ''پانی کی مثال ماں کی چھاتی سے نکلنے والے دودھ جیسی ہے' پانی بیچنے والے بالآخر پانی کی بوند بوند کو ترستے ہیں۔'' سعید خاور مہران دریا کے دامن پر مہرانی خشک ریت کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ہاکڑا چولستان سے کیا روٹھا کہ روہی سے زندگی روٹھ گئی۔ کیا مہران بھی سندھ واسیوں سے روٹھ جائے گا' اگر ایک تاریخ' ایک تہذیب اور ہزارہا داستانوں کا امین ''مہران'' روٹھ گیا تو صرف یہ دھرتی ہی تھل بیابان نہ ہو گی بلکہ تاریخ و تہذیب کا سرچشمہ Un Seen ہو جائے گا۔

تھر میں یعنی پُران دریا کے کناروں پر جہاں سکندر اعظم' محمود غزنوی' علاالدین خلجی' داراشکوہ وغیرہ کی سپاہ کے گھوڑوں کے سموں کے نشان موجود ہیں' اسی تھر پر مختلف ادوار میں مختلف قبائل و اقوام مثلاً راؤ' برہمن' سوڈھے' رانے' راجپوت' راٹھوڑ' سمہ' سومرو' ارغون' ترخان' مغل' کلھوڑا' تالپور اور فرنگی نے اپنی اپنی حکمرانی کے پھریرے لہرائے ہیں اور اب غلامان فرنگ تھر سے وہی سلوک کر رہے ہیں' تھر کو لوٹا سب نے ہے مگر تھریوں کو کسی نے کیا دیا ہے۔ یہی داستان سعید

خاور نے بیان کی ہے۔ تھر اس وقت بلا شبہ پانی جیسی نعمت سے محروم ہے لیکن متعدد انواع معدنیات سے مالا مال ہے' اگر تھر کی اپنی ہی معدنی دولت نکال کر اسے دی جاتی تو تھریوں کی افلاس کا مداوا ہوسکتا تھا۔ بھوک سے مرجھائے چہروں پر رنگت آ جاتی' وقت تو اب بھی ہاتھ سے نہیں گیا مگر بقول سعید خاور، قرض پر چلنے والی سرکار بیچارے تھریوں کی کیا مدد کرسکتی ہے' تھری تو اپنی نیم وا آنکھوں سے این جی اوز کو دیکھ رہے ہیں' لیکن سعید خاور ان کی کارکردگی سے غیر مطمئن ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں ''قدرت اور حکومت نے پیاس اور افلاس کے اس صحرا سے منہ موڑ لیا ہے' کچھ این جی اوز اور سیاسی وسماجی ادارے انفرادی طور پر تھر میں زندگی کو بچانے کیلئے کوشش بروئے کار لا رہے ہیں' لیکن ان میں سے کئی ایک کا کردار سوالیہ نشان ہے۔''

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' اگرچہ صحرائے تھر کی تاریخ' تہذیب' علم الاسما' پھر تھر کے نشیب وفراز کی کہانی ہے' لیکن مجھے اس آئینے میں روہی کا مکمل عکس نظر آ رہا ہے' اس کی گواہی یہ ہے کہ خواجہ فریدؒ سعید خاور کے ساتھ ساتھ ہیں۔ میرے مرشد نے لکھا ہے ''سعید خاور تم پر اور مجھ پر بڑے قرض ہیں'' لیکن سعید خاور نے کئی قسطیں ادا کر دی ہیں' جبکہ مرشد کی طرف سے ہنوز پہلی قسط کے منتظر ہیں' سعید خاور اور مرشد میں رُک کی مسافت ہے' خاور روہ کے ہیں مرشد کوہ کے' روہ کوہ کا سفر ضرب المثل ہے کاش کہ اس کی مثال مل جائے۔



ایک بے مثال دستاویز

سالک مجید

عظیم صحرائے تھر کی زندگی، تہذیب اور تاریخ پر ایک بے مثال دستاویز شائع کر کے سعید خاور نے صحیح معنوں میں صحرا کے ساتھ اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ اس کتاب کو آنے والی نسلوں کے لئے ایک ریفرنس بک کا درجہ حاصل رہے گا۔ آج کے اس مشینی دور میں کتاب لکھنا بڑی بات ہے، یہ ثابت کرتا ہے کہ مصنف مضبوط ارادوں کا مالک ہی نہیں بلکہ اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ دینا بھی بخوبی جانتا ہے۔ سعید خاور آج میرے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں، لیکن ان سے میری شناسائی دو دہائیوں سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ وہ ایک نفیس اور باکمال انسان ہیں۔ خلوص کا پیکر، انتہائی محنتی، ذہین اور معاملہ فہم شخص ہیں۔ ماں باپ، بزرگوں، دوستوں اور اہلِ خانہ کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ انہوں نے عاجزی اور انکساری کے ساتھ کامیابیوں کی کئی اہم منازل طے کی ہیں اور دورِ حاضر کے سیلف میڈ انسانوں میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا جا سکتا ہے۔

جب سے سنا تھا کہ سعید خاور کتاب لکھ رہے ہیں منتظر تھا کہ وہ کیا لکھتے ہیں، نوائے وقت کے ساتھ طویل رفاقت کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سعید خاور نے نوائے وقت میں بہت کم لکھا ہے حالانکہ یہ کتاب گواہی دیتی ہے کہ وہ اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں اور ان کی کتاب پڑھ کر احساس ہوا ہے کہ انہیں بہت عرصے سے ضائع کیا گیا ہے، ان کو خود بھی شاید یہ احساس ہو رہا ہو کہ بہت سا وقت بیت گیا ہے، اگر وہ آج بھی باقاعدگی کے ساتھ کالم لکھنا شروع کر دیں تو یقیناً اچھے کالم پڑھنے والوں کا مزا دوبالا ہو سکتا ہے، میں تو یہی کہوں گا کہ سعید خاور نے طویل عرصے سے

نوائے وقت میں ہوتے ہوئے بھی کالم نگاری نہ کرکے قارئین کے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔

صحرا کے ساتھ اپنی داستان عشق کو جن محبتوں کے ساتھ سعید خاور نے کتابی شکل میں اردو ادب کے حوالے کیا ہے اس پر وہ یقیناً مبارکباد کے لائق ہیں "پیاس اور افلاس کا صحرا" واقعی صرف ایک کتاب نہیں ہے بلکہ ایک تاریخ ہے اور جس رومانوی انداز میں تاریخی واقعات' تھر کی زندگی' تہذیب اور ثقافت کو بیان کیا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔نذیر لغاری نے بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ سعید خاور تم ایک صحرا کا قرض ادا کر رہے ہو' تم درد کے ماروں کے ایک اور عرضی نویس بن کر اٹھے ہو۔

اس کتاب کا انتساب بھی خوب ہے "سارنگا کے نام" یہاں سعید خاور لکھتے ہیں کہ:

جڈاں عشق فرید استاد تھیا
سبھ علم عمل برباد تھیا
پر حضرت دل آباد تھیا
سو وجد کنوں لکھ حال کنوں

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سعید خاور نے اپنی کتاب کا آغاز بھی عظیم صوفی شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے کلام کا حوالے دے کر کیا ہے کہ:

تری رحمتوں سے چھپا نہیں جو برا کیا کہ بھلا کیا
مرے راز داں میں بتاؤں کیا کہ شکست خوردہ نے کیا کیا
تری ذات' تری صفات کا مرے سر پہ دست کرم رہے
مری آرزو کی لگن رہے مرے حوصلوں کا بھرم رہے

ڈاکٹر نواز علی شوق کا اس کاوش پر کہنا ہے کہ یہ سفرنامہ ہر لحاظ سے تھر پر ایک جامع کتاب ہے۔صحرائے تھر پر اردو میں زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔سعید خاور صاحب نے تھر کے مختلف ذائقوں کو یکجا کر کے وقت کا ایک اہم تقاضا پورا کیا ہے۔ہمارے ہر دلعزیز ساتھی الطاف مجاہد کا کہنا ہے کہ ریت کے بگولوں' ویران قلعوں اور اجاڑ راستوں میں بکھرے قصوں کو زبان و بیان کا حسن اور داستان کا روپ مل گیا۔

جاوید چانڈیو کا کہنا ہے کہ یہ کتاب خالی خولی خواب نگری نہیں بلکہ حقیقتوں کے جہان سے بھی آشنائی کے سفر پر اپنے قاری کو ساتھ لے کر چلتی ہے۔جب ڈاکٹر ارباب غلام رحیم

وزیراعلیٰ سندھ بنے اوران کے ساتھ مختلف نشستوں میں مجھے سندھ کی سیاسی صورتحال اور تھر کے حالات پر تبادلہ خیال کا موقع ملا تو کئی بار تھر کی ترقی اور خوشحالی کے منصوبے گفتگو کا حصہ بنے' ڈاکٹر ارباب غلام رحیم کو سندھ کی روایتی سیاست پر بڑی دسترس حاصل ہے۔انہوں نے اپنا دور بڑی کامیابی سے گزارا۔شوکت عزیز کوانہوں نے تھر سے الیکشن بھی لڑوادیا یہ الگ بات ہے کہ نہ شوکت عزیز کے وعدے پورے ہوئے نہ ارباب غلام رحیم تھر کے حالات بدل سکے۔ اب پیپلز پارٹی کے دوستوں کو بھر پور موقع ملا ہوا ہے تو وہ تھر کے عوام کی بھر پور خدمت کریں وہاں خوشحالی لانے کے منصوبوں کو برق رفتاری سے مکمل کرائیں اور صرف زبانی اعلانات اور وعدوں کا دور ختم ہو عملی طور پر تبدیلی نظر آئے اور لوگوں کے حالات بدلیں۔ان کو زندگی کی بنیادی سہولتیں فراہم کی جائیں۔

ممتاز ایکسپورٹر اور نامور سیاستدان سینیٹر گل محمد لاٹ بھی اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں اور لوگ ان پر اوران کے خاندان پر کافی اعتماد بھی کرتے ہیں' ان سے توقعات بھی رکھتے ہیں کہ وہ تھر کی ترقی کے لئے عملی اقدامات کریں گے اور حکومتی سطح پر جن منصوبوں کی ضرورت ہے' ان کو آگے بڑھائیں گے۔گل محمد لاٹ سے قبل ان کے والد بھی علاقے کی کافی خدمت کرتے چلے آرہے ہیں۔اب پیپلز پارٹی کی حکومت ہے' تھر کی مشکلات اور زندگی سے پیپلز پارٹی کے دوست بخوبی واقفیت رکھتے ہیں اور یقیناً وہ بہت کچھ کرنا بھی چاہتے ہیں۔اگر سعید خاور کی کتاب میں تھر کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو پھر اس علاقے میں ضروری منصوبے شروع کرنے کے لئے کسی اور ریفرنس اسٹڈی کی ضرورت باقی نہیں بچتی۔اس کتاب کو تو صحرائے تھر کی پیاس اور افلاس کی خاطر سندھ ہی نہیں بلکہ قومی سطح پر نصاب تعلیم کا حصہ ہونا چاہئے۔



سعید خاور: ریگ زاروں کا مسافر

غزالہ فصیح

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' سعید خاور کے صحراے عشق کی داستان سے

صحرا سے عشق، دیوانگی کی کوئی خاص نسبت ہے اب وہ نجد کے صحرا میں بھٹکتا مجنوں ہو تھر کی ریت پر پنوں کو ڈھونڈتی سسی، ویراواہ کے ریگزار میں سارنگا کو پکارتا سدھونت جوگی ہو یا محبت کے اضطراب میں شاعر کا خیال، سب کے جنوں کو صحرا کی وسعت میں سکون نصیب ہوتا ہے۔

سعید خاور کو بھی ایک جنون بار بار صحرا کی طرف کھینچ لے جاتا تھا اس کنبے دار آدمی سے گھر والے کئی سوال کرتے تھے، بچے پوچھتے بابا شہر کو چھوڑ کر صحرا میں کیا لینے جاتے ہو۔ وہاں کھانا پانی ملتا ہے کہ نہیں، کیا رات کو ریت پر سونا پڑتا ہے؟ اور بچوں کی ماں پوچھتی ''تھر کس سے ملنے جاتے ہو، وہاں ویرانوں میں کیا رکھا ہے؟'' وہ یہ سوال پوچھنے میں حق بجانب تھے گھر کا آرام چھوڑ کر کوئی خاک چھاننے کیوں نکل پڑتا ہے۔ ''پیاس و افلاس کا صحرا'' میں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔ خاور نے اپنے دل کے حال کے لئے ''مرشد فرید'' کے کلام کو زبان بنایا ہے، قومی زبان میں اس کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

''ان ویرانوں میں دردمندوں کے ڈیرے ہیں، جہاں کرڑ کنڈا بوئی جا بجا ہے، یہ اونچے عالی شان ٹیلے اور ہر طرف پیاری بھوری ریت بکھری ہے۔ یہی عاشقوں کا مسکن ہے۔''

یہاں عاشقوں کے سوا کون قدم رکھ سکتا ہے۔ سعید خاور نے بھی عشق کی تحریک پر ریگ زاروں میں قدم رکھا، انہیں ان ریتیلے رستوں پر آنا ہی تھا، تھر کے درماندہ ماروؤں سے ملنا ہی تھا،

کیونکہ روہی اور تھر کی ریت کا آپس میں پیاس اور افلاس کا رشتہ ہے' روہی میں جنم لینے والے سعید خاور کو ریت سے محبت کی وراثت اپنے خون میں ملی۔ وہ لکھتے ہیں ''میرے بابا بھی سچے روہیلے (ریگستانی) تھے'' اپنے والد کی زبان سے وہ روہی کی محبت میں رچے نغمے سنتے بڑے ہوئے' ان نغموں کے جواب میں وہ جب والد سے کہتے ''بابا میں بھی اپنی روہی سے بے پناہ محبت کرتا ہوں''۔ تو اس اقرار سے باپ کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والی خوشی کی چمک بیٹا کبھی نہیں بھولا اور خون کے تعلق سے اپنی زمین کے ساتھ جڑے رشتے کو نبھانے کی انہیں ہمیشہ خواہش رہی۔ البتہ وقت اور حالات نے انہیں اس کا موقع نہ دیا' شعور سنبھالا تو جاگیردارانہ معاشرے کے استحصالی نظام نے جوان خون کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ روہی کا بیٹا ''ماں'' کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا' فکر روزگار انہیں قریہ قریہ بھٹکاتی کراچی لے آئی' اس شہر کی مٹی سب کے پاؤں پکڑ لیتی ہے۔ سعید خاور بھی یہیں کے ہو رہے۔ صحافت کی مصروفیات میں الجھ گئے' البتہ روشنیوں کے شہر میں رہتے ہوئے بھی انہیں ریگزار یاد رہے۔ 80ء کے اواخر میں جب صحرائے تھر قحط اور خشک سالی کا شکار ہوا تو روہی کی پیاس اور افلاس سے آشنا سعید خاور کو تھر کے دکھ نے بے چین کر دیا۔ بچپن میں انہوں نے اپنے والد سے ''چنوروں اور بھنوروں کی سرزمین'' تھر کے قصے سن رکھے تھے۔ صحرائی جذبوں میں اب صحافیانہ جستجو بھی شامل ہو گئی اور صحرائے تھر کے لئے رخت سفر بندھ گیا۔ ایک بار وہاں گئے تو پھر یہ سلسلہ رکا نہیں' بار بار جاتے رہے' یہاں تک کہ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' تخلیق ہو گئی۔

303 صفحات پر مشتمل ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' دراصل سندھ کا تہذیبی تاریخی انسائیکلو پیڈیا ہے' جسے ادبی رنگ میں جذب کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے۔ کراچی سے سوا چھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع صحرائے تھر تک جاتے ہوئے سعید خاور نے ہر کچے پکے راستے کا احوال' ہر پڑاؤ کا منظر پس منظر' ہر شہر کا ماضی حال اور ہر قبیل کے سندھ باسیوں کا رہن سہن بیان کیا ہے۔ کتاب کھولیں تو ورق در ورق سندھ کی تہذیب و تاریخ وا ہوتی چلی جاتی ہے۔

صحرا کے اس سفر میں مسافر کی اپنی شخصیت بھی پہلو در پہلو منکشف ہوئی ہے' کہیں وہ تھر کے حسن پر فدا ایک عاشق زار نظر آتے ہیں۔ اس خطے کے چپے چپے کی خبر دیتے ایک بے لاگ صحافی ثابت ہوتے ہیں۔ سندھ کی مٹی پر ابن بطوطہ اور البیرونی کے نقش پا تلاش کرتے ایک محقق ہیں۔ یہاں کی درگاہوں' خانقاہوں پر نذرانہ عقیدت پیش کرتے ایک زائر ہیں' ماضی کے دریچے

کھولتے ایک تاریخ نگار ہیں، مستقبل میں جھانکتے اصلاح کار ہیں اور سندھ کے حالات پر نظر کرتے ایک سخت نقاد ہیں، ان کے ان سب کرداروں کا خمیر ایک حساس دل سے اٹھا ہے۔

سندھ کے باسیوں اور صحرائی ماروؤں کا حال لکھتے ہوئے ان کا قلم آنسو ٹپکاتا ہے۔ روہی میں جاگیرداری نظام کے جس جبرے نے انہیں اپنی مٹی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ سندھ میں اسی استحصالی نظام میں لوگوں کو پستے ہوئے دیکھ کر وہ کڑھتے ہوئے کہتے ہیں "ہر جگہ غریب عوام کا حال ایک ہی ہے، اندھیروں کا مقدر لے کر دنیا میں آئے تھے، اندھیرے کا کفن لپیٹ کر قبروں میں اتر جائیں گے"۔

وڈیروں کی نجی جیلوں کی تحقیقات کرتے ہیں تو ہاریوں، مزارعوں کی حالت زار پر انہیں غصہ آتا ہے۔ کہتے ہیں "یہ ہاری یہ جو زمین پر کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں، انہیں ذرا بھی اپنی زندگی بدلنے کا ہوش نہیں"۔ مگر اگلے لمحے انہیں انسانی مجبوریوں کا ادراک ہوتا ہے تو اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "میں جب کبھی ایسے علاقوں میں جاتا ہوں، ناانصافی اور عدم مساوات دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے لیکن جوں ہی میں کراچی پلٹتا ہوں میرے اندر کا انقلابی نوجوان مصلحت اور مجبوری کی چادر اوڑھ کر ان حقیقتوں سے منہ چھپا لیتا ہے، میں اپنی کمزوریوں کو نظام کی کمزوریوں میں چھپا کر دل کو بہلا لیتا ہوں تو تسلی سی ہو جاتی ہے"۔

صحرا کا یہ مسافر جب تھر پہنچتا ہے تو قحط سے متاثر تھری ماروؤں کی پیاس اسے خون کے گھونٹ پینے پر مجبور کرتی ہے، ان کا قلم بین کرتا دکھائی دیتا ہے "تھر کا ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا ہے، یہ اپنی تقدیر کا رونا کس سے روئیں، آئے دن آفات پر تقدیر کو دوش دیں کہ مشکل گھڑی میں خبر گیری نہ کرنے پر حکومت کو موردالزام ٹھہرائیں، امداد اور موت کے انتظار میں تھر کے مارو گھڑیاں گن گن کر بتا رہے ہیں، ہم جہاں سے گزرتے ہیں، بھوک سے نڈھال اور پیاس سے بلکتے بچے ہماری جانب لپکتے ہیں اور ان کے لبوں پر ایک ہی فریاد ہے، پانی پانی پانی، اکیسویں صدی میں تھر کی پسماندگی کا ذکر اس طرح کرتے ہیں "تھر کی ذرائع آمدورفت سے کٹی دنیا میں بھونکتے کتے آبادیوں کی اطلاع فراہم کرتے ہیں۔"

تھر کے علاقے سے منتخب نمائندوں، سیاستدانوں، حکومتوں اور تھر کے نام پر پیسہ بٹورنے والی این جی اوز پر لکھتے ہوئے ان کا قلم آگ اگلتا ہے، لکھتے ہیں، "ان تنظیموں کے گدھ کس طرح

سے معصوم تھریوں کی لاشوں کو بھنبھوڑتے ہیں' صحرا میں قحط سالی اور خشک سالی کے موسم آتے ہیں' تو ان کی چاندی ہو جاتی ہے''۔

زندگی کے تلخ و شیریں ذائقوں' خزاں بہار کے رنگوں کا مجموعہ' سعید خاور کی کتاب میں یہ سارے رنگ ہیں' یہ سندھ کی ہزار داستان ہے۔ جس میں رومان کی رنگینی اور روایات کا حسن بھی جلوہ افروز ہے۔ سندھ باسیوں کی رواداری مہمان نوازی اور بھولپن کے قصے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتے ہیں۔ وتایو فقیر' ہوشو شہید' میر شیر اور ان جیسے دیگر سندھ کے بیٹوں کا ذکر کرتے ہوئے سعید خاور کے لہجے میں شہد گھل جاتا ہے۔ صحرا کے حسن پر فدا وہ ریت کے ہر ٹیلے' ہر بھٹ کا ذکر محبت سے مخمور الفاظ میں کرتے ہیں' صحرائی شاموں' چاندنی راتوں اور ریگستانی بولوں کے قصیدے پڑھتے ہیں۔ سعید خاور کا دلچسپ انداز بیان' شستہ اردو' معنوی فقرے' تلمیح' استعارے مل کر صحرا کے طویل سفر میں قاری کو بور نہیں ہونے دیتے' شاہ لطیف کے تھر دیس میں خواجہ غلام فرید' خاور کے راہبر رہے ہیں۔ پیاس اور افلاس کے صحرا کا اختتام سعید خاور کے 2008ء کے سفر پر ہوتا ہے۔ تب یہاں چند ترقیاتی منصوبوں کا آغاز ہوا تھا کچھ مثبت پیشرفت نظر آ رہی تھی' وہ موقع تھا جب تھر پر بارانِ رحمت بھی برس چکا تھا' بقول خاور بارانی موسم نے صحرا کے زخم بھر دیئے اور عالم یہ تھا کہ:

''اس موسم میں فرید دل کی دنیا آباد ہوگئی' مال مویشی بھی خوش ہوئے' دل کا درد جاتا رہا' مست موسم میں مارو پھولے نہیں سماتے۔''

سعید خاور نے جس جذبے کے ساتھ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' تحریر کی ہے' خدا کرے یہ صدا بہ صحرا نہ بنے بلکہ اس محروم خطے پر ارباب اختیار کو نظر کرم کی تحریک دے اور صحرا میں بارش کو گھیر لانے والا بادل بن جائے کیونکہ پیاس کا وہ صحرا جس میں آنسو بھی خشک ہو گئے ہوں' بارش نئے جنم کا استعارہ ہے۔



''پیاس اورافلاس کا صحرا''

ظہور دھریجہ

عظیم صحرائے تھر کی زندگی تہذیب اور تاریخ پر دستاویزی حیثیت کی حامل سعید خاور کی کتاب ''پیاس اورافلاس کا صحرا'' کے بارے الطاف مجاہد لکھتے ہیں:

ہر اچھی تحریر قاری کو تشنہ رکھتی ہے' اس سفرنامے کا مطالعہ بھی یہ احساس سوا کر دے گا لیکن اسے کم مت جانئے کہ ریت کے بگولوں' ویران قلعوں اور اجاڑ راستوں میں بکھرے قصوں کو زبان و بیان کا حسن اور داستان کا روپ مل گیا ہے' اچھے لحن کی طرح کہ یہ عطیہ خداوندی ہے اور ستارے اور لکیریں مہربان ہوں تو ہی اچھی کہانی کی بنت کسی کسی کا مقدر ہوتی ہے۔

میں اپنی بات الطاف مجاہد کے خراج تحسین سے شروع کر کے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ''پیاس وافلاس کا صحرا کی'' تحسین میں میرے اپنے خیالات واحساسات بھی شامل ہیں گو کہ الطاف مجاہد جیسے خوبصورت الفاظ لکھنے کا سلیقہ و ہنر مجھ میں نہیں۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کے پیش لفظ میں سعید خاور نے آپ بیتی جسے سرائیکی میں ''گزری وبانی'' کہتے ہیں' بیان کرنے کے ساتھ ساتھ کچھ دل کی باتیں بھی کی ہیں' خاور کہتا ہے کہ ہمارے ہاں شجرہ انساب کو بادشاہ اور پیغمبروں تک لے جانے کا رواج عام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو اپنے دادے کی قبر کا پتہ نہیں ہوتا' بہت سے آدمیوں کو دادے کے والد یا دادے کے دادے کا نام یاد نہیں ہوتا۔ خاور مزید لکھتا ہے کہ سندھ کے تالپوروں سے شکست کھا کر ہم پر حکومت کرنیوالے ریاست بہاولپور کے عباسی فرماں روا اپنا شجرہ حضرت عباسؓ بن

عبدالمطلب سے ملاتے ہیں اوراس پر ناز کرتے ہیں مگر میرا شجرہ نسب بڑا عجیب ہے' غلام ابن غلام ابن غلام ابن............ شجرہ نسب بتانے کے بعد خاور نے اپنے سرائیکی وطن کے نوابوں اور جاگیرداروں کے خلاف اپنی بغاوتوں کی کہانی بیان کی ہے' میں سمجھتا ہوں قومی حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف جو بغاوت آج موجود ہے اس کی ابتدا خاور جیسے نوجوانوں نے کی لیکن آج سرائیکی وسیب کے نوجوان کو خاور سے بڑھ کر بغاوتوں کی ضرورت ہے۔ آج پاؤں چھونے والے ہاتھوں کو گریبانوں کا آشنا کرنے کی ضرورت ہے' سرائیکی دھرتی کے مالک وہ نہ تھے جنہوں نے سرائیکی شاہیاں پلیٹ میں رکھ کر ''سخاوتیں'' کیں۔ وطن تو وطن سے پیار کرنے والوں کا ہوتا ہے' دھرتی سے محبت کرنے والوں کا ہوتا ہے' وطن تو اس کا ہوتا ہے جو کمی کسبی' کیہل' کوٹانے بنا دیئے جانے کے باوجود بھی ماں دھرتی سے پیار کریں سردار' بھتار' تمندار' نواب اور جاگیردار جنہوں نے انگریزوں کی غلامی کی' دراصل وہی غلام ابن غلام ہیں نہ کہ دھرتی سے پیار کرنے والے کیہل' کوٹانے' موچی' کمہار' درکھان' خاکروب اور نائی۔

1960ء میں ایوب خان نے ہمارا ''ستلج'' لیڈی ڈیانا کی انگوٹھی سے کم قیمت پر بھارت کو بیچ دیا' ستم بالائے ستم یہ کہ سرائیکی وطن سخاوت کرنے والے ''دو لاسیں'' نواب صادق محمد خان عباسی خود زندہ تھے' وہ بھی خاموش' شہزادے بھی خاموش' گدی نشین بھی خاموش' علما اور فضلا' صالحین اور واعظین بھی خاموش' قومی جماعتوں کے سیاسی قائدین کے ساتھ گردیزی' گیلانی' قریشی' عباسی' لغاری' مزاری' جلوانے' متیانے' لالیکے' پیرزادے اور ریاست کے نئے جاگیردار ''چوہدری راؤ' رانے'' سب خاموش۔ سعید خاور اپنے عمل سے یہ اظہار کرنا چاہتا ہے' یہ بتانا چاہتا ہے کہ بغاوت کرنی ہے' عظیم سرائیکی قوم کے ''سوداگروں'' کے خلاف' ایوان اقتدار کے ایجنٹوں کے خلاف اور سرائیکی قوم کے ''قتلام'' پر خاموشی اختیار کرنیوالوں کے خلاف اور یہ ثابت کرنا ہے کہ سرائیکی قوم غلام ابن غلام نہیں ہے۔

صفحہ 282 پر ''آئے مست ڈیہاڑے ساون دے'' کے موضوع پر خاور نے گھر کے بوڑھے مندر ''ویراواہ'' پر موجود غمزہ عشق کا شکار پریمی جوڑے سارنگا اور سدھونت کی یادوں کو قلمبند کرتے وقت تھر کے سفر میں ایسے بھٹکے کہ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ وہ لطیفؒ بھٹائی کے دیس تھر کی صحرا نوردی کر رہے ہیں یا خواجہ فریدؒ کے مسکن روہی میں ''سانونی'' منا رہے ہیں۔ خاور کا تو کام ہی

بھٹکنا ہے پر سچی بات یہ ہے کہ ''پیاس اور افلاس کے صحرا'' میں ''آئے مست ڈیہاڑے ساون دے'' کی فریدی کافی نے مجھے بھی اتنا رلایا ہے کہ اس کا بیان چند سطروں میں بہت مشکل ہے۔ سچ پوچھیے جب سے میں نے زیر مضمون دیکھا ہے تصورات کی دنیا میں گم ہوں اور خواجہ فرید کی کافی ''آئے مست ڈیہاڑے ساون دے'' گنگنا رہا ہوں۔ اس کافی جس میں مست ساون کے دن' پورب کی ہوائیں' کالے بھورے اور سرمئی بادل' چکویاں' چکوے اغن پپیہے اور کوئل کی محبت سے لبریز درد بھری کوک' آسمان پر بادلوں کی گھن گرج' بجلی کی چمک' قوس قزح کے رنگ' روہی میں بادو باراں اور باغ بہاری میں نہانے اور خوشی کے گیت گانے کی لذت' ساون میں چاندنی رات ملہاری دن' ہوا کی ٹھنڈی ہیل اور چاہت کی ہم آغوشی' ایسی خوبصورتی میں غم کھانا کسے یاد رہے؟ والی بات کے ساتھ ''خوشی سے چولے انگ نہ ماون'' والی بات پیاس اور افلاس کے صحرا میں موجود ہے۔ سعید خاور نے کمال ہنرمندی سے اس موضوع کو اپنی کتاب کا حصہ بنا دیا ہے۔

''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے'' سعید خاور کے ''پیاس اور افلاس کے صحرا'' کے 26 مضامین اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم ہیں' ان مضامین میں سے دو مضامین نے مجھے بہت افسردہ کیا ہے' یہ وہ دو مضامین ایک ''دریائے سندھ کا نوحہ'' ہے اور دوسرا ''کالا باغ ڈیم کا قومی قضیہ'' ہے۔ ان دونوں مضامین کے سیاق و سباق کا تعلق سرائیکی وسیب سے ہے لیکن ان مضامین میں سعید خاور کی تحریر اور جاوید چانڈیو کی تحقیق میں سرائیکی وسیب کو 100 فیصد آؤٹ کر دیا گیا ہے اور اسے سندھ پنجاب تنازعہ کا نام دیدیا گیا ہے حالانکہ ان دونوں مسئلوں سے پنجاب کا ایک فیصد تعلق بھی نہیں بنتا۔ دریائے سندھ کا ایک انچ حصہ بھی پنجاب میں نہیں ہے۔ یہ قبائلی علاقہ جات پختونخواہ سے شروع ہو کر سرائیکستان میں آتا ہے اور کالا باغ سے کشمور تک سرائیکستان کے سینے پر کھیلتا ہے' پنجاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح کالا باغ بھی پنجاب کا نہیں سندھ سرائیکستان کا مسئلہ ہے۔ عجب بات ہے کہ سعید خاور جیسے اتنے بڑے لکھاری کی تحریر اور جاوید چانڈیو جیسے سرائیکی سندھی محقق کی تحقیق وسیب نے سرائیکی سے پنجاب والا سلوک کیا' جس طرح دونوں مضامین میں دریائے سندھ اور کالا باغ کو سندھ پنجاب تنازعے کے تناظر میں دکھایا گیا تو غیر ارادی طور پر ہی سہی' ہمارے دوستوں نے سرائیکی وسیب پر پنجاب کے غاصبانہ قبضے اور رنجیت سنگھ کی فتوحات کو تسلیم کرنے کا ارتکاب کیا ہے' کتاب میں درج ایک اہم بات کا ذکر کرنے کے بعد میں سندھ اور

کالا باغ ڈیم کے مسئلے پر بات کروں گا تا کہ سرائیکستان کے قیام سے پہلے معاملات کو سمجھنے میں مدد ملے اور سندھی بھائی سرائیکی قوم کو پنجابی سمجھ کر اس پر اپنا غصہ نہ نکالیں۔ میں ایک اور بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ صفحہ 59 پر ایک جگہ درج ہے" سکندر اعظم کی طرح یہ دریا بھی نا قابل شکست تھا" حقیقت یہ ہے کہ سکندر جب سرائیکی وسیب کے مرکز ملتان آیا تو اسے سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا' یہاں سے تیر لگا اور وہ زخمی ہوا اور زخمی حالت میں یہاں سے بھاگا اور اپنے وطن سکندریہ جا کر مر گیا لہٰذا ثابت ہوا کہ اسے شکست ہوئی البتہ ہمارا سندھو نا قابل شکست کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔اب میں دریائے سندھ اور کالا باغ ڈیم کے مسئلے پر بات کرونگا۔

میری گفتگو میں دریائے سندھ اور کالا باغ سے پہلے پانی کے مسائل اور ان سے پیدا ہونیوالی غلط فہمیوں کی بات ہوگی تا کہ کتاب میں جو بات رہ گئی ہے اس کی طرف اشارہ ہو سکے۔ پانی کے مسئلے پر باتوں کو سیکولر ذہن کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے پانی کے مسئلے پر پنجاب دوسو فیصد فائدے میں اس لیے ہے کہ اپر پنجاب منگلا سے سرائیکی وسیب کا پانی بھی خود پی رہا ہے اور سرائیکی وسیب کا پانی بڑا بھائی بن کر سندھ کو بھی" سخاوت" کر دیتا ہے۔ جہاں تک نمائندوں کا تعلق ہے تو لاہور اور اسلام آباد کی اسمبلیوں میں بیٹھنے والے" عوامی نمائندے" تالیاں بجا کر واپس آجاتے ہیں۔یہی حال پشاور اسمبلی میں ڈیرہ اسماعیل خان و ٹانک کی قیادت کا ہے۔ پانی کے مسئلے پر سب سے زیادہ نقصان کائنات ارضی کے زرخیز ترین خطے سرائیکی وسیب کا ہو رہا ہے۔ سندھ والے یہ غلط فہمی دور کریں کہ نام کی نسبت سے دریائے سندھ پر سب سے زیادہ حق ان کا ہے اگر ایسا ہے تو دریائے جہلم پر بھی جہلم کے علاوہ کسی کا حق نہیں ہوسکتا اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھنے قابل ہے کہ دریائے سندھ کے نام مختلف جگہوں پر مختلف ہیں۔ یہ دریا جہاں سے شروع ہوتا ہے وہاں اسے" اباسین" آگے اٹک' اس سے آگے نیلاب' سرائیکی وسیب میں سندھ اور سندھ میں اسے مہران کہا جاتا ہے۔ جہاں سے یہ دریا شروع ہو رہا ہے وہاں بھی اس کا نام سرائیکی میں "اباسین" یعنی دریاؤں کا باپ ہے۔ آغاز سے اختتام پر دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ بولی جانیوالی زبان سرائیکی ہے اس کے باوجود بھی سرائیکی قوم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کہے کہ اس دریا پر حق ملکیت صرف ہمارا ہے۔ تمام دریا جہاں جہاں سے گزرتے ہیں اس کے آس پاس رہنے والے اس کے مالک ہوتے ہیں۔لہٰذا کسی ایک خطے یا ایک صوبے کی طرف سے ملکیت کے دعوے

غلط ہیں' پانی کا نام زندگی اور زندگی کا نام پانی ہے یہ سب کو ملنا چاہیے اور اس کی تقسیم ایماندرانہ طریقے پر ہونی چاہیے۔

پنجاب کی طرف سے یہ واویلا غلط ہے کہ سندھ پاکستان دشمن ہے وہ سمندر میں پانی جانا برداشت کر رہا ہے مگر ڈیم نہیں بنانے دے رہا' اصل مسئلہ باہمی اعتماد کا ہے' پنجاب پر مشرقی پاکستان کے بعد اب موجودہ صوبے بھی اعتماد نہیں کر رہے۔ سندھ میں لفظ پنجاب بہت بڑی گالی ہے' پنجاب کے مقبوضہ سرائیکی وسیب میں پنجاب کے خلاف غصہ اور نفرت اس سے بھی زیادہ ہے۔ اب صوبے اپنے اپنے مفادات اور اپنی اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ پنجاب والوں کا یہ سوچنا غلط ہے کہ پانی سمندر میں نہیں جانا چاہیے' اگر پانی سمندر میں نہیں جائے گا اور دریا کا پانی سمندر کے پانی آگے کی طرف نہیں دھکیلے گا تو پھر سمندر کا پانی سندھ کو کھا جائے گا۔ ضلع بدین ٹھٹھہ اس کی واضح مثال ہے۔ سندھ بلکہ اس پورے خطے کی بقا کیلئے ضروری ہے کہ سمندر کی چڑھائی کو روکا جائے اس لئے ضروری ہے کہ پانی کی ایک خاص مقدار سمندر میں جائے لیکن پانی کی تقسیم کا فارمولا درست ہونا ضروری ہے' اس وقت فی ایکڑ کے حساب سے پانی سرائیکی وسیب کو سب سے کم اور سندھ کو سب سے زیادہ مل رہا ہے اور یہ سندھ کیلئے مقدار میاں نواز شریف نے 1991ء کے معاہدے میں دوگنا کر کے سرائیکی وسیب کو افریقہ اور صومالیہ بنانے کی کوشش کی' اگر پنجاب کا رویہ مبنی بر انصاف ہوتا' سرائیکی قوم کو اس کا صوبہ دے دیا گیا ہوتا تو آج کالا باغ ڈیم بھی بن گیا ہوتا اور پنجاب والوں کو یہ اختیار نہ ہوتا کہ وہ سرائیکی وسیب کا پانی سندھ کو ''سخاوت'' کریں۔ پانی یا ڈیم کا تنازعہ صوبوں نے نہیں قوموں نے حل کرنا ہے۔ سندھی قوم کو پنجابی پر بھروسہ نہیں البتہ وہ سرائیکی قوم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ جب ایس کیو ایم نے ''کالا باغ ڈیم کا جو حامی ہے' حرامی ہے حرامی ہے'' کا نعرہ لگایا تو اس وقت بھی ہم کہتے تھے کہ ڈیم بننا چاہیے' اب بھی یہی کہتے ہیں کہ ڈیم بننا چاہیے مگر پاکستان میں بسنے والی قوموں کی رضامندی سے۔

پاکستان کے تمام دریاؤں کا مرکز سرائیکی خطہ ہے' سرائیکی وسیب کی یہ مرکزیت آج سے نہیں بلکہ صدیوں سے ہے' سندھ کے لغوی معنی بھی دریا کے ہیں۔ سرائیکی وسیب ایک طرح سے ایک نہیں سات ''سندھ'' کا مالک ہے' اگر پاکستان کے حکمرانوں کو سرائیکستان سے ڈر لگتا ہے تو سرائیکی صوبے کا نام ''سپت سندھو'' بھی رکھا جا سکتا ہے مگر حکمران یہ ذہن میں رکھیں کہ سپت سندھ

آج کے پورے پاکستان کا نام ہے۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ پنجاب پختونخواہ اور بلوچستان نام کی کوئی چیز سپت سندھو میں شامل نہیں تھی۔ خیر میں عرض کر رہا تھا کہ دریاؤں کے آغاز کشمیر و قبائلی علاقہ جات سے لے کر دریاؤں کے اختتام بحیرہ عرب تک پورا خطہ ''سپت سندھو'' ہے۔ اس کا مرکز ملتان اور اوچ زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ ابوالفضل نے اپنی کتاب آئین اکبری میں سلطنت ملتان کی جو حدود دی ہیں اس کے مطابق ایک طرف جیسلمیر' دوسری طرف ٹھٹھہ' تیسری طرف کشمیر اور چوتھی طرف مکران ہے۔ بہر حال اس ساری گفتگو کے ضمن میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سرائیکی خطہ جو زمانہ قدیم سے دریاؤں کا وارث ہے' تمام دریا اس کے سینے پر بہتے ہیں۔ سیلاب کی شکل میں یہ دریا ہر سال سرائیکی وسیب میں کھربوں کا نقصان بھی کرتے ہیں' اس کے باوجود یہ خطہ پانی سے محروم ہے' سندھ طاس معاہدے سے لے کر نواز شریف 1991 کے واٹر اکارڈ تک سرائیکی قوم سے آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کسی فورم پر سرائیکیوں کے کسی نمائندے کو نہیں بلایا گیا اور تو اور ارسا میں سرائیکی کی نمائندگی نہیں جبکہ سندھ کے دو نمائندے شامل ہیں۔ لہٰذا بات دریائے سندھ پر پانی کے حصے کی ہو یا کالا باغ ڈیم کی' یہ سندھ اور سرائیکستان کا مسئلہ ہے۔ پنجاب کا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں سرائیکی دھرتی پر قبضہ کر کے وہ دریائے سندھ اور کالا باغ ڈیم کا ماماں بننے کی کوشش کر رہا ہے' یہ مسئلہ جو عظیم قوموں سندھیوں اور سرائیکیوں کا ہے۔ جب سرائیکستان بنے گا تو انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا' سرائیکستان سے پہلے حل اس لئے نظر نہیں آیا کہ پنجاب پر کوئی اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔

حرف آخر کے طور پر عرض کروں گا کہ سئیں خاور کی کتاب بہت اعلیٰ اور بہترین ہے۔ پہلی مرتبہ اس کتاب کے ذریعے ''تھر'' کے بارے میں بہت کچھ جاننے کو ملا' یہ کتاب سندھ سرائیکستان کے درمیان فکری پل کا کام دے گی' میں نے کتاب کے بارے جو عرض کیا میری طرف سے میرے ''جذبات'' ہیں۔ یہ کسی طرح علمی تحقیق یا تنقید نہیں میرے خیالات غلط بھی ہو سکتے ہیں بہر حال میں عرض کر رہا ہوں کہ ''جند ڈیسوں سندھ نہ ڈیسوں'' اس عنوان کے تحت سعید خاور نے عظیم سرائیکی حریت پسند ہوشو شیدی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے' لیکن یہ نہیں لکھا کہ ہوشو شیدی سرائیکی بولنے والا حریت پسند تھا اس کا ''باس'' ''شیر سندھ'' میر شیر محمد خان تالپور بھی سرائیکی تھا' افسوس اس بات کا ہے کہ اپنے ہیروز کو ہم خود بھی اپنا نہیں سمجھ رہے' جب قومیں زوال پذیر ہوتی ہیں

تو پھر ''اپنے بھی اپنے نہیں ہوئے''۔ خاور صاحب نے اس مضمون کو بہت صفحے دیئے مگر اتنا بھی نہ ہوا کہ صرف اتنا لکھ دیا جاتا کہ کوئی سرائیکی حریت پسند سرائیکی بول رہا تھا۔ ممکن ہے کہ سعید خاور سندھی دوستوں کے لحاظ سے پس و پیش کر گئے ہوں لیکن میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ پس و پیش سربراہ مملکت آصف علی زرداری نے نہیں کی' واقعہ اس طرح ہے کہ صدر زرداری سے صاحب بہاولپور میں کالم نویسوں کی ملاقات ہوئی' ایک پنجابی دوست شاکر حسین نے زرداری صاحب سے کہا کہ آپ سرائیکی اچھی بول لیتے ہیں۔ زرداری صاحب نے شاکر حسین شاکر کو جواب دیا کہ سرائیکی صرف میری نہیں یا سندھ صوبے کی نہیں بلکہ پوری وادی سندھ جس میں پورا پاکستان آتا ہے' کی اصل اور قدیم زبان سرائیکی ہے۔



''پیاس اور افلاس کا صحرا''

تبصرہ: محمد عثمان جامعی

اپنے عنوان میں اور سرورق پر بے برگ و بار صحرا اور اس کی ویرانی لئے یہ کتاب ہر ہر سطر میں شاداب لفظوں کی بہار اور تاریخ کے پُر شور لمحوں کی رونق سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کتاب کا اصل موضوع صحرائے تھر ہے، لیکن قاری مصنف کے ہم راہ اس کے مسکن کراچی کی پُر ہجوم شاہ راہوں سے تھر کے اُجڑے راستوں تک کا سفر مختلف مقامات پر پڑاؤ ڈالتے ہوئے طے کرتا ہے۔ اس مسافرت میں کہیں دریائے سندھ اپنے سراب ہوتے وجود پر نوحہ کناں نظر آتا ہے تو کہیں خشکی میں ڈوب جانے والا ''دریائے پران'' اپنے مٹنے کی کہانی سناتا دکھائی دیتا ہے۔ اس سفر میں کسی مقام پر ''مر جائیں گے، مگر سندھ غیروں کے حوالے نہیں کریں گے'' کا حریت افروز نعرہ لگاتا ہوشو شیدی سامنے آتا ہے اور اپنی داستان شجاعت سے دلوں کو گرماتا ہے تو کسی جگہ سندھ کا مجذب و دانش ور وتایو فقیر اچانک اپنے چبھتے فقروں اور بصیرت افروز حکایات کے ساتھ آ موجود ہوتا ہے۔ مسافر وڈیروں کی نجی جیلوں میں جبری مشقت کرتے ہاریوں کی حالت پر دھندلا جانے والی آنکھیں صاف کرتا ہے تو سامنے شاہی قید خانے میں سسکتی ماروی کا بے کسی کا دل گداز نظارہ ہوتا ہے۔ گویا یہ کتاب تھر کی تاریخ، جغرافیہ، طرزِ حیات، ثقافت اور مسائل پر دستاویز ہونے کے ساتھ سندھ کے ماضی و حال کی تصویر بھی ہے۔ یہ تصنیف اپنے مصنف کی سہ جہتی شخصیت کا عکس بن کر سامنے آئی ہے۔ سعید خاور بنیادی طور پر صحافی ہیں، چنانچہ حقائق پیش کرنا اور پوری معروضیت کے ساتھ وقائع نویسی ان کے مزاج کا حصہ بن چکی ہے۔ ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ان میں تحقیق اور

جستجو کی لگن اور شعروادب سے لگاؤ کا پتا دیتی ہے۔ لہٰذا ان کا صحافی مسافر بن کر تھر کی سمت کوچ کرتا ہے اور اپنی ''رپورٹ'' مرتب کرنے کے لئے بڑے کشٹ اٹھا کر حقائق جمع کرتا ہے۔ ان کا محقق اپنے موضوع کی وسعتوں اور پہنائیوں میں بہت دور اور بڑی گہرائی تک محوسفر ہو کر ''تحقیقی مقالے'' کا سامان کرتا ہے لیکن جب وہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان میں مدتوں کا سویا ادیب یکا یک بیدار ہو جاتا ہے اور صحافی اور محقق کو دروازے کا راستہ دکھا کر بزم خیال کی صدارت سنبھال لیتا ہے۔
چنانچہ اس کتاب میں تاریخی حقائق، دستاویزی حوالے اور ماضی اور حال کے واقعات داستانی اسلوب اور ناول کے رنگ میں خود کو بیان کرتے ہیں۔ یہ دل نشیں طرزِ نگارش قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لئے رکھتا ہے اور کتاب کا آخری صفحہ پڑھنے کے بعد اسے احساس ہوتا ہے کہ سیاست، تاریخ، رومان اور عسکریت کے قصوں کے تانے بانے سے بنی یہ الف لیلہ اسے کتنے ہی حقائق اور سچائیوں سے روشناس کرا چکی ہے۔



بارش کا پہلا قطرہ

ضیاالاسلام زبیری

جناب سعید خاور صاحب ایک منفرد شخصیت کے حامل شخص ہیں۔ صحافی تو بہت پرانے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ادیب بھی ہیں اور ان کی تازہ ترین تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' صرف اپنے سرورق سے ہی ان کی جدت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ صحرا کے بارے میں مشہور ہے کہ گرمی حدت اور ریت کے طوفان میں حلق میں کانٹے پڑ جاتے ہیں اور جانداروں کا رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ جناب سعید خاور نے کس خوبصورتی کے ساتھ اس کے ساتھ افلاس کو بھی جوڑ دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ افلاس بھی ایک صحرا کی طرح ہے جس کی زد میں آنے والے اسی طرح تڑپتے اور جان دیتے ہیں جس طرح کوئی ذی روح کسی تپتے صحرا میں پھنس جائے اور پانی کی آس میں دم توڑ دے۔ صحرائے تھر میں ان دونوں حقیقتوں کا سامنا ہے اور جناب سعید خاور کی کتاب ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے۔

جناب سعید خاور نے گویا دریا کو ایک کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو تھرپارکر کے بارے میں ہر قسم کی معلومات ملیں گی جن میں اس کے معدنی وسائل، سیاسی حالات اور سیاسی مسائل سے لے کر اس میں موجود وڈیروں کی نجی جیلوں اور تعلیم اور صحت کے معاملات تک سب کو زیر بحث لایا گیا ہے اور یہ کوئی سرسری طور پر نہیں کیا گیا بلکہ اس میں سالہا سال کی تحقیق اور تفتیش شامل ہے جس کا عکس اس کتاب میں جا بجا نظر آتا ہے۔

شاید آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ یہ تھرپارکر کے بارے میں کوئی خشک کتاب ہے۔ سچ تو یہ

ہے کہ ایک دفعہ جو اس کتاب کو پڑھنا شروع کر دے تو گویا اس کے جادو میں اپنے آپ کو بھلا دیتا ہے۔ اس میں نہ صرف اعداد و شمار ہیں بلکہ جگہ جگہ شاہ لطیف اور خواجہ فرید کا کلام بھی ہے اور ایک ویران رات کو ماروی کے ساتھ مکالمہ بھی۔ اس میں سب کچھ ہے جو ہر طبقہ فکر کے لئے دلچسپی کا باعث بن سکتا ہے اور جہاں اس سے اس کتاب کی جاذبیت میں اضافہ ہو گیا ہے وہاں اس سے لکھنے والے کی شخصیت کے قابل قدر پہلو بھی نمایاں ہو گئے ہیں۔

جناب سعید خاور کی کتاب سندھ کے ادب میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کی دوسری کتابیں سندھ کے دوسرے تاریخی اور سیاحتی دلچسپی کے مراکز پر لکھی جائیں اور حکومت سندھ ان کی اشاعت میں ذاتی دلچسپی کا مظاہرہ کرے۔ جناب سعید خاور کی کتاب بارش کا پہلا قطرہ ہے اور امید کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی کاوشیں جاری رکھیں گے اور اس طرح پاکستان کے بارے میں ایسی کتابوں کا اجرا ہو سکے گا جو اس ملک کے حقیقی ورثے کی نشاندہی کریں اور اس ملک کے بارے میں جو بین الاقوامی غلط تاثر پیدا کیا جا رہا ہے اس کے آگے بندھ باندھا جاسکے۔ ایک دفعہ پھر میں جناب سعید خاور کو اس تاریخی کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی اشاعت پر بھرپور مبارکباد دیتا ہوں۔



بھٹائی اور پیر فرید کا شیدائی

ایس ایم امین شاہ

''بلیک گولڈ'' سے مالا مال دھرتی تھر پارکر کے ریگزاروں کا المیہ صرف پیاس اور افلاس پانی اور زندگی کی بنیادی سہولتوں کی عدم دستیابی نہیں بلکہ وسائل پر مقامی آبادی کا حق تسلیم نہ کئے جانے والی وہ تنگ نظر سوچ اور آمرانہ رویہ ہے جو غربت و پسماندگی کے جنم کا سبب ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے تھر پارکر ہی نہیں میری روہی اور چولستان منافقانہ سازشوں کے تھپیڑے جھیل رہے ہیں۔ پیر فرید کی نگری روہی سے پیاس اور افلاس کے صحرا تھر پارکر تک لق ودق صحرا سے سعید خاور کی محبت وعقیدت کا عظیم رشتہ' ورثہ ہے' ان اکابر کا جنہوں نے لق ودق صحراؤں ریگزاروں اور ریگستانوں میں آج دریافت ہونے والے ''بلیک گولڈ'' قدرت کے خزانوں اور قدرتی وسائل سے مالا مال دھرتی کا سکندر اعظم سے ہٹلر' چرچل اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد تک بلامعاوضہ چوکیداری اور حفاظت کا کام روحانی ہتھیار کے ذریعہ سرانجام دیا۔ پیر فرید' بھٹائی' سچل سرمست' خواجہ محمد یار فریدی جیسی فروزاں ہستیوں نے دھرتی ماں کے تقدس اور تحفظ کا جو درس دیا سعید خاور نے عمر ماروی کی دھرتی کا مقدمہ پیاس اور افلاس کے فورم پر لڑ کر' ایک ہی گھاٹ سے پانی پینے والے تھر کے انسان وحیوان اور حوا کی بیٹیوں کی وکالت ہی نہیں کی بلکہ ہواؤں میں تحلیل ہوتی مظلوموں کی صداؤں کو ارباب اقتدار تک پہنچا کر اکابر کا دیا ہوا فرض بھی چکایا ہے۔

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' میں اپنی صحافتی باخبری کو سعید خاور نے نہایت خوبصورتی سے سمویا ہے کہ سب کچھ نہایت اختصار اور مہارت کے ساتھ کہہ دیا ہے جو پچھلے تریسٹھ سالوں میں

دادرسی کیلئے انتظار اور مفادات کی سولی پر مستقبل کا منتظر ہے۔سعید خاور نے پیاس اور افلاس کے صحرا میں دیکھی بھالی اور جانی پہچانی دنیا میں ایک ایسی دنیا دریافت کی ہے جہاں کوئلے کے ذخائر کا حجم آٹھ سو پچاس ٹریلین کیوبک فٹ ہے اور اس ''بلیک گولڈ'' کی قیمت باون ٹریلین امریکی ڈالر سے بھی زائد ہے۔جس سے اگلے سو برس توانائی کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں۔پنجند سے کوٹری اور کراڑ جھیل سے تھر اور عمر ماروی کے صحراؤں کے سوکھے تالابوں تک سعید خاور نے ترقی پسندی اور دھرتی پرستی کی بدولت پیر فرید اور بھٹائی کی پیروی میں تیسری دنیا کے پسماندہ معاشرے کے تضادات کی داستان کو اپنی تخلیق ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' میں سمودیا جس میں کربلا' بصرہ اور سندھ کے خیر پور میرس سے لے کر روہڑی تک پھیلے نخلستانوں' میری روہی کے ریتیلے ٹیلوں سے ''بلیک گولڈ'' کے خزانوں تک کی روئیداد کو اپنی تخلیق کا حصہ بنادیا۔سعید خاور کی نگارشات میں پائی جانے والی فکری پختگی نے ترقی پسندی کی ابتدا سے لے کر مابعد جدیدیت تک کا سفر پورے سلیقے اور شان سے کیا اور عصری حیثیت سے ہم آہنگی ادب وصحافت کے ذریعہ روہی اور تھر کے ریگزاروں میں بسنے والوں کے احساس محرومی کو قلم کے ذریعہ دور کرنے کو ترجیح دی۔

پیر فرید کا یہ ادبی سپاہی' صحافت کا وہ سپہ سالار ہے جسے سرحدوں کے حصار میں قید کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی۔سعید خاور ایک ایسے کردار کا نام ہے جو بہت سارے کام کرتا ہے وہ تسلسل کے ساتھ ادب اور صحافت کے اس بھاری پتھر کو اٹھائے ہوئے ہے جسے زیادہ تر لوگ چوم کر راستے میں ہی چھوڑ دیتے ہیں وہ شاعر بھی ہے' افسانہ نگار بھی صحافی بھی ہے' بھٹائی اور پیر فرید کا شیدائی بھی۔میری دانست میں اسے خراج تحسین پیش کرنا چاہئے کہ اپنے اندر کے آدمی کو مطمئن کرنے کیلئے اس نے افسانہ نگاری اور صحافت کا جامہ پہن لیا۔''پیاس اور افلاس کا صحرا'' میں سعید خاور کی تخلیقی محنت اور عرق ریزی نہایت نمایاں ہے یہ بہترین کتاب اس کے روہی' چولستان اور تھر سے اخلاص کی علامت ہے۔سرورق پر تھری خاتون کی تصویر نے جہاں آج کے انسانوں کے دکھ درد کو صفحات پر بکھیر دیا ہے وہیں اس نے اپنی قدیم روایات کی جڑوں کو بھی نگارشات میں ضم کر دیا ہے اور یہ واضح کردیا ہے کہ اپنی تہذیب وتمدن سے کٹ جانے والوں کا کیا حال ہوتا ہے۔سعید خاور نے اپنے گرد وپیش رونما ہونے والے سیاسی ومعاشرتی اور نفسیاتی حالات وواقعات' سانحات وحادثات اور زمانے کے تغیرات کے نتیجے میں انسانی فکر' سوچ' شعور' احساس اور رویوں میں پیدا

ہونے والی تبدیلیوں اور بین الاقوامی سطح پر ملکوں اور قوموں کے بدلتے حالات وواقعات کے تناظر میں ''بلیک گولڈ'' سے مالا مال دھرتی اور اس کے باسیوں کا مقدمہ لڑا ہے۔ اپنے گرد وپیش کی زندگی اور سماجی حالات کی بڑی عمدہ بھرپور اور سچی تصویر کشی کی ہے وہ غیروں کا دل سانسوں کی مالا میں پروئے ہر دکھ کو یوں محسوس کرتا ہے جیسے ہر انسانی دکھ اور دادرسی اس کی میراث ہو' مجید نظامی' ظہور احمد دھریجہ' مجاہد جتوئی (جو نام آپ لکھنا چاہیں) جیسے نقیبوں کے تعاون سے سالاری اور سپہ سالاری کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی شکل میں اس نے اکابر کی دھرتی اور خلق خدا کیلئے جو شعوری کوشش کی ہے وہ یقیناً اردو ادب اور صحافت کو اعتبار بخشنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوگی۔



پیغامات

ریت رستوں کا مسافر

حاجی مسعود پاریکھ

چیئرمین میمن خدمت فورم

صحرائے تھر اور پارکر پاکستان کا منفرد خطہ ہے۔ ہزاروں مربع میل پر پھیلے اس صحرا اور پہاڑی علاقے میں ہزاروں سالوں کی تاریخ' تہذیب اور ثقافت پنہاں ہے تو دوسری جانب قیمتی معدنیات کے ذخائر اس کے مالا مال ہونے کا سبب ہیں۔ کوئلے کے وسیع ذخائر' چائنا کلے' نایاب گرینائٹ' جنگلی حیات اس صحرا کا سرمایہ ہیں۔ یہ علاقہ سماجی اور ثقافتی لحاظ سے بھی انتہائی قدیم اور منفرد ہے۔ اس کی بندرگاہیں ماضی میں اس کی معیشت کا بہت بڑا ذریعہ تھیں۔ پھر موسموں نے تیور بدلے تو یہ علاقہ بے آب و گیاہ صحرا کے روپ میں ڈھل گیا۔ اس صحرا کے بھی اپنے جداگانہ رنگ اور خدوخال ہیں جو اسے دوسرے صحراؤں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اس کا ذرہ ذرہ اس کی قدامت اور اہمیت کی گواہی دیتا ہے۔ سعید خاور نے ایک بار روشنیوں کے شہر کراچی سے اس صحرا کا رخ کیا تو پھر اس نے خود کو اس صحرا کے ریت رستوں میں گم کر دیا' وہ برسوں ان ریتیلی راہوں میں کھوجی بن کر بھٹکتے رہے اور برسوں کی تحقیق کے بعد ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی شکل میں ایک خوبصورت کتاب منظر عام پر لے کر آئے ہیں جو یقیناً ان کے صحرا سے عشق کی داستان قرار دی جا سکتی ہے۔ سعید خاور نے اس کتاب میں صحرائے تھر کی زندگی' تہذیب' تمدن اور ثقافت کے سارے رنگ عیاں کر دیئے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں اپنے خوبصورت لفظوں سے محض اپنے قارئین کا دل موہنے کی کوشش نہیں کی بلکہ مسائل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ تھر اور تھریوں کی تقدیر بدلنے کے لئے کئی اہم تجاویز بھی دی ہیں۔ بہرحال سعید خاور نے ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی شکل میں ایک اہم دستاویز رقم کر دی ہے۔ میں اس شاندار کاوش پر انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اور توفیق دے اور وہ اس طرح کے مزید کام سرانجام دے سکیں اور ہر مقام پر سرخرو ہو سکیں۔



خوب صورت لفظوں کی مالا

بیگم فرحت احسان

منیجنگ ڈائریکٹر

روز بیوٹی پارلر (پرائیویٹ) لمیٹڈ

ہم سعید خاور بھائی کو اس وقت سے جانتے ہیں جب وہ نوائے وقت گروپ کے ہفت روزہ ''فیملی میگزین'' کے بیورو چیف تھے اور وہ اپنے میگزین کے لئے ''روز بیوٹی پارلر'' کے توسط سے ''سینٹر اسپریڈ'' تیار کراتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سعید خاور بھائی نے اپنی شبانہ روز محنت اور لگن سے ترقی کی چونکا دینے والی منزلیں حاصل کی ہیں اور اب وہ اخبار نوائے وقت کراچی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہیں۔ میں اور میرے میاں شیخ احسان محمد ہمیشہ سعید خاور بھائی کی پیشہ ورانہ صحافتی سرگرمیوں کے گواہ اور صلاحیتوں کے معترف رہے ہیں۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی دھن میں رہتے ہیں۔

میں سمجھتی ہوں کہ ان کی کامیابی کے پیچھے ان کے والدین کی دعائیں' اچھے دوستوں کی معاونت اور مسلسل محنت کا عمل کارفرما ہے۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتے ہیں' ہر بار اپنے حوالے سے کوئی نہ کوئی بڑی خبر لے کر آتے ہیں' اس بار بھی وہ آئے ہیں تو ہمارے لئے اپنی کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کے رسیا اور ظلم وزیادتی کے خلاف ہمیشہ سینہ سپر سعید خاور بھائی نے پسماندہ ترین صحرائے تھر کے مظلوم باشندوں کے مسائل پر جرات مندانہ انداز سے لکھ کر اپنے حق گو صحافی اور ادیب ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ بے پناہ مصروفیات کے باعث ہمیں کتابیں پڑھنے کا زیادہ موقع نہیں ملتا لیکن خاور بھائی کی کتاب کی ورق گردانی کی تو جی چاہا کہ اسے پیش لفظ سے آخری صفحہ تک پڑھا جائے۔ یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے بڑے خشک موضوع کو بڑے دلچسپ پیرائے سے لکھا ہے اور ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی شکل میں خوب صورت لفظوں کی ایک مالا پرو دی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کے حوالے سے تو صحیح رائے تو تنقید نگار ہی دے سکتے ہیں لیکن میں جہاں تک سمجھتی ہوں خاور بھائی نے نظر انداز کئے گئے ''صحرائے تھر'' کی زندگی اور مسائل کو پوری دنیا پر آشکار کر دیا ہے۔ میں ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی اشاعت پر سعید خاور بھائی کو مبارک باد پیش کرتی ہوں' وہ ہمیشہ

ہماری دعاؤں میں شامل رہتے ہیں، اب بھی میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہر قدم پر کامیاب کرے اور ایسی ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے۔ آمین



سعید خاور، دردمند صحافی

رحمت خان وردگ

صدر تحریک استقلال

سعید خاور سیلف میڈ انسان ہیں، شبانہ روز محنت کر کے پاکستان جیسے بدعنوان اور عدم مساوات سے دوچار معاشرے میں اپنی الگ شناخت بنائی اور ملک کے سب سے بڑے شہر کراچی میں خود کو ایک پروفیشنل صحافی کے طور پر منوایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والے نوجوان کی یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔ میری سعید خاور سے دیرینہ شناسائی ہے، ہم کم و بیش بیس سالوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ میں نے اس عرصہ میں سعید خاور کو ایک دردمند صحاافی اور مخلص دوست کے طور پر دریافت کیا ہے۔ سعید خاور جیسے دردمند صحافی سے ہماری کافی توقعات رہتی ہیں کہ وہ پاکستان کے پسماندہ اور پسے ہوئے لوگوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لئے اپنے قلم سے تلوار کا کام لے۔

یوں تو سعید خاور بطور صحافی یہ کام وقتاً فوقتاً اپنی تحریروں کے ذریعے انجام دیتے رہتے ہیں لیکن حال ہی میں انہوں نے سندھ کے عظیم صحرا تھر پر ایک ضخیم کتاب ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' لکھ کر ایک بڑی ذمہ داری پوری کر دی ہے۔ میں نے اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، یہ کتاب چونکا دینے والے حقائق اور معلومات پر مبنی ہے۔ سعید خاور نے اپنے قلم سے واقعتاً تلوار کا کام لیا ہے اور ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' میں ناانصافی اور حکمرانوں کے کرتوتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ میں اس کاوش پر سعید خاور کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔



ایک عہد تک رسائی

سردار عبدالرحیم

رہنما پاکستان مسلم لیگ

سعید خاور کی پیشہ ورانہ صحافتی خدمات کا میں ہمیشہ معترف رہا ہوں اور پچھلے دو عشروں سے ان کی

صحافتی ترقی بھی میری نظروں کے سامنے ہے۔ مجھے علم ہے کہ وہ حصولِ علم کے لئے محراب والا (بہاول پور) سے کراچی آئے اور کراچی ان کو ایسا راس آیا کہ وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ اپنی زندگی سنوارنے میں انہوں نے کسی سیڑھی کا سہارا نہیں لیا۔ وہ سیلف میڈ انسان ہیں' ابتدائی دنوں میں کراچی میں انہوں نے انتہائی مشکل دن گزارے لیکن نہ تو حالات سے گھبرا کر ہمت ہاری اور نہ ہی اپنے حواس کو غیر متوازن ہونے دیا بلکہ مشکل حالات نے انہیں حوصلے سے جینے کی امنگ دی اور انہوں نے اپنی ناکامیوں سے کامیابیوں کی راہیں تراش لیں۔ میری سعید خاور سے اکثر ملاقاتیں رہتی ہیں اور ہم گھنٹوں باہمی دلچسپی کے امور اور قومی مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہتے ہیں' وہ ہر موضوع پر کھل کر اظہار خیال کرتے ہیں اور کھری کھری باتیں منہ پر کرنے کے عادی ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ان کی نیت اور نظریات میں کھوٹ نہیں ہے' زندگی کو محض ایک زاویئے سے نہیں دیکھتے بلکہ ہر پہلو سے اسے جانچنے اور برتنے کا سلیقہ انہیں آ گیا ہے۔ وہ ایک پسماندہ اور نظر انداز کئے گئے علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اس کا موردالزام پاکستان کو نہیں پاکستان کے اصل حکمرانوں کو سمجھتے ہیں' اس لئے وہ پاکستان سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہیں اور اشرافیہ' غاصب طبقوں اور بے راہرو بااختیار لوگوں پر اکثر گرجتے برستے رہتے ہیں۔

ان کی تازہ تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' بھی ایک طرح سے بالا دست قوتوں اور استحصالی طبقوں کے خلاف پسے ہوئے طبقوں کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے ہمارے ضمیر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ بظاہر یہ ایک سفرنامہ ہے جو کراچی سے سرحدی تعلقہ ننگر پارکر تک کیا گیا ہے' لیکن انہوں نے ساڑھے سو کلومیٹر پر محیط اس سفر میں سندھ کی تہذیب اور صحرائے تھر کی زندگی کے سارے رنگ ہماری آنکھوں میں بسا دیئے ہیں اور ہمیں ایک عہد تک رسائی کا موقع فراہم کر دیا ہے۔ یہی اس کتاب کی خوبصورتی ہے جو پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے۔ سعید خاور ریت رستوں کے عاشق ہیں' میں انہیں صحرا سے اپنے عشق کی داستان ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' لکھنے پر دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔



ہوا کا تازہ جھونکا

ڈاکٹر امتیاز اطہر صدیقی
سرجن: ناک، کان، گلا
جناح پوسٹ گریجوئٹ میڈیکل سینٹر کراچی

''پیاس اور افلاس کا صحرا'' صرف صحرائے تھر کی سرگزشت نہیں ہے بلکہ یہ تصنیف سعید خاور کی ایک طرح سے خودنوشت بھی ہے جو ایک صحرا کے پس منظر میں بڑی خوب صورتی سے تحریر کی گئی ہے۔ تھر پارکر اپنے محل وقوع، تاریخ، قدیم تہذیب وثقافت، اپنی غربت اور پسماندگی کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے اور کئی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کی امدادی کارروائیوں کی ''دھوم'' کے سبب دنیا پر آشکار ہوا لیکن اس صحرا کی زندگی کے حوالے سے معلومات کا جو باب سعید خاور نے ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' کی صورت میں کھولا ہے وہ چونکا دینے والا ہے۔ یہ کتاب بے آب وگیاہ ریگستان میں ہوا کے تازہ جھونکے کی مانند ہے۔ میں نے اس کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے، آپ ایک بار پڑھنے بیٹھیں تو پھر اسے ختم کئے بغیر جی نہیں چاہتا۔ سعید خاور پیش لفظ سے لے کر تھر میں تبدیلی کے لئے تجاویز پر مبنی باب ''یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر'' تک قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں، یہی ان کے اسلوب کی خوبی ہے۔ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قاری خود کو صحرا میں موجود پاتا ہے اور چلتے چلتے تھر میں قدیم تہذیب اور تاریخ کے بکھرے اوراق سمیٹتا رہتا ہے۔ میرے خیال میں سعید خاور کی تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' پی ایچ ڈی کے لئے لکھے گئے تحقیقی مقالے سے کم نہیں ہے۔ میں اس کاوش پر سعید خاور کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ مستقبل میں بھی اسی طرح کے تخلیقی کام سرانجام دیتے رہیں۔



مظلوموں کی آواز

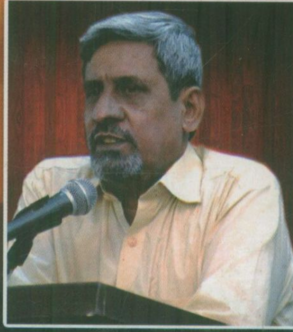
پروفیسر ڈاکٹر غلام مجتبیٰ
چیئرمین پاکستان پالیسی انسٹی ٹیوٹ
ریاست ہائے متحدہ امریکہ

تھر، صوبہ سندھ کا ایک ایسا محیرالعقول صحرا ہے جو اپنے وجود میں قدیم ثقافتی ورثہ اور لامحدود

معدنی وسائل سمیٹے ہوئے ہے۔اپنی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے باوجود یہ خطہ ماضی میں بری طرح سے نظرانداز کیا گیا۔ خاص طور پر یہاں کے باشندوں کی غربت' افلاس کے خاتمہ اور مسائل کے حل پر کوئی توجہ نہیں دی گئی' یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ پاکستان کے پسماندہ ترین علاقوں میں شمار کیا جاتا ہے جہاں غربت کی شرح دوسرے علاقوں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔تھرپارکر اور اس کے باسیوں کی بدقسمتی رہی ہے کہ ان کی زندگی بدلنے اور ان کے مسائل حل کرنے پر حکومتوں اور حکمرانوں نے قطعی اپنا فرض نہیں نبھایا تو یہاں سے منتخب ہونے والی سیاسی قیادت نے بھی ان مظلوموں کی اشک شوئی اور دادرسی کے لئے اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کیں۔ گوکہ ماضی میں ایک وزیراعظم اور ایک وزیراعلیٰ کو تھر سے منتخب کرایا گیا لیکن تھریوں کے ووٹوں پر منتخب ہوکر اہم عہدوں پر فائز ہونے والی شخصیات نے تھری عوام کو بری طرح سے مایوس کیا۔اب وقت آ گیا ہے کہ صحرائے تھر کے مظلوم عوام کے دکھوں کے مداوا کی کوئی سبیل کی جائے۔

ہمارے بھائی اور معروف صحافی سعید خاور نے ان مشکل حالات میں تھر کا مقدمہ لکھ کر ایک اہم خدمت انجام دی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کاوش مظلوموں کی آواز ہے جو انہیں مسائل کی دلدل سے نکلنے میں مدد فراہم کرے گی۔ان کی عظیم صحرائے تھر کی زندگی' تہذیب' تاریخ اور معاشرت پر تازہ ترین تصنیف ''پیاس اور افلاس کا صحرا'' ایک معرکتہ الآرا کاوش ہے جس میں انہوں نے تھر کے سارے رنگوں اور حوالوں کو یکجا کردیا ہے۔سعید خاور کی یہ کتاب تھر پر ایک اہم ترین حوالہ ہے جس میں انہوں نے نہ صرف تھرپارکر کے مسائل کی نشاندہی کی ہے بلکہ مسائل کے حل کے لئے کئی اہم تجاویز بھی دی ہیں۔اگر حکومت ان کی تجاویز کا جائزہ لے اور ان کی روشنی میں منصوبے بروئے کار لائے تو کوئی بعید نہیں کہ آنے والے دنوں میں تھر اور تھریوں کی قسمت نہ بدل جائے۔ میں بھائی خاور کو اس تاریخ ساز کام پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ ان کی اس تحریر کردہ کتاب کے توسط سے' خدا کرے سرزمین تھر کے مجبور اور غریب عوام کے دن پھر جائیں اور وہ معمول کی زندگی گزارنے کا حق حاصل کرسکیں۔





”صحرا کی ریت میری روح میں رچی ہوئی ہے!“

ایسی سچی تصویر کشی کے لیے حساس دل کے ساتھ اظہار کی جان دار قوت بھی درکار ہوتی ہے۔ سعید خاور دونوں اعتبار سے ثروت مند ہیں۔ دُکھوں کی پرچھائیاں دیکھ کر ان کا دل موم کی طرح پگھلتا ہے' اور زبان و ادب کا گہرا مطالعہ ان کی تحریر میں سحر انگیز پیکر تراشتا جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں خوبیوں نے اس کتاب میں کشش کے امکانات کا افق وسیع کردیا ہے۔ سعید خاور دھرتی پر چلتے نظر آتے ہیں' دھرتی کی خوشبو سے توانائی کشید کرتے ہیں اور بے نام ونشاں' بے کس کرداروں کو' ماضی کے بھولے بسرے قصوں کو' مدام آگ میں جلنے والے مجبوروں کو' سندھ کی رنگارنگ ثقافت کو' صحرائے تھر کے بے زبان ذرّوں کو جیتی جاگتی تصویروں کے مانند قاری کی چشم تصور پر محیط کردیتے ہیں۔ سعید خاور کے اسلوب بیان میں مہکتی میٹھی سرائیکی کی گنگناہٹ بھی ہے' اور تھر کے سخت جان' سرکش کیکروں کے کانٹوں کی پیاس کا منظر بھی وہ بڑی دردمندی سے پینٹ کرتے ہیں۔ سعید خاور روہی کے عاشق ہیں۔ وہ خواجہ فرید کے عاشق ہیں' جن کی شاعری میں اُن کی دھرتی کے سارے روپ' الم و طرب کے سارے رنگ کچھ ایسے سحر انگیز انداز میں طلوع ہوتے ہیں کہ اس کی کیفیت دل پر نقش ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی لیے سعید خاور کہتے ہیں:

”صحرا کی ریت میری روح میں رچی ہوئی ہے!“ (احفاظ الرحمن)



WELCOME BOOK PORT

Main Urdu Bazaar, Karachi Pakistan
Tel: (92-21) 32633151, 32639581 Fax:(92-21) 32638086
Email: welbooks@hotmail.com
Website: www.welbooks.com